معارف القرآن

12

تصنیف

حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب حفظہ اللہ

ناشر: جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

معارف الفرقان

سورۃ الحدید۔۔ تا۔۔ سورۃ الصف

جِلد 12

تصنیف

اُستاذ العلماء شیخ الحدیث والتفسیر
حضرۃ مولانا محمود الرشید حدوٹی صاحب مدظلہ
سابق اُستاذ جامعہ اشرفیہ لاہور بانی ومہتمم جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

ادارہ آبِ حیات ٹرسٹ لاہور
غوث گارڈن 2 جی ٹی روڈ مناواں لاہور کینٹ
رابطہ نمبرز 0300-0321-9458876

☼ سابق استاذ جامعہ اشرفیہ لاہور ☼ پرنسپل جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور
☼ سابق شیخ الحدیث جامعہ مفتوحہ لاہور ☼ سابق شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہنامہ آب حیات لاہور ☼ مدیر اعلیٰ ماہنامہ شان دار لاہور
☼ مدیر اعلیٰ ماہنامہ تحفہ خواتین لاہور ☼ ماہنامہ صدائے جمعیت لاہور
☼ امیر جمعیت تحفظ اسلام پاکستان ☼ صدر ادارہ آب حیات ٹرسٹ
☼ متولی جامع مسجد عارفی مناواں لاہور ☼ خطیب ٹاؤن ھال لاہور

ضابطہ

نام کتاب۔۔۔

معارف الفرقان جلد ⑫

سورۃ الحدید (تعارف)	۶	سورۃ المجادلہ (تعارف)	۸۱
سلطان اکبر کی تسبیح خوانی، عظمت	۸	خولہ کی شکایت سات آسمانوں پر	۸۳
علم الٰہی کی وسعت	۱۲	بیوی کو ماں کہنا یا ماں کی طرح کہنا	۸۶
ایمان باللہ، ایمان بالرسول، انفاق	۱۷	ظہار کا شرعی حکم	۸۷
دعوت ایمان، فیضان نبوت، شان صحابہ	۱۸	اللہ ورسول اللہ کی دشمنی کی سزا	۹۳
قرض حسن اور اس کا اجر	۲۶	قیامت کے دن سب اٹھائے جائینگے	۱۰۱
اہل ایمان کیلئے پل صراط پر نور	۲۹	اللہ تعالیٰ کا علم وکمال	۱۰۳
منافقین کو دندان شکن جوابات	۳۶	منافقین کی سرگوشی، یہود کی بیہودگی	۱۰۵
دلوں کی سختی اور نرمی	۳۸	آداب گفتگو	۱۰۸
مردہ دل کیسے زندہ ہوتے ہیں؟	۴۱	سرگوشی شیطان کی طرف سے مطلب	۱۱۰
صدقہ خیرات کرنیوالوں کا اجر وثواب	۴۲	آداب مجلس اور علماء کرام کا مقام	۱۱۱
اہل ایمان کا مقام اور اہل کفر کا انجام	۴۳	سرگوشی سے پہلے صدقے کا حکم	۱۱۵
حیات دنیا کھیل، تماشا اور زینت	۴۴	منافقین کے غضب دلانیوالے احوال	۱۲۱
مغفرت وجنت کی طرف دوڑ	۵۳	اللہ اور رسولوں کا غلبہ	۱۲۶
نوشتہ تقدیر ٹل نہیں سکتا	۵۵	غیرت ایمانی سے سرشار مسلمان	۱۳۰
بخل وبخیلی کی مذمت	۶۷	سورۃ الحشر (تعارف)	۱۳۲
لوہے کے فوائد اور مقاصد	۶۸	مخلوق کی تسبیح خوانی	۱۳۴
عیسیٰ، پیروکاران عیسیٰ اور رہبانیت	۷۲	یہود کی مدینہ منورہ سے جلاوطنی	۱۳۵
مسلمانوں اور یہود ونصاریٰ کا اجر، فرق	۷۷	مال فئے کے حقدار کون؟	۱۴۴

منافقین کا پیغام یہودیوں کے نام	۱۵۹	سورۃ الصف (تعارف)	۲۹۶
یہود اور کفار کی بزدلی	۱۶۱	کل کائنات رب کی تسبیح خواں	۲۹۷
دشمنان رسول ﷺ کی سزا	۱۶۴	بد عمل لوگوں کی باتیں قابل نفرت	۲۹۸
شیطان کیسے ورغلاتا اور جان چھڑاتا ہے	۱۶۶	مجاہدین اللہ کے محبوب	۳۰۱
کامیاب اور ناکام لوگ	۱۷۸	قوم موسیٰ کے دل ٹیڑھے کیوں ہوئے	۳۰۹
عظمت قرآن	۱۸۳	بشارت عیسویٰ	۳۱۴
اسماء الحسنیٰ	۱۸۹	فارقلیط	۳۲۷
سورۃ الممتحنہ (تعارف)	۲۴۲	دس وجوہ سے محمد ﷺ کی بشارت	۳۳۴
اعیار سے دوستانہ تعلقات	۲۴۵	بشارت محمد ﷺ پر صادق آتی ہے	۳۳۷
کافروں کی خواہش	۲۴۹	دوسری بشارت	۳۳۸
بروز محشر رشتہ داری کام نہیں آئے گی	۲۵۱	تیسری بشارت	۳۳۹
اسوہ ابراہیمی	۲۵۳	سب سے بڑا ظالم	۳۴۰
کافروں کا تختہ مشق بننے سے پناہ کی دعا	۲۵۷	نور الٰہی کو بجھایا نہیں جاسکتا	۳۴۲
اہل ایمان کے لیے اسوہ اور نمونہ	۲۶۰	نور اللہ کے بارے میں پانچ اقوال	۳۴۳
اللہ دشمنی کو دوستی میں بدل دیتا ہے	۲۶۱	آیات نور الٰہی کا شان نزول	۳۴۴
بے ضرر کافروں سے تعلقات	۲۶۴	غلبہ اسلام	۳۴۵
مؤمنات مہاجرات کے احکام	۲۶۷	مفید تجارت	۳۵۱
مستورات سے بیعت لینے کا حکم	۲۷۳	دین الٰہی کے مددگار بن جاؤ	۳۵۵
مغضوب علیہم لوگوں سے دوستی ممنوع	۲۹۴		

تعارف سورۃ الحدید

سوال سورۃ الحدید کا تعارف کروایئے۔

جواب پیش نظر سورت مبارکہ کا نام سورۃ الحدید ہے، حدید عربی زبان میں لوہے کو کہا جاتا ہے، اس سورت کا نام اسی مناسبت سے رکھا گیا کہ اس میں لوہے کے فوائد بیان کیے گئے ہیں۔ حدید کا لفظ اس سورت کی آیت نمبر ۲۵ میں موجود ہے، سورۃ الحدید ترتیب تلاوت کے لحاظ سے ۵۷ ویں نمبر پر ہے، نزولی اعتبار سے ۹۴ ویں نمبر پر ہے۔ اس سورۃ میں ۴ رکوع ۲۹ آیات اور ۵۷۶ کلمات اور ۲۵۹۹ حروف ہیں۔

سورۃ الحدید کا نزول: سورۃ الحدید مدنی سورت ہے اس کا نزول سورۃ الزلزال کے بعد ہے۔

ربط و مناسبت : سورۃ الواقعہ میں زبان کے ساتھ شرک کی تردید کا ذکر تھا، جب کہ سورۃ الحدید میں سیف وسنان کے ساتھ شرک کی تردید کا ذکر ہے۔ سورۃ الواقعہ کے آخر میں تسبیح کا ذکر تھا، جب کہ سورۃ الحدید کے شروع میں تسبیح کا ذکر ہے۔ سورۃ الواقعہ کے آخر میں قیامت کا ذکر تھا، سورۃ الحدید کی ابتدا میں اللہ کی وحدانیت کا ذکر ہے۔

سورۃ الحدید کی اہمیت وافادیت: سورۃ الحدید میں عظمت خداوندی کے جگہ جگہ تذکرے ملتے ہیں، اس میں صداقت قرآنی بیان کی گئی ہے، اثبات رسالت کا تذکرہ ہے، راہ خدا میں مال لٹانے کی ترغیب دی گئی ہے، ایمان کی ترغیب دی گئی ہے، میدان کارزار میں جہاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے، گمراہی کے اسباب بیان کیے گئے ہیں۔ دنیا کی بے ثباتی کو مثال سے واضح کیا گیا ہے، تسلیات و تخویفات بیان کی گئی ہیں، حاملین کتاب کی کامیابی، کامرانی اور فائز المرامی کے اصول بیان کیے گئے ہیں، سیدنا نوح سیدنا ابراہیم اور سیدنا موسیٰ علیہم السلام کے فضائل ومناقب بیان کیے گئے ہیں، ان کے پیروکاروں کے فضائل کے ساتھ ساتھ ان کے مخالفین ومعاندین کے عبرت ناک انجام کی طرف اشارے

کیے گئے ہیں۔

شیخ الاسلام مفتی تقی عثمانی فرماتے ہیں ”اس سورت کی آیت نمبر: ۱۰ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی تھی، اس موقع پر چونکہ مسلمانوں کے خلاف کافروں کی دشمنی کی کارروائیاں بڑی حد تک دھیمی پڑ گئی تھیں اور جزیرہ عرب پر مسلمانوں کا تسلط بڑھ رہا تھا، اس لیے اس سورت میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان صفات سے آراستہ کرنے پر زیادہ توجہ دیں جو ان کے دین کو مطلوب ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے اپنی کوتاہیوں پر مغفرت مانگیں نیز ترغیب دی گئی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں اپنا مال خرچ کریں اور آخرت کی بہبود کو دنیا کے مال و دولت پر ترجیح دیں جس کے نتیجے میں انہیں آخرت میں ایک ایسا نور عطا ہو گا جو انہیں جنت تک لے جائے گا، جبکہ منافق لوگ اس نور سے محروم کر دیئے جائیں گے، سورت کے آخر میں عیسائیوں کو یاد دلایا گیا ہے کہ جو رہبانیت (ترک دنیا) انہوں نے اختیار کی تھی، وہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے مطابقت نہیں رکھتی تھی، اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا تھا کہ دنیا کو بالکل چھوڑ کر بیٹھ جاؤ؛ بلکہ یہ تاکید فرمائی تھی کہ اسی دنیا میں رہ کر اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل کرو اور تمام حقوق اسی کی ہدایت کے مطابق ادا کرو، نیز عیسائیوں کو ہدایت دی گئی ہے کہ اگر وہ اللہ تعالیٰ کی رضا چاہتے ہیں تو اس کے لیے حضور نبی کریم ﷺ پر ایمان لانا ضروری ہے۔ (توضیح القرآن)

فضیلت سورۃ الحدید: منقول ہے کہ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَقْرَأُ الْمُسَبِّحَاتِ قَبْلَ أَنْ يَرْقُدَ، رسول اللہ ﷺ سونے سے پہلے ان سورتوں کی تلاوت فرماتے تھے، جن کی ابتدا " سبح للہ " سے ہوتی تھی اور جن کو " مسبحات " کہا جاتا ہے اور آپ ﷺ فرماتے تھے کہ إِنَّ فِيهِنَّ آيَةً أَفْضَلُ مِنْ أَلْفِ آيَةٍ ان میں ایک آیت ایسی ہے جو ایک ہزار آیت سے بڑھ کر ہے۔ (ابو داؤد، ترمذی، نسائی) اور پھر آپ ﷺ اس سورۃ کے آیت نمبر ۳ کا ذکر کرتے تھے، هُوَ الأَوَّلُ وَالآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ۔ (ابن کثیر)

سورۃ الحدید

سلطان اکبر کی تسبیح خوانی، عظمت و کبریائی

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝{۱}لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ {۲}هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ {۳}الحدید

جواب ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو چیز بھی ہے، وہ اللہ کی تسبیح کرتی ہے۔ اور وہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہت اسی کی ہے، وہی زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے اور وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔ وہی اول بھی ہے اور آخر بھی، ظاہر بھی اور چھپا ہوا بھی، اور وہ ہر چیز کو پوری طرح جاننے والا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں لوگوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سب سے زیادہ سخت تھا اس درمیان کہ میں گرم دن میں دوپہر کی گرمی کے وقت مکہ کے بعض راستوں پر چل رہا تھا، اچانک ایک آدمی مجھ سے ملا اور اس نے کہا اے ابن خطاب! تیرے لیے عجیب بات ہے تو یہ گمان کرتا ہے کہ تو ایسا ہے، تو ایسا ہے اور تیرے گھر میں اسلام داخل ہو چکا ہے، میں نے کہا وہ کیسے ہے؟ اس نے کہا یہ تیری بہن اسلام لا چکی ہے، تو میں شدید غصہ میں لوٹا یہاں تک کہ (بہن کے گھر کا) دروازہ کھٹکھٹایا، پوچھا گیا کون ہے؟ میں نے کہا عمر ہوں، انہوں نے جلدی کی اور مجھ سے چھپ گئے اور جو صحیفہ اپنے سامنے رکھ کر پڑھ رہے تھے انہوں نے اس کو وہیں چھوڑ دیا یا اس کو بھول گئے، میں اندر داخل ہوا اور چارپائی پر بیٹھ گیا، میں نے صحیفہ کی طرف دیکھا اور میں نے کہا یہ کیا ہے؟ اس کو مجھے دو بہن نے کہا تو اس کے لینے کے قابل نہیں ہے، تو نے جنابت سے غسل نہیں کیا اور نہ تو پاک ہوا اور اس

کتاب کو پاک لوگ ہی ہاتھ لگاسکتے ہیں پس میں برابر مانگتا رہا یہاں تک کہ انہوں نے مجھ کو دے دیا، میں نے اس کو کھولا تو اس میں اچانک بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا تھا۔

جب میں نے الرحمن الرحیم پڑھا تو میں خوف زدہ ہو گیا، میں نے وہ صحیفہ اپنے ہاتھ سے رکھ دیا، پھر میں نے اپنے دل کی طرف رجوع کیا اور اس صحیفہ کو پھر اٹھالیا تو اس میں آیت بسم اللہ الرحمن الرحیم اور سبح للہ مافی السموت والارض، لکھا ہوتھا، جب میں اللہ کے ناموں میں سے ایک نام پڑھتا تو میں خوف زدہ ہو جاتا، میں اپنی ذات کی طرف رجوع کرتا یہاں تک کہ میں اس آیت پر پہنچا، آیت اٰمِنُو بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَاَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّستَخلَفِينَ فِيهِ، تم لوگ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور جس مال میں اللہ نے تم کو قائم مقام بنایا اس کا کچھ حصہ راہِ خدا میں خرچ کرو تو میں نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں (میرے کلمہ پڑھنے پر) صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خوشخبری دیتے ہوئے باہر نکل آئے اور نعرہ تکبیر بلند کیا۔ (البزار، ابن عساکر، ابن مردویہ، ابو نعیم فی الحلیۃ)

ابو الاسود رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ جالوت کے سردار نے کہا کہ توراۃ میں صرف حلال و حرام کا ذکر ہے تمہاری کتاب میں سب کچھ موجود ہے، یعنی آیت سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالاَرضِ اللہ کے لیے تسبیح بیان کرتی ہیں جو چیزیں آسمانوں اور زمین میں ہیں اور توراۃ میں یوں ہے يُسَبِّحُ لِلّٰهِ الطَّيرُ وَالسِّبَاعُ اللہ کے لیے تسبیح بیان کرتے ہیں پرندے اور درندے۔ (العظمت لابی الشیخ)

ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضی اللہ عنہم بیٹھے ہوئے تھے اچانک ان پر ایک بادل آیا، نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کیا تم جانتے ہو یہ کیا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، فرمایا یہ بارش کا بادل ہے، یہ زمین کو سیراب کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ ایسی قوم کی طرف چلا رہے ہیں جو اس کا شکر ادا نہیں کرتے اور نہ اس کو پکارتے ہیں، پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو تمہارے اوپر کیا ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں

یہ پہلا آسمان ہے جو محفوظ چھت ہے اور رکی ہوئی موج ہے پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اس کے اور تمہارے درمیان کتنا فاصلہ ہے ؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، پھر فرمایا تمہارے اور اس کے درمیان پانچ سو سال کا راستہ ہے۔

پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے ؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، پھر فرمایا اس کے اوپر دو آسمان ہیں ان کے درمیان پانچ سو سال کا راستہ ہے، یہاں تک کہ آپ نے سات آسمان شمار فرمائے ہر دو آسمانوں کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جیسے زمین و آسمان کے درمیان فاصلہ ہے پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو اس کے اوپر کیا ہے ؟ فرمایا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں پھر فرمایا اس کے اوپر عرش ہے اور عرش اور ساتویں آسمان کے درمیان اتنا فاصلہ ہے جتنا ہر دو آسمانوں کے درمیان ہے۔

پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ تمہارے نیچے کیا ہے ؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں، فرمایا وہ زمین ہے پھر فرمایا کیا تم جانتے ہو کہ اس کے نیچے کیا ہے ؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا اللہ اور اس کے رسول ہی بہتر جانتے ہیں، فرمایا اس زمین کے نیچے دوسری زمین ہے اور ان دونوں کے درمیان پانچ سو سال کا فاصلہ ہے، یہاں تک کہ آپ نے سات زمینوں کو شمار فرمایا اس طرح پر کہ ہر دو زمینوں کے درمیان پانچ سو سال کا راستہ ہے۔

پھر فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے، اگر تم اپنے میں سے کسی کو رسی کے ساتھ باندھ کر نیچے والی زمین کی طرف لٹکا دو تو وہ یقیناً اللہ تعالیٰ پر جا کر گرے گی پھر آپ نے یہ آیت پڑھی هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ، وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ وہی سب سے اول ہے اور وہی سب سے آخر ہے اور وہی ظاہر ہے اور وہی باطن ہے اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے، امام ترمذی نے فرمایا بعض اہل علم نے اس کی تفسیر کرتے ہوئے کہا کہ بیشک وہ اللہ تعالیٰ کے علم اس کی قدرت اور اس کی سلطنت پر آ گرے۔ (احمد، ترمذی، ابن المنذر، ابن مردویہ، بیہقی ، العظمۃ)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے، اگر تم میں سے کسی کو ساتویں زمین کی طرف رسی کے ساتھ لٹکایا جائے تو وہ یقیناً اپنے رب پر آپہنچے گا، پھر یہ آیت پڑھی آیت۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ، وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ۔ (ابن مردویہ، در منثور)

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: آسمانوں کا اور زمینوں کا ملک اسی کے لیے ہے اور تمام امور اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے، اس میں بندوں کے اعمال بھی ہیں جو قیامت کے دن پیش ہوں گے اور جزا سزا کا فیصلہ ہو گا، وہ رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل فرماتا ہے کبھی دن بڑا اور کبھی رات بڑی ہوتی ہے یہ سب تصرفات اسی ذات عالی کی ہیں وَ هُوَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ اور سینوں کی باتوں کو جانتا ہے، جس کسی کے دل میں جو بھی کچھ خیال اور وسوسہ آئے اور جو بھی کوئی شخص ایمان قبول کرے یا کفر پر جمارہے اسے ان سب کی خبر ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ: حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اگر کبھی تمہارے دل میں اللہ تعالیٰ اور دین حق کے معاملے میں شیطان کوئی وسوسہ ڈالے تو یہ آیت آہستہ سے پڑھ لیا کرو، هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (ابن کثیر، معارف القرآن للمفتی رحمہ اللہ)

اس آیت کی تفسیر اور اول و آخر، ظاہر و باطن کے معنی میں حضرات مفسرین کے اقوال دس سے زیادہ منقول ہیں، جن میں کوئی تعارض نہیں، سبھی کی گنجائش ہے، لفظ اول کے معنی تو تقریباً متعین ہیں، یعنی وجود کے اعتبار سے تمام موجودات و کائنات سے مقدم اور پہلا ہے، کیونکہ ساری موجودات اسی کی پیدا کی ہوئی ہیں اس لیے وہ سب سے اول ہے اور آخر کے معنی بعض حضرات نے یہ کئے ہیں کہ تمام موجودات کے فنا ہونے کے بعد بھی وہ باقی رہے گا، جیسا کہ آیت كُلُّ شَيْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ میں اس کی تصریح ہے، اور فنا سے مراد عام ہے خواہ فنا و عدم کا وقوع ہو جائے، جیسا قیامت کے روز عام

مخلوقات فنا ہو جاوے گی، یا فنا کا وقوع نہ ہو، مگر اس کی فنا و عدم کا وقوع ہو جائے، جیسا قیامت کے روز عام مخلوقات فنا ہو جاوے گی، یا فنا کا وقوع نہ ہو، مگر اس کی فنا و عدم ممکن ہو اور وہ اپنی ذات میں عدم کے خطرہ سے خالی نہ ہو، اس کو موجود ہونے کے وقت بھی فانی کہہ سکتے ہیں، اس کی مثال جنت و دوزخ اور ان میں داخل ہونے والے اچھے برے انسان ہیں کہ ان کا وجود فنا نہیں ہو گا مگر باوجود وقوعاً فنا نہ ہونے کے امکان و احتمال فنا سے پھر بھی خالی نہیں، صرف حق تعالیٰ کی ذات ہے جس پر کسی حیثیت اور کسی مفہوم سے نہ پہلے کبھی عدم طاری ہوا اور نہ آئندہ کبھی اس کا امکان ہے، اس لیے اس کو سب سے آخر کہہ سکتے ہیں۔ (معارف القرآن)

اور امام غزالی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کو آخر باعتبار معرفت کے کہا گیا ہے کہ سب سے آخر معرفت اس کی ہے انسان علم و معرفت میں ترقی کرتا رہتا ہے، مگر یہ سب درجات جو اس کو حاصل ہوئے راستہ کی مختلف منزلیں ہیں اس کی انتہا اور آخری حد حق تعالیٰ کی معرفت ہے (روح المعانی)

اور ظاہر سے مراد وہ ذات جو اپنے ظہور میں ساری چیزوں سے فائق اور برتر ہو اور ظہور چونکہ وجود کی فرع ہے، تو جب حق تعالیٰ کا وجود سب موجودات پر فائق اور مقدم ہے اس کا ظہور بھی سب پر فائق ہے کہ اس سے زیادہ اس عالم میں کوئی چیز ظاہر نہیں کہ اس کی حکمت و قدرت کے مظاہر دنیا کے ہر ہر ذرّہ میں نمایاں ہیں اور باطن اپنی ذات کی کنہ اور حقیقت کے اعتبار سے ہے کہ اس کی حقیقت تک کسی عقل و خیال کی رسائی نہیں ہو سکتی۔ (معارف القرآن)

اے برتر از قیاس و گمان و خیال و وہم — اے بروں از جملہ قال و قیل من
وز ہر چہ دیدہ ایم و شنیدیم و خواندہ ایم — خاک بر فرق من و تمثیل من

علم الٰہی کی وسعت

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ اس آیت میں جو کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس چیز کو بھی جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور اس چیز کو بھی جانتا ہے جو زمین سے نکلتی ہے اور اس چیز کو

بھی جانتا ہے جو آسمان کی طرف سے اترتی ہے اور اس چیز کو بھی جانتا ہے جو آسمان کی طرف چڑھتی ہے اس سے کیا مراد ہے؟

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ {۴} الحدید.

جواب ترجمہ: وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا، پھر عرش پر مستوی ہوا، وہ ہر اس چیز کو جانتا ہے جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور ہر اس چیز کو جو آسمان سے اترتی ہے اور جو اس میں چڑھتی ہے اور تم جہاں کہیں ہو، وہ تمہارے ساتھ ہے۔ اور جو کام بھی تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھتا ہے۔

زمین و آسمان کی چھ دنوں میں پیدائش ہوئی، اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہوا، اس پر ہم اہل تفسیر کی آراء گزشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں، سورۃ البقرہ، سورۃ الاعراف میں اس پر تفصیل ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کو بیان کیا جارہا ہے، اس کے علم کی وسعت اور گہرائی کو بیان کیا جارہا ہے کہ اس ذات عالی کو بہت اچھی طرح علم ہے کہ کس قدر بارش کی بوندیں زمین میں گئیں، کتنے دانے زمین میں پڑے اور کیا چارہ پیدا ہوا کس قدر کھیتیاں ہوئیں اور کتنے پھل کھلے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں وَعِنْدَهُ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَا إِلَّا هُوَ وَيَعْلَمُ مَا فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَرَقَةٍ إِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِي ظُلُمَاتِ الْأَرْضِ وَلَا رَطْبٍ وَلَا يَابِسٍ إِلَّا فِي كِتَابٍ مُبِينٍ} (الْأَنْعَامِ: ۵۹) کلید غیب اللہ کے پاس ہے، اس کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اسے بھی جانتا ہے، جو پتا درخت کی ٹہنی سے گرتا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے، زمین کی تاریکیوں میں کوئی دانہ نہیں، تری اور خشکی میں کوئی ایسی چیز نہیں جو واضح کتاب میں نہ ہو۔

اسی طرح آسمان سے نازل ہونے والی بارش، اولے، برف، تقدیر اور احکام جو برتر فرشتوں کے ذریعہ نازل ہوتے ہیں، سب اس کے علم میں ہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَنَّهُ مَا يَنْزِلُ مِنْ قَطْرَةٍ مِنَ السَّمَاءِ إِلَّا وَمَعَهَا مَلَكٌ يُقرّرها فِي الْمَكَانِ الَّذِي يَأْمُرُ اللهُ بِهِ حَيْثُ يَشَاءُ تَعَالَى (ابن کثیر) اللہ کے مقرر کردہ فرشتے بارش کے ایک ایک قطرے کو اللہ کی بتائی ہوئی جگہ پہنچادیتے ہیں، آسمان سے اترنے والے فرشتے اور اعمال بھی اس کے وسیع علم میں ہیں۔

جیسے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ يُرْفَعُ إِلَيْهِ عَمَلُ اللَّيْلِ قَبْلَ النَّهَارِ، وَعَمَلُ النَّهَارِ قَبْلَ اللَّيْلِ (مسلم) رات کے اعمال دن سے پہلے اور دن کے اعمال رات سے پہلے اس کی جناب میں پیش کردیئے جاتے ہیں۔

{وَهُوَ مَعَكُمْ} مفسر قرآن علامہ ابن کثیر ان کلمات کا مفہوم یوں بیان فرماتے ہیں کہ أَيْ: رَقِيبٌ عَلَيْكُمْ، شَهِيدٌ عَلَى أَعْمَالِكُمْ حَيْثُ أَنْتُمْ، وَأَيْنَ كُنْتُمْ، مِنْ بَرٍّ أَوْ بَحْرٍ، فِي لَيْلٍ أَوْ نَهَارٍ، فِي الْبُيُوتِ أَوِ الْقِفَارِ، الْجَمِيعُ فِي عِلْمِهِ عَلَى السَّوَاءِ، وَتَحْتَ بَصَرِهِ وَسَمْعِهِ، فَيَسْمَعُ كَلَامَكُمْ وَيَرَى مَكَانَكُمْ، وَيَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَنَجْوَاكُمْ، (ابن کثیر) وہ تمہارے ساتھ ہے یعنی تمہارا نگہبان ہے۔ وہ تمہارے کاموں کو دیکھ رہا ہے جہاں بھی تم ہو یا جہاں بھی تم تھے، تری میں ہو یا خشکی میں، رات میں ہو یا دن میں، گھروں میں ہو یا جنگل میں، تمام مقامات اور احوال برابر اس کے علم میں ہیں، اس کی نگاہوں کے نیچے ہیں، اس کے کانوں کی سماعت کے نیچے ہیں، وہ تمہاری باتوں کو جانتا ہے اور تمہاری جگہوں کو بھی دیکھتا ہے، وہ تمہاری پوشیدہ کو جانتا ہے اور تمہاری سرگوشیوں کو بھی جانتا ہے۔

جیسے قرآن کریم میں دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا {أَلَا إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ} (هُودٍ: ۵) خبردار! وہ اپنے سینوں کو موڑتے ہیں تاکہ وہ اس سے چھپالیں، خبردار! جب وہ

اپنے کپڑوں کو اوڑھ لیتے ہیں وہ اس وقت سب باتیں جانتا ہے جو پوشیدہ طور پر کرتے ہیں اور جو بظاہر کرتے ہیں بلاشبہ وہ سینوں کے اندر کی چیزوں کو جانتا ہے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ سَوَاءٌ مِّنكُم مَّنْ أَسَرَّ الْقَوْلَ وَمَنْ جَهَرَ بِهِ وَمَنْ هُوَ مُسْتَخْفٍ بِاللَّيْلِ وَسَارِبٌ بِالنَّهَارِ (الرَّعْدِ:۱۰) تم میں سے کوئی چپکے سے بات کرے یا زور سے، کوئی رات کے وقت چھپا ہوا ہو، یا دن کے وقت چل پھر رہا ہو، وہ سب (اللہ کے علم کے لحاظ سے) برابر ہیں۔

یہ سچ ہے وہی رب ہے وہی معبود برحق ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جبریل کے سوال پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا أَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ (بخاری) احسان یہ ہے کہ تو اللہ کی عبادت اس طرح کر کہ گویا تو اللہ کو دیکھ رہا ہے۔ پس اگر تو اسے نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے دیکھ رہا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی نے حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! زَوِّدْنِي كَلِمَةً أَعِيشُ بِهَا مجھے کوئی ایسا حکمت کا توشہ دیجئے کہ میری زندگی سنور جائے، آپ نے فرمایا اِسْتَحِ اللّٰهَ كَمَا تَسْتَحِي رَجُلًا مِنْ صَالِحِ عَشِيرَتِكَ لَا يُفَارِقُكَ، اللہ تعالیٰ سے حیا کر اور اس سے اس طرح حیا کر جیسے کہ تو اپنے کسی نزدیکی قرابتدار سے شرماتا ہو جو تجھ سے کبھی جدا نہ ہوتا ہو۔

حضرت نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے جس نے تین کام کر لئے اس نے ایمان کا مزہ اٹھالیا۔ وہ تین باتیں یہ ہیں مَنْ عَبَدَ اللّٰهَ وَحْدَهُ، وَأَعْطَى زَكَاةَ مَالِهِ طَيِّبَةً بِهَا نَفْسُهُ فِي كُلِّ عَامٍ، وَلَمْ يُعْطِ الْهَرِمَةَ وَلَا الدَّرِنَةَ، وَلَا الشَّرَطَ اللَّئِيمَةَ وَلَا الْمَرِيضَةَ وَلَكِنْ مِنْ أَوْسَطِ أَمْوَالِكُمْ. وَزَكَّى نَفْسَه، ایک یہ کہ جس نے اکیلے اللہ کی عبادت کی (یعنی کسی کو اس کا شریک نہیں ٹھہرایا) اور دوسری بات یہ کہ جس نے ہنسی خوشی اپنے مال کی ہر سال زکوٰۃ ادا کی، جانور زکوٰۃ میں دیے تو بوڑھے،

بیکار، دبلے پتلے اور بیمار زکوٰۃ میں نہیں دیے بلکہ درمیانی درجے کے جانور زکوٰۃ میں دیے، تیسری بات یہ کہ جس شخص نے اپنے آپ کو پاک کیا۔

اس پر ایک شخص نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! مَا تَزْكِيَةُ الْمَرْءِ نَفْسَهُ؟ اپنے آپ کو پاک کرنے کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے اس شخص کے جواب میں ارشاد فرمایا يَعْلَمُ أَنَّ اللهَ مَعَهُ حَيْثُ كَانَ، اس بات کو دل میں محسوس کرے اور یقین وعقیدہ رکھے کہ ہر جگہ اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ ہے۔ (ابو نعیم، سنن الکبریٰ للبیہقی، تفسیر ابن کثیر)

حضرت عبادہ بن صامت سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا إِنَّ أَفْضَلَ الْإِيمَانِ أَنْ تَعْلَمَ أَنَّ اللهَ مَعَكَ حَيْثُمَا كُنتَ، افضل ایمان یہ ہے کہ تو جان رکھے کہ تو جہاں کہیں ہے اللہ تیرے ساتھ ہے۔

حضرت امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ اکثر ان دو شعروں کو گنگنایا کرتے تھے۔

إِذَا مَا خَلَوْتَ الدَّهْرَ يَوْمًا فَلَا تَقُلْ ... خَلَوْتُ وَلٰكِنْ قُلْ: عَلَيَّ رَقِيبُ

وَلَا تَحْسَبَنَّ اللهَ يَغْفَلُ سَاعَةً . ... وَلَا أَنَّ مَا يُخْفِي عَلَيْهِ يَغِيبُ

جب تو بالکل تنہائی اور خلوت میں ہو اس وقت بھی یہ نہ کہہ کہ میں اکیلا ہی ہوں۔ بلکہ کہتا رہ کہ تجھ پر ایک نگہبان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کسی ساعت اللہ تعالیٰ کو بے خبر نہ سمجھ اور مخفی سے مخفی کام کو اس پر مخفی نہ مان۔

{يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ} جو کچھ زمین کے اندر جاتا ہے سے مراد یہ ہے کہ جو دانہ زمین کے اندر جاتا ہے اور جو بارش کے قطرے زمین کے اندر جاتے ہیں ان سب کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

{وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا} جو کچھ زمین سے نکلتا ہے سے مراد کھیتاں، بوٹیاں اور پھل اور معادن وغیرہ ہیں کہ انہیں بھی اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

{وَمَا يَنزِلُ مِنَ السَّمَاءِ} جو کچھ آسمان سے اترتا ہے سے مراد بارشوں کا اترنا، برف باری کا ہونا اور

اولوں کا برسنا، شہابیوں کا برسنا، تقدیر کے معاملات کا اترنا، عزت دار فرشتوں کے ساتھ احکامات الٰہیہ کا اترنا ہے۔

{وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا} جو کچھ آسمان کی طرف چڑھتی ہے سے مراد آسمان کی طرف فرشتوں کا جانا، اعمال کا چڑھنا ہے، جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ اس کی طرف چڑھائے جاتے ہیں رات کے اعمال دن سے پہلے اور اور دن کے اعمال رات سے پہلے۔

ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور انفاق فی سبیل اللہ

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے۔

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ {۷} الحدید.

جواب ترجمہ: اللہ اور اس کے رسول پر ایمان رکھو، اور جس (مال) میں اللہ نے تمہیں قائم مقام بنایا ہے، اس میں سے (اللہ کے راستے میں) خرچ کرو۔ چنانچہ تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں، اور انہوں نے (اللہ کے راستے میں) خرچ کیا ہے، ان کے لیے بڑا اجر ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ خود اپنے اوپر اور اپنے رسول ﷺ پر ایمان لانے اور اس پر مضبوطی اور ہمیشگی کے ساتھ جم کر رہنے کی ہدایت فرماتا ہے اور اپنی راہ میں خیرات کرنے کی رغبت دلاتا ہے جو مال ہاتھوں ہاتھ تمہیں اس نے پہنچایا ہو تم اس کی اطاعت گذاری میں اسے خرچ کرو اور سمجھ لو کہ جس طرح دوسرے ہاتھوں سے تمہیں ملا ہے اسی طرح عنقریب تمہارے ہاتھوں سے دوسرے ہاتھوں میں چلا جائے گا اور تم پر حساب اور عتاب رہ جائے گا اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ تیرے بعد تیرا وارث ممکن ہے نیک ہو اور وہ تیرے ترکے کو میری راہ میں خرچ کر کے مجھ سے قربت حاصل کرے اور ممکن ہے کہ وہ بدبخت اپنی مستی اور سیاہ کاری میں تیرا اندوختہ فنا کر دے اور اس کی بدیوں کا باعث تو بنے نہ تو

چھوڑ تا نہ ہی وہ تیرا مال یوں ہی فضول اور بیکار اڑاتا۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت نبی اکرم ﷺ سورۃ (التکاثر) پڑھ کر فرمانے لگے يَقُولُ ابْنُ آدَمَ: مَالِي مَالِي! وَهَلْ لَكَ مِنْ مَالِكَ إِلَّا مَا أَكَلْتَ فَأَفْنَيْتَ، أَوْ لَبِسْتَ فَأَبْلَيْتَ، أَوْ تَصَدَّقْتَ فَأَمْضَيْتَ (مسلم) اگرچہ ابن آدم کہتا رہتا ہے یہ بھی میرا مال ہے، یہ بھی میرا مال ہے حالانکہ دراصل اس کا مال وہ ہے جو اس نے کھالیا، اس کا مال وہ ہے جو اس نے پہن لیا، اس کا مال وہ ہے جو اس نے صدقہ کر دیا، کھایا ہوا فنا ہو گیا، پہنا ہوا پرانا ہو کر برباد ہو گیا، ہاں اللہ کی راہ میں دیا ہوا بطور خزانہ کے جمع رہا۔ اور جو باقی رہے گا وہ تو اوروں کا مال ہے تو تو اسے جمع کر کے چھوڑ جانے والا ہے۔ پھر ان ہی دونوں باتوں کی ترغیب دلاتا ہے اور بہت بڑے اجر کا وعدہ دیتا ہے۔

دعوتِ ایمان، فیضانِ نبوت اور شانِ صحابہ رضی اللہ عنہم

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ {٨} هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ {٩} وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ {١٠} الحدید

جواب ترجمہ: اور تمہیں ہوا کیا ہے؟ تم اللہ پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ جبکہ رسول برابر تمہیں اس کی دعوت دے رہے ہیں کہ تم اپنے رب پر ایمان لے آؤ اور وہ تم سے عہد و پیمان بھی لے چکے ہیں اگر تم کو ماننا ہو۔ وہی ہے جو اپنے بندہ پر صاف صاف آیتیں اتار رہا ہے تاکہ وہ تمہیں تاریکیوں

سے نکال کر روشنی میں لائے اور یقیناً اللہ تم پر بڑا ہی مہربان اور نہایت رحم فرمانے والا ہے۔ اور تمہیں ہوا کیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں خرچ نہیں کرتے جبکہ آسمانوں اور زمین کا سب کچھ اسی کو پہنچتا ہے، تم میں جن لوگوں نے فتح (مکہ) سے پہلے خرچ کیا اور قتال کیا وہ (بعد والوں کے) برابر نہیں، وہ ان کے مقابلہ میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور قتال کیا اور بھلائی کا وعدہ تو اللہ کا ہر ایک سے ہے اور اللہ تمہارے سب کاموں کی خوب خبر رکھتا ہے۔

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ: اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنے اور اپنے رسول پر ایمان میں ثابت قدم رہنے کی ترغیب دی، چنانچہ فرمایا: تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں رکھتے، حالانکہ رسول تمہیں تمہارے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے، اور اللہ تم سے (اس ایمان کا) عہد و پیمان بھی لے چکا ہے، اگر تم واقعی ایمان والے ہو۔ یعنی: کون سی رکاوٹ ہے جو تمہیں ایمان پر ثابت قدم رہنے سے روکتی ہے؟ اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنے سے اور اللہ تعالیٰ ہی کے لیے عبادت کو خالص کرنے سے مانع ہے؟ حالانکہ رسولِ اکرم ﷺ صبح و شام تمہارے درمیان موجود ہیں، تمہیں تمہارے رب پر ایمان کی دعوت دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ تم سے اس ایمان پر عہد و میثاق لے چکا ہے، یہ میثاق اس عقل کے ذریعے لیا گیا جو تمہارے اندر رکھی گئی ہے اور ان متنوع دلائل کے ذریعے جو تمہارے سامنے قائم کیے گئے ہیں اور وہ سب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ عبادت کو ایک قہار اللہ ہی کے لیے خالص کیا جائے۔

صحیح بخاری کے کتاب الایمان کے ابتدائی ابواب میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک دن اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: **أَيُّ الْمُؤْمِنِينَ أَعْجَبُ إِلَيْكُمْ إِيمَانًا؟ قَالُوا: الْمَلَائِكَةُ، قَالَ: وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ؟ قَالُوا: فَالْأَنْبِيَاءُ. قَالَ: وَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ وَالْوَحْيُ يَنْزِلُ عَلَيْهِمْ؟ قَالُوا: فَنَحْنُ؟ قَالَ: وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ وَأَنَا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ؟ وَلٰكِنْ أَعْجَبُ الْمُؤْمِنِينَ إِيمَانًا قَوْمٌ يجيؤون بَعْدِكُمْ يَجِدُونَ صُحُفًا يُؤْمِنُونَ بِمَا فِيهَا**

تمہارے نزدیک ایمان کے اعتبار سے سب سے زیادہ تعجب خیز کون ہے؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: فرشتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ایمان کیوں نہ لائیں جبکہ وہ اپنے رب کے پاس ہیں؟ انہوں نے عرض کیا: پھر انبیاء۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ ایمان کیوں نہ لائیں جبکہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے؟ انہوں نے عرض کیا: پھر ہم۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: تم ایمان کیوں نہ لاؤ گے جبکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں؟ بلکہ ایمان کے اعتبار سے سب سے زیادہ تعجب خیز وہ لوگ ہیں جو تمہارے بعد آئیں گے، وہ تحریری صحیفے پائیں گے اور ان میں جو کچھ لکھا ہو گا اس پر ایمان لے آئیں گے۔ (تفسیر ابن کثیر)

وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ: اس میثاق کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مقام پر فرمایا: اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو اس نے تم پر کی، اور اس عہد کو جو اس نے تم سے لیا، جب تم نے کہا: ہم نے سنا اور اطاعت کی، اس سے مراد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر کی گئی بیعت ہے۔ اور ابنِ جریر رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ اس میثاق سے مراد وہ عہد ہے جو اولادِ آدم سے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت میں لیا گیا تھا۔

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ: یعنی تم جو اپنے خیال میں اللہ پر ایمان لانے کے مدعی ہو اگر تم واقعی مومن ہو تو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ کیونکہ رسول کی وساطت کے بغیر اللہ پر کوئی ایمان صحیح نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ ایمان باللہ کا دعویٰ تو کافروں کو بھی تھا 'خدا کا اقرار کرنے کے ساتھ وہ بتوں کی بھی پوجا کرتے تھے اور ان کو اپنا سفارشی مانتے تھے (گویا ان کا ایمان شرک آمیز تھا اور توحید سے خالی تھا) (تفسیر مظہری)

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب اس طرح ہے کہ اگر کسی موجب کی وجہ سے تم ایمان لانے والے ہو تو یہ موجب موجود ہے، اس سے بڑھ کر اور کوئی موجب ایمان نہیں ہو سکتا۔ (بیضاوی) علامہ بغوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم کبھی کسی وقت ایمان لانے والے ہو تو یہ وقت ایمان لانے کا سب سے بہتر ہے۔ دلائل موجود ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو چکی اور قرآن نازل ہو گیا (اس سے بڑھ کر ایمان لانے کا اور کونسا دن آئے گا) (تفسیر بغوی)

شیخ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہا گر تم کسی بھی وجہ سے ایمان رکھتے ہو، تو ان تمام وجوہ میں سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ تمہارے درمیان موجود ہیں، جو تمہیں ایمان کی دعوت دیتے ہیں اور تمہیں اس ایمان کو مضبوطی سے تھامنے پر قائل کرتے ہیں۔ (الوسیط)

هُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبْدِهٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ: اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت محمد ﷺ پر واضح اور روشن آیات نازل فرمائیں، جن میں سب سے بڑی نشانی قرآن کریم ہے۔ امام عثیمین رحمہ اللہ لکھتے ہیں: آیات بینات سے مراد وہ روشن نشانیاں ہیں جو رسول اللہ ﷺ کی صداقت اور ان کے لائے ہوئے دین کی حقانیت پر دلالت کرتی ہیں، ان آیات میں قصص، احکام، فصاحت اور بلاغت سب شامل ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیات اس لیے نازل کیں کہ تمہیں کفر وضلالت کی تاریکیوں سے ایمان وہدایت کے نور میں داخل کرے۔

لِّیُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ: ان آیات کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو کفر، شرک، جہالت اور گمراہی کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان، علم، ہدایت اور یقین کے نور کی طرف لے آئیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے محمد ﷺ پر واضح دلائل، روشن حجتیں اور قاطع براہین نازل فرمائیں تاکہ تمہیں جہالت، کفر اور متضاد آراء کی تاریکیوں سے نکال کر ہدایت، یقین اور ایمان کے نور میں داخل کرے۔ اور اللہ تم پر بہت مہربان اور رحم کرنے والا ہے کہ اس نے تمہاری ہدایت کے لیے کتابیں نازل کیں اور رسول بھیجے۔

امام طبری رحمہ اللہ فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے محمد ﷺ پر آیات نازل کیں تاکہ تمہیں کفر کی تاریکیوں سے ایمان کے نور کی طرف نکالے اور گمراہی سے ہدایت کی طرف لے آئے اور اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت کے لیے جو آیات نازل کیں، یہ اس کی تم پر شفقت اور رحمت کی دلیل ہے۔ امام بیضاوی رحمہ اللہ کے مطابق: اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے پر روشن آیات نازل کیں تاکہ تمہیں کفر کی تاریکیوں سے ایمان کے نور کی طرف نکالے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ: اور اللہ تعالیٰ تم پر بہت مہربان ہے کہ اس نے تمہیں رسول اور آیات کے ذریعے ہدایت دی، صرف عقلی دلائل پر اکتفا نہیں کیا۔ رَءُوْفٌ اس وصف میں مبالغہ ہے کہ وہ سراسر رافت والا ہے، اور اس کا معنی یہ ہے: کسی کو ایسی چیز پہنچنے کو ناپسند کرنا جو اسے نقصان دے یا اذیت پہنچائے۔ رَحِيْمٌ: یہ بھی صفتِ رحمت میں مبالغہ ہے، اور اس کا معنی یہ ہے: دوسروں تک خیر اور نفع پہنچانے کو پسند فرمانا۔ یعنی: وہی اللہ تعالیٰ ہے جو اپنے بندے اور رسول محمد ﷺ پر واضح آیات نازل فرماتا ہے، یعنی روشن حجتیں اور نمایاں دلائل، تاکہ تمہیں کفر اور جہالت کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان اور علم کے نور میں لے آئے۔

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ نہ کرنے پر مذمت کی گئی ہے، یعنی تمہیں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے کون سی چیز منع کرتی ہے اور کون سی چیز تم کو اللہ کا قرب حاصل کرنے سے روکتی ہے، جب کہ تم اس دنیا میں اس مال کو یوں ہی چھوڑ کر مر جاؤ گے اور یہ مال تمہارے کسی کام نہیں آئے گا اور اگر تم اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کر دو تو تمہارے مرنے کے بعد بھی تمہیں اس مال سے نفع پہنچے گا۔ (تبیان القرآن)

شیخ طنطاوی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں" یہاں مضاف محذوف ہے، اور یہ جملہ اَلَّا تُنْفِقُوْا کے فاعل سے حال ہے، یا اس کے معلوم مفعول سے، جیسا کہ سابقہ کلام سے واضح ہے۔ (تفسیر الوسیط)

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تمہاری ساری دولت، مال و متاع اور زمین و آسمان کا اصل وارث اللہ ہی ہے، یعنی تمہاری دولت تمہارے پاس ہمیشہ نہیں رہے گی، تم مر جاؤ گے اور یہ سب اللہ کے پاس واپس چلا جائے گا، اس لیے اس مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرو تاکہ تمہیں اس کا اجر ملے۔ امام سمعانی رحمہ اللہ کے مطابق، اس آیت میں یہ بھی بتایا گیا کہ مال تمہارے پاس ہمیشہ نہیں رہے گا، اس لیے اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرو تاکہ تمہیں اس کا ثواب ملے۔

علامہ آلوسی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان وَلِلّٰهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ کا معنی یہ ہے کہ اللہ ہر اس چیز کا وارث ہو گا جو آسمانوں اور زمین میں ہے، اور کسی کے لیے کوئی مال باقی نہ رہے گا۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہاں آسمانوں اور زمین کی میراث مجاز یا کنایہ ہے، یعنی ان کے اندر موجود تمام چیزوں کی میراث، کیونکہ ظرف (آسمان و زمین) کو لینے سے مظروف (ان کے اندر کی چیزیں) کا لیا جانا لازم آتا ہے۔ یہ احتمال بھی ہے کہ مراد یہ ہو کہ اللہ آسمانوں اور زمین کا بھی اور ان کے اندر کی ہر چیز کا بھی وارث ہو گا، لیکن پہلا قول زیادہ راجح ہے، کیونکہ وہی ان کے لیے ملامت (توبیخ) کے لیے کافی ہے، اس مقام پر آسمان و زمین کے بذاتِ خود لینے سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ اور یہ جملہ ملامت کو مؤکد کرنے کے لیے ہے، کیونکہ بلا کسی سبب کے انفاق چھوڑ دینا نہایت قبیح اور ناپسندیدہ بات ہے، اور جب انفاق کے وجوب کو واضح کر دیا گیا ہو، تو پھر اس کا ترک کرنا اور زیادہ قبیح اور انکار کے زیادہ لائق بن جاتا ہے۔ (روح المعانی)

شیخ طنطاوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں اور میراث کی آسمانوں اور زمین کی طرف نسبت، مصدر کی مفعول کی طرف اضافت کے طور پر ہے، یعنی آخر کون سا سبب ہے جو تمہیں بخل پر آمادہ کرتا ہے اور اللہ کے کلمے کی سربلندی کے لیے خرچ کرنے سے روکتا ہے، حالانکہ آسمانوں اور زمین والوں کی میراث آخر کار اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہے، پس تمہارے لیے بخل اور مال روکنے کا کوئی عذر باقی نہیں رہتا، جبکہ تم پر واضح طور پر یہ بات بیان کر دی گئی ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا واجب ہے۔ (تفسیر الوسیط)

لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ: یہاں اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے دو گروہوں کا ذکر کیا، ایک وہ جنہوں نے "فتح" (یعنی فتح مکہ یا صلح حدیبیہ) سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا، دوسرا وہ جنہوں نے فتح کے بعد خرچ کیا اور جہاد کیا۔ فتح سے پہلے خرچ کرنے اور جہاد کرنے والوں کو زیادہ فضیلت دی گئی ہے، کیونکہ اس وقت اسلام کمزور تھا، مشکلات زیادہ تھیں اور ایمان و قربانی کی زیادہ ضرورت تھی،

اس لیے ان کی قربانی اور انفاق کا اجر زیادہ ہے۔ امام طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں، جو لوگ فتح مکہ سے پہلے ایمان لائے، ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں خرچ کیا، ان کا درجہ ان لوگوں سے زیادہ ہے جو بعد میں ایمان لائے اور خرچ کیا۔ امام زمخشری فرماتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں واضح کیا کہ جو لوگ پہلے ایمان لائے اور خرچ کیا، ان کا درجہ بعد والوں سے زیادہ ہے، کیونکہ انہوں نے زیادہ مشقتیں برداشت کیں اور ایمان میں سبقت لی۔

شان نزول: ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھے ہوئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ابو بکر رضی اللہ عنہ تھے ان کے اوپر ایک عباء تھی جس میں ان کے سینے کی جگہ سوراخ تھا، اسی وقت جبریل علیہ السلام آئے انہوں نے اللہ کی طرف سے آپ پر سلام کہہ سنایا اور کہا کہ اے محمد! کیا وجہ ہے کہ میں ابو بکر رضی اللہ عنہ کے اوپر عباء میں ان کے سینے کی جگہ ایک سوراخ دیکھتا ہوں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے جبریل! انہوں نے فتح مکہ سے پہلے مال مجھ پر خرچ کیا ہے تو جبریل نے کہا کہ اللہ کی طرف سے ان پر بھی سلام کہہ دیجیے اور ان سے کہیں کہ ان کا رب ان سے پوچھتا ہے کہ وہ اپنے رب سے اپنے اس فقر و ناداری پر راضی ہیں یا ناراض؟ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کہ اے ابو بکر! یہ جبریل ہیں اور اللہ کی طرف سے تم پر سلام کہتے ہیں اور تم سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم مجھ سے اپنے اس فقر پر راضی ہو اور خوش ہو یا ناراض؟ اس پر ابو بکر رضی اللہ عنہ رو پڑے اور کہا کیا میں اپنے رب سے ناراض ہوں؟ میں اپنے رب سے راضی ہوں میں اپنے رب سے راضی ہوں۔ (اسباب النزول) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہی وہ عظیم انسان ہیں جنہوں نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا، یہی وہ شخص ہیں جنہوں نے دین اسلام اور پیغمبر اسلام کے لیے سب سے پہلے مال لٹایا۔

ابو بکر جصاص رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فتح مکہ سے پہلے کے انفاق کی، بعد کے انفاق پر فضیلت کو واضح کر دیا کیونکہ فتح مکہ سے پہلے اللہ کے راستے میں انفاق کوئی آسان بات نہیں تھی لیکن اس انفاق سے بہت سے فوائد حاصل ہوتے تھے، نیز اس وقت اللہ کی راہ میں خرچ کرنا نفس کے لیے

بہت بھاری بات تھی کیونکہ مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، کافر بڑی تعداد میں تھے نیز مشکلات اور پریشانیاں بھی بہت شدید تھیں، ایسے وقت میں انفاق دراصل اطاعت خداوندی کی طرف لپکنے کے مترادف تھا، آپ نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَلَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ فِیْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ، وہ لوگ جنہوں نے عسرت (تنگی) کی گھڑی میں رسول ﷺ کی پیروی کی ۔ نیز ارشاد ہے وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ اور وہ لوگ جو سابقین اولین ہیں، یہ تمام وجوہات فتح مکہ سے قبل کے انفاق کی فضیلت کے مقتضی ہیں۔ (احکام القرآن للجصاص)

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى : سب کے لیے اللہ نے حسنیٰ کا وعدہ فرمایا ہے، یہ فرمان دونوں گروہوں کی مدح و تعریف کے لیے ہے اور اس وہم کو دور کرنے کے لیے ہے کہ کہیں کوئی یہ گمان نہ کر لے کہ دوسرا گروہ یعنی وہ لوگ جنہوں نے فتح کے بعد انفاق کیا اور جہاد کیا، اجر و ثواب سے محروم ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے دونوں ہی گروہوں سے بہترین بدلہ کا وعدہ فرمایا ہے اور وہ بدلہ جنت ہے، البتہ وہ لوگ جنہوں نے فتح سے پہلے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد کیا، درجے کے اعتبار سے ان لوگوں سے اعلیٰ و برتر ہیں جنہوں نے اس کے بعد انفاق اور قتال کیا، پس یہ آیت اہلِ فضل کے درمیان باہمی درجات کے فرق کی اصل بنیاد ہے اور یہ کہ فضیلت سب کے لیے ثابت ہے، لیکن وہ اپنے اعمال، جہاد، اور سبقت و پیش قدمی کے اعتبار سے ایک دوسرے پر فوقیت رکھتے ہیں۔

حسنیٰ سے کیا مراد ہے؟ امام طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں، "الْحُسْنٰى" سے مراد جنت ہے۔ قتادہ، سدی، اور دیگر مفسرین رحمہم اللہ نے بھی یہی کہا کہ کلا وعد اللہ الحسنی سے جنت مراد ہے۔ ابن زید کے مطابق "الْحُسْنٰى" سے مراد وہ سعادت ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے مقدر کی ہے۔ بعض مفسرین نے کہا کہ "الْحُسْنٰى" سے مراد ایمان، توحید، یا کلمہ لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ہے۔ لغوی اعتبار سے "الْحُسْنٰى" ہر اس نعمت اور بھلائی پر بولا جاتا ہے جو انسان کو حاصل ہو، جیسے جنت، سعادت، یا اللہ کی رضا۔ بعض تفاسیر میں آیا ہے کہ "الْحُسْنٰى" سے مراد وہ بہترین بدلہ ہے جو اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کو عطا فرمائے گا۔

وَاللّٰہُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ: اور اللہ تمہارے تمام اعمال سے خوب باخبر ہے۔ یہ جملہ دراصل انفاق فی سبیل اللہ اور ایمان و جہاد کے احکام کے بعد بطورِ تنبیہ، ترغیب اور وعید آیا ہے، یہاں علمِ الٰہی کی ہمہ گیری بیان کی جارہی ہے، یہاں لفظ خَبِیْرٌ محض جاننے کے معنی میں نہیں، بلکہ باطن و ظاہر، نیت و ارادہ، اخلاص و ریا، کمی و زیادتی سب پر کامل اور باریک بین علم کو شامل ہے، یعنی اللہ تعالیٰ صرف یہ نہیں جانتا کہ تم نے خرچ کیا یا نہیں، بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ کس نیت سے کیا، کس موقع پر کیا، دل کی کیفیت کیا تھی، خوش دلی سے تھا یا مجبوری سے، یہاں اخلاص کی طرف اشارہ ہے، اس جملے میں واضح پیغام ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا محض ظاہری عمل نہیں، بلکہ اس کی قدر و قیمت نیت اور اخلاص کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، جو شخص دکھاوے، نام و نمود یا دنیاوی مفاد کے لیے خرچ کرے، وہ اللہ کے علم سے مخفی نہیں، یہاں بخل کرنے والوں کے لیے تنبیہ ہے، اسی طرح جو لوگ قدرت کے باوجود انفاق سے گریز کریں، مال روک لیں، یا تاویلوں سے کام لیں وہ بھی یہ نہ سمجھیں کہ وہ بچ نکلیں گے، کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کے اس بخل، ان کی نیت اور ان کے دل کے حال سے پورا باخبر ہے۔ اس فقرے میں یہ اشارہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو اس کے عمل کے مطابق بدلہ دے گا، کسی کا اجر ضائع نہ ہو گا اور کسی کا بخل یا کوتاہی نظر انداز نہ کی جائے گی۔

انفاق کی قبولیت اور درجات کا فرق: چونکہ اللہ خبیر ہے، اس لیے وہی بہتر جانتا ہے کہ کس کا انفاق افضل ہے، کون پہلے خرچ کرنے والا ہے اور کس کا عمل زیادہ خلوص پر مبنی ہے، اسی بنا پر لوگوں کے درجات میں تفاوت ہو گا۔

قرض حسن اور اس کا اجر

سوال اس آیت کی تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ ہم کس طرح اللہ کو قرض حسن دے سکتے ہیں؟

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗۤ اَجْرٌ کَرِیْمٌ {۱۱} الحدید.

جواب ترجمہ: کون ہے جو اللہ کو قرض دے؟ اچھا قرض جس کے نتیجے میں اللہ اسے دینے والے

کے لیے کئی گنا بڑھا دے؟ اور ایسے شخص کو بڑا باعزت اجر ملے گا۔

قرض حسن وہ قرض ہوتا ہے جس میں نہ سود ہو اور نہ کوئی دیگر غرض وابستہ ہو۔ سورۃ المدثر میں فرمایا وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ (آیت ۶) یعنی کسی پر احسان کر کے مزید مفاد حاصل کرنا مقصود نہ ہو بلکہ محض مومن بھائی کی ضرورت پوری کرنا مقصود ہو۔ اس قرض حسنہ کا مقصد بھی ریاکاری یا غرض فاسد نہ ہو بلکہ اس سے اللہ کے ہاں سے اجر و ثواب مقصود ہو۔ اس کے برخلاف جو شخص اسلامی نظام کے قیام کے لئے حسب ضرورت مال صرف نہیں کرتا اس کا نام منافقوں کی فہرست میں لکھا جاتا ہے۔ اور ایسا شخص دنیا اور عقبیٰ میں نقصان اٹھانے والا ہو گا۔ (معالم العرفان)

ہم اللہ تعالیٰ کے راستے میں ثواب اور اجر کی نیت سے مال خرچ کریں، اس میں کوئی احسان جتلانا اور کوئی ایذا دہی کا معاملہ بھی مد نظر نہیں ہونا چاہیے، ایسا کرنے سے اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت میں دگنا اجر و ثواب عطا فرمائیں گے اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ ہمیں عزت والا بدلہ یعنی جنت عطا فرمائیں گے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے لیے قرض کے لفظ میں جو اپیل ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی سپرد کردہ امانت ہے۔ اب یہ کتنا بڑا فضل ہے اس رب کریم کا کہ وہ اپنا ہی عطا کیا ہوا مال اپنی راہ میں خرچ کرنے کی جب بندوں کو دعوت دیتا ہے تو اس کو اپنے ذمہ قرض ٹھہراتا ہے جس کی واپسی کا وہ گویا اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح ایک قرض دار اپنے مہاجن کی رقم کی واپسی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

فَيُضٰعِفَهٗ: یعنی اللہ تعالیٰ یہ قرض اس لیے نہیں مانگ رہا ہے کہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے۔ جب سب کچھ اسی کا پیدا کردہ اور اسی کا عطا کردہ ہے تو اس کے پاس کمی کا کیا سوال؟ بلکہ وہ تو صرف اس لیے مانگ رہا ہے کہ لوگوں کے عطا کردہ مال کو وہ اپنے بنک میں جمع کر کے اس کو اچھی طرح بڑھائے تاکہ اس کا منافع ایک ابدی زندگی میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سرمایہ کی صورت میں ان کے کام آئے۔

اس اسلوب بیان میں سود خواروں پر جو تعریض ہے وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اپنا سرمایہ اس دنیا کے بنک میں جمع کرتا ہے تو یہ دنیا اور اس کا سرمایہ ہر چیز چند روزہ ہے البتہ جو اپنا مال اپنے رب کے پاس جمع کرتے ہیں ان کا منافع ابدی اور ہر اندیشہ سے محفوظ ہے۔ (تدبر قرآن)

قرض حسن کی شرائط: حضرات مفسرین کرام نے قرض حسن کی آٹھ شرائط بیان فرمائی ہیں :

① اللہ تعالیٰ کی راہ میں رزق حلال سے صدقہ دیا جائے، قرآن مجید میں ہے: اے ایمان والو! اللہ کی راہ میں اپنی پاکیزہ کمائی سے خرچ کرو۔ (البقرہ ۲۶۷) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: بیشک اللہ طیب ہے اور طیب کے سوا کسی چیز کو قبول نہیں کرتا۔ (مسلم، مصنف عبد الرزاق، احمد) حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ بغیر وضو کے نماز قبول نہیں کرتا نہ مال حرام سے صدقہ قبول کرتا ہے۔ (مسلم، ترمذی، ابن ماجہ)

② انسان اللہ تعالیٰ کی راہ میں اچھی چیز صدقہ دے، ردی چیز نہ دے، قرآن مجید میں ہے: ان میں سے بری چیز کو خرچ کرنے کا قصد نہ کرو، جس کو تم خود لینے والے نہیں ہو، سوا اس کے کہ تم آنکھیں بند کرلو۔ (البقرہ ۲۶۷)

③ تم اس چیز کو صدقہ کرو جو تم کو پسند ہو اور تمہیں اس کی ضرورت ہو کہ تم اس کے بعد زندہ رہو گے، قرآن مجید میں ہے: اور اپنی محبت کے باوجود مال اللہ کی راہ میں دے۔ (البقرہ ۱۷۷) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ کے پاس آکر کہا: یا رسول اللہ! کون سے صدقہ کا سب سے زیادہ اجر ہوتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تم اس وقت صدقہ کرو جب تم تندرست ہو اور کفایت شعار ہو، تمہیں تنگ دستی کا خطرہ ہو اور خوشحالی کی امید ہو اور صدقہ کرنے میں ڈھیل نہ دیتے رہو حتیٰ کہ جب تمہاری روح حلقوم تک پہنچ جائے، اس وقت تم کہو کہ فلاں کے لئے اتنا ہے، فلاں کے لئے اتنا ہے اور اب تو فلاح کے لئے ہو ہی جائے گا۔ (بخاری، مسلم، ابوداؤد، نسائی)

④ حتی الامکان چھپا کر صدقہ کیا جائے، قرآن مجید میں ہے، اور اگر تم چھپا کر صدقہ کرو اور فقراء کو دو تو یہ تمہارے لئے زیادہ بہتر ہے۔(البقرہ ۲۷۱)حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جس دن اللہ کے سائے کے سوا کسی کا سایہ نہیں ہو گا، اس دن سات آدمی اللہ کے سائے میں ہوں گے (ان میں سے ایک وہ شخص ہے) جس نے چھپا کر صدقہ کیا حتیٰ کہ بائیں ہاتھ کو پتا نہ چلا کہ دائیں ہاتھ نے خرچ کیا ہے۔(بخاری، مسلم، ترمذی، سنن کبریٰ للنسائی)

⑤ جس پر صدقہ کیا ہے اس پر صدقہ کا احسان جتائے نہ اس کو طعنہ دے کر اذیت پہنچائے، قرآن مجید میں ہے: احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر اپنے صدقات کو ضائع نہ کرو۔(البقرہ ۲۶۴)علامہ قرطبی فرماتے ہیں، نبی ﷺ سے روایت ہے کہ تم نیکی پر احسان نہ جتاؤ، کیونکہ یہ شکر کو باطل کرتا ہے اور اجر کو ضائع کرتا ہے۔(الجامع لاحکام القرآن)

⑥ صرف اللہ کی رضا جوئی کی نیت سے صدقہ کرے، دکھاوے کی نیت سے صدقہ نہ کرے، قرآن مجید میں ہے: صرف اپنے رب اعلیٰ کی رضا طلب کرنے کے لئے صدقہ دیا۔(سورۃ اللیل ۲۰)

⑦ جتنا زیادہ صدقہ کرے اس کو کم سمجھے اور اپنے صدقہ کو زیادہ خیال نہ کرے، قرآن مجید میں ہے: اور زیادہ گمان کر کے احسان نہ کر۔(یہ ایک محمل ہے)(المدثر ۶)

⑧ جو چیز زیادہ پسندیدہ ہو اس کو اللہ کی راہ میں صدقہ کرے، قرآن مجید میں ہے: تم ہر گز نیکی نہیں پا سکو گے حتیٰ کہ اپنی پسندیدہ چیزوں سے صدقہ کرو۔(آل عمران ۹۲)حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن (کامل) نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لئے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جو اپنے لئے پسند کرتا ہو۔(بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ بحوالہ تبیان القرآن)

اہل ایمان کے لیے پلصراط پر نور

سوال کیا ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کے لیے قیامت کے دن پلصراط پر روشنی ہو گی؟ اس وقت منافق مرد اور منافقہ عورتیں ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں سے کیا بات

کریں گی؟ فرشتے منافق مردوں اور منافقہ عورتوں سے کیا کہیں گے؟ کیا اس وقت منافقین اور منافقات ایمان والے مردوں اور عورتوں سے روشنی حاصل کرنے کے لیے مل سکیں گے؟ ان آیات کی روشنی میں بیان کیجیے۔

يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ {۱۲} يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ {۱۳} الحدید.

جواب ترجمہ: اس دن جب تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے دائیں جانب دوڑ رہا ہو گا (اور ان سے کہا جائے گا کہ) آج تمہیں خوشخبری ہے ان باغات کی جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، جن میں تم ہمیشہ ہمیشہ رہو گے۔ یہی ہے جو بڑی زبردست کامیابی ہے۔ اس دن جب منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے کہ: ذرا ہمارا انتظار کرلو کہ تمہارے نور سے ہم بھی کچھ روشنی حاصل کرلیں۔ ان سے کہا جائے گا کہ: تم اپنے پیچھے لوٹ جاؤ، پھر نور تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا جس کے اندر کی طرف رحمت ہو گی، اور باہر کی طرف عذاب ہو گا۔

جی ہاں، ایمان والے مردوں اور عورتوں کے لیے پلصراط پر روشنی ہو گی جس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہوئے پلصراط عبور کریں گے، اس وقت منافقین اور منافقات ایمان والے مردوں اور عورتوں سے کہیں گے کہ ہمارا انتظار کیجیے تاکہ ہم تمہارے نور سے کوئی روشنی حاصل کر سکیں، فرشتے منافقین اور منافقات سے کہیں گے کہ پیچھے کی طرف لوٹ جاؤ وہاں سے روشنی حاصل کرو، یہ ان سے مزاح کرتے ہوئے کہیں گے، اس وقت ان کے اور ایمان والوں کے درمیان ایک دیوار کے ذریعے فاصلہ کر دیا

جائے گا، اس دیوار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ اعراف کی دیوار ہو گی، جس کا دروازہ ہو گا، جہاں ایمان والوں کی جانب رحمت ہو گی اور منافقین کی جانب عذاب ہو گا۔

علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ اس مقام پر لکھتے ہیں یہاں بیان ہو رہا ہے کہ مسلمانوں کے نیک اعمال کے مطابق انہیں نور ملے گا جو قیامت کے دن ان کے ساتھ ساتھ رہے گا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں عَلَى قَدْرِ أَعْمَالِهِمْ يَمُرُّوْنَ عَلَى الصِّرَاطِ، مِنْهُمْ مَنْ نُوْرُهُ مِثْلُ الْجَبَلِ، وَمِنْهُمْ مَنْ نُوْرُهُ مِثْلُ النَّخْلَةِ، وَمِنْهُمْ مَنْ نُوْرُهُ مِثْلُ الرَّجُلِ الْقَائِمِ، وَأَدْنَاهُمْ نُوْرًا مَنْ نُوْرُهُ فِي إِبْهَامِهِ يُتَّقَدُ مَرَّةً وَيُطْفَأُ مَرَّةً (ابن ابی حاتم، ابن جریر) یہ نور لوگوں کے اعمال کے اعتبار سے پلصراط پر ہو گا، ان میں بعض کا نور پہاڑوں کے برابر ہو گا اور بعض کا کھجور کے درختوں کے برابر اور بعض کا کھڑے انسان کے قد کے برابر، سب سے کم نور جس گنہگار مومن کا ہو گا اس کے پیر کے انگوٹھے پر نور ہو گا جو کبھی روشن ہوتا ہو گا اور کبھی بجھ جاتا ہو گا۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان بتایا گیا، جس میں حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں کہ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ مَنْ يُضِيءُ نُورُهُ مِنَ الْمَدِينَةِ إِلَى عَدَنٍ أَبْيَنَ وَصَنْعَاءَ فَدُونَ ذَلِكَ، حَتَّى إِنَّ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ مَنْ يُضِيءُ نُورُهُ مَوْضِعَ قَدَمَيْهِ (طبری) بعض مومن ایسے بھی ہوں گے جن کا نور اس قدر ہو گا کہ جس قدر مدینہ سے عدن دور ہے اور ابین دور ہے اور صنعا دور ہے۔ بعض اس سے کم بعض اس سے کم یہاں تک کہ بعض وہ بھی ہوں گے جن کے نور سے صرف ان کے دونوں قدموں کے پاس ہی اجالا ہو گا۔

حضرت جنادہ بن ابو امیہ فرماتے ہیں إِنَّكُمْ مَكْتُوبُونَ عِنْدَ اللهِ بِأَسْمَائِكُمْ، وَسِيمَاكُمْ وَحُلَاكُمْ، وَنَجْوَاكُمْ وَمَجَالِسِكُمْ، فَإِذَا كَانَ يَوْمُ الْقِيَامَةِ قِيلَ: يَا فُلَانُ، هَذَا نُورُكَ. يَا فُلَانُ، لَا نُورَ لَكَ (تفسیر ابن کثیر) لوگو! تمہارے نام مع ولدیت کے اور خاص نشانیوں کے اللہ کے ہاں لکھے ہوئے ہیں اسی طرح تمہارا ہر ظاہر باطن عمل بھی وہاں لکھا ہوا ہے، قیامت کے دن نام لے کر

پکار کر کہہ دیا جائے گا کہ اے فلاں یہ تیرا نور ہے اور اے فلاں تیرے لئے کوئی نور ہمارے ہاں نہیں۔ پھر آپ نے اسی آیت کی تلاوت فرمائی۔

حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں لَيْسَ لِأَحَدٍ إِلَّا يُعْطَى نُورًا يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَإِذَا انْتَهَوْا إِلَى الصِّرَاطِ طُفِئَ نُورُ الْمُنَافِقِينَ، فَلَمَّا رَأَى ذَلِكَ الْمُؤْمِنُونَ أَشْفَقُوا أَنْ يُطْفَأَ نُورُهُمْ كَمَا طُفِئَ نُورُ الْمُنَافِقِينَ، فَقَالُوا: رَبَّنَا، أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا (تفسیر ابن کثیر) اول اول تو ہر شخص کو نور عطا ہو گا لیکن جب پل صراط پر جائیں گے تو منافقوں کا نور بجھ جائے گا اسے دیکھ کر مومن بھی ڈرنے لگیں گے کہ ایسا نہ ہو ہمارا نور بھی بجھ جائے تو اللہ سے دعائیں کریں گے کہ یا اللہ ہمارا نور ہمارے لئے پورا پورا کر۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں اس آیت سے مراد پل صراط پر نور کا ملنا ہے تاکہ اس اندھیری جگہ سے آرام کے ساتھ گذر جائیں۔ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں أَنَا أَوَّلُ مَنْ يُؤْذَنُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِالسُّجُودِ، وَأَوَّلُ مَنْ يُؤْذَنُ لَهُ بِرَفْعِ رَأْسِهِ، فَأَنْظُرُ مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِي، وَعَنْ يَمِينِي وَعَنْ شِمَالِي، فَأَعْرِفُ أُمَّتِي مِنْ بَيْنِ الْأُمَمِ. فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ: يَا نَبِيَّ اللَّهِ، كَيْفَ تَعْرِفُ أُمَّتَكَ مِنْ بَيْنِ الْأُمَمِ، مَا بَيْنَ نُوحٍ إِلَى أُمَّتِكَ؟ قَالَ: أَعْرِفُهُمْ، مُحَجَّلون مِنْ أَثَرِ الْوُضُوءِ، وَلَا يَكُونُ لِأَحَدٍ مِنَ الْأُمَمِ غَيْرِهِمْ، وَأَعْرِفُهُمْ يُؤْتَون كُتُبَهُمْ بِأَيْمَانِهِمْ، وَأَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ، وَأَعْرِفُهُمْ بِنُورِهِمْ يَسْعَى بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَذُرِّيَّتِهِمْ (مستدرک حاکم، تفسیر ابن کثیر)

سب سے پہلے سجدے کی اجازت قیامت کے دن مجھے دی جائے گی اور اسی طرح سب سے پہلے سجدے سے سر اٹھانے کا حکم بھی مجھے ہو گا، میں آگے پیچھے دائیں بائیں نظر ڈالوں گا اور اپنی امت کو پہچان لوں گا۔ تو ایک شخص نے عرض کیا، یا نبی اللہ! حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر آپ کی امت تک کی تمام امتیں اس میدان میں اکٹھی ہوں گی، ان میں سے آپ اپنی امت کی شناخت کیسے کریں گے؟

آپ نے فرمایا بعض مخصوص نشانیوں کی وجہ سے میری امت کے اعضاء وضو چمک رہے ہوں گے یہ وصف کسی اور امت میں نہ ہو گا اور انہیں ان کے نامہ اعمال ان کے داہنے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے اور ان کے چہرے چمک رہے ہوں گے اور ان کا نور ان کے آگے آگے چلتا ہو گا اور ان کی اولاد ان کے ساتھ ہی ہو گی۔

ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں ان کے دائیں ہاتھ میں ان کا عمل نامہ ہو گا جیسے اور آیتوں میں تشریح ہے۔ ان سے کہا جائے گا کہ آج تمہیں ان جنتوں کی بشارت ہے جن کے چپے چپے پر چشمے جاری ہیں جہاں سے کبھی نکلنا نہیں، یہ زبردست کامیابی ہے۔

سلیم بن عامر رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم ایک جنازے کے ساتھ باب دمشق میں تھے جب جنازے کی نماز ہو چکی اور دفن کا کام شروع ہوا تو حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ نے فرمایا لوگو! تم اس دنیا کی منزل میں آج صبح شام کر رہے ہو، نیکیاں برائیاں کر سکتے ہو، اس کے بعد ایک اور منزل کی طرف تم سب کوچ کرنے والے ہو، وہ منزل یہی قبر کی ہے جو تنہائی کا، اندھیرے کا، کیڑوں کا اور تنگی اور تاریکی والا گھر ہے مگر جس کے لئے اللہ تعالیٰ اسے وسعت دے دے۔

یہاں سے تم پھر میدان قیامت کے مختلف مقامات پر وارد ہو گے۔ ایک جگہ بہت سے لوگوں کے چہرے سفید ہو جائیں گے اور بہت سے لوگوں کے سیاہ پڑ جائیں گے، پھر ایک اور میدان میں جاؤ گے جہاں سخت اندھیرا ہو گا وہاں ایمانداروں کو نور تقسیم کیا جائے گا اور کافر و منافق بے نور رہ جائے گا، اسی کا ذکر آیت {أَوْ كَظُلُمَاتٍ فِي بَحْرٍ لُّجِّيٍّ} ، میں ہے۔

جس طرح آنکھوں والے کی بصارت سے اندھا کوئی نفع حاصل نہیں کر سکتا، منافق و کافر ایماندار کے نور سے کچھ فائدہ نہ اٹھا سکے گا۔ تو منافق ایمانداروں سے آرزو کریں گے کہ اس قدر آگے نہ بڑھ جاؤ کچھ تو ٹھہرو جو ہم بھی تمہارے نور کے سہارے چلیں تو جس طرح یہ دنیا میں مسلمانوں کے ساتھ مکر و فریب کرتے تھے آج ان سے کہا جائے گا کہ لوٹ جاؤ اور نور تلاش کر لاؤ یہ واپس نور کی تقسیم کی

جگہ جائیں گے لیکن وہاں کچھ نہ پائیں گے، یہی اللہ کا وہ مکر ہے، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ اِلَّا قَلِيْلًا (النسآء: ۱۴۲) میں ہے۔ اب لوٹ کر یہاں جو آئیں گے تو دیکھیں گے کہ مومنوں اور ان کے درمیان ایک دیوار حائل ہو گئی ہے جس کے اس طرف رحمت ہی رحمت ہے اور اس طرف عذاب و سزا ہے۔ پس منافق نور کی تقسیم کے وقت تک دھوکے میں ہی پڑا رہے گا، نور مل جانے پر بھید کھل جائے گا تمیز ہو جائے گی اور یہ منافق اللہ کی رحمت سے مایوس ہو جائیں گے۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ جب کامل اندھیرا چھایا ہوا ہو گا کہ کوئی انسان اپنا ہاتھ بھی نہ دیکھ سکے اس وقت اللہ تعالیٰ ایک نور ظاہر کرے گا مسلمان اس طرف جانے لگیں گے تو منافق بھی پیچھے لگ جائیں گے۔ جب مومن زیادہ آگے نکل جائیں گے تو یہ انہیں ٹھہرانے کے لئے آواز دیں گے اور یاد دلائیں گے کہ دنیا میں ہم سب ساتھ ہی تھے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو ان کی پردہ پوشی کے لئے ان کے ناموں سے پکارا جائے گا لیکن پل صراط پر تمیز ہو جائے گی مومنوں کو نور ملے گا اور منافقوں کو بھی ملے گا لیکن جب درمیان میں پہنچ جائیں گے منافقوں کا نور بجھ جائے گا یہ مومنوں کو آواز دیں گے لیکن اس وقت خود مومن خوف زدہ ہو رہے ہوں گے یہ وہ وقت ہو گا کہ ہر ایک آپا دھاپی میں ہو گا۔

جس دیوار کا یہاں ذکر ہے یہ جنت و دوزخ کے درمیان حد فاصل ہو گی اسی کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیت ۴۶ میں یوں فرمایا گیا ہے وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ وَعَلَى الْاَعْرَافِ رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّا بِسِيْمٰهُمْ وَنَادَوْٓا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ (الاعراف:۴۶) پس جنت میں رحمت اور جہنم میں عذاب ہے۔ ٹھیک بات یہی ہے لیکن بعض کا قول ہے کہ اس سے مراد بیت المقدس کی دیوار ہے جو جہنم کی وادی کے پاس ہو گی، ابن عمر سے مروی ہے

کہ یہ دیوار بیت المقدس کی شرقی دیوار ہے جس کے باطن میں مسجد وغیرہ ہے اور جس کے ظاہر میں وادی جہنم ہے اور بعض بزرگوں نے بھی یہی کہا ہے۔

یہ اقوال نقل کرنے کے بعد مفسر قرآن ابن کثیر لکھتے ہیں کہ لیکن یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان کا مطلب یہ نہیں کہ بعینہ یہی دیوار اس آیت میں مراد ہے بلکہ اس کا ذکر بطور قرب کے معنٰی میں آیت کی تفسیر میں ان حضرات نے کر دیا ہے اس لئے کہ جنت آسمانوں میں اعلیٰ علیین میں ہے اور جہنم اسفل السافلین میں ہے۔ (ابن کثیر)

حضرت کعب احبار سے مروی ہے کہ جس دروازے کا ذکر اس آیت میں ہے اس سے مراد مسجد کا باب الرحمت ہے یہ بنو اسرائیل کی روایت ہے جو ہمارے لئے سند نہیں بن سکتی۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دیوار قیامت کے دن مومنوں اور منافقوں کے درمیان علیحدگی کے لئے کھڑی کی جائے گی مومن تو اس کے دروازے میں سے جا کر جنت میں پہنچ جائیں گے پھر دروازہ بند ہو جائے گا اور منافق حیرت زدہ ظلمت و عذاب میں رہ جائیں گے۔ جیسے کہ دنیا میں بھی یہ لوگ کفر و جہالت شک و حیرت کے اندھیروں میں تھے، اب یہ یاد دلائیں گے کہ دیکھو دنیا میں ہم تمہارے ساتھ تھے جمعہ جماعت ادا کرتے تھے عرفات اور غزوات میں موجود رہتے تھے واجبات ادا کرتے تھے۔

ایماندار کہیں گے ہاں بات تو ٹھیک ہے لیکن اپنے کرتوت تو دیکھو گناہوں میں نفسانی خواہشوں میں اللہ کی نافرمانیوں میں عمر بھر تم لذتیں اٹھاتے رہے اور آج توبہ کر لیں گے کل بداعمالیوں کو چھوڑ دیں گے اسی میں رہے۔ انتظار میں ہی عمر گزار دی کہ دیکھیں مسلمانوں کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اور تمہیں یہ بھی یقین نہ آیا کہ قیامت آئے گی بھی یا نہیں؟ اور پھر اس آرزو میں رہے کہ اگر آئے گی پھر تو ہم ضرور بخش دیئے جائیں گے اور مرتے دم تک اللہ کی طرف یقین خلوص کے ساتھ جھکنے کی توفیق میسر نہ آئی اور اللہ کے ساتھ تمہیں دھوکے باز شیطان نے دھوکے میں ہی رکھا۔

یہاں تک کہ آج تم جہنم واصل ہوگئے۔ مطلب یہ ہے کہ جسموں سے تو تم ہمارے ساتھ تھے لیکن دل اور نیت سے ہمارے ساتھ نہ تھے بلکہ حیرت وشک میں ہی پڑے رہے ریاکاری میں رہے اور دل لگا کر یاد الٰہی کرنا بھی تمہیں نصیب نہ ہوا۔ (ابن کثیر) حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ یہ منافق مومنوں کے ساتھ تھے نکاح بیاہ مجلس مجمع موت زیست میں شریک رہے۔ کہ خبر دار ان کا رنگ تم پر نہ چڑھ جائے۔ اصل وفرع میں ان سے بالکل الگ رہو۔

منافقین کو دندان شکن جوابات

سوال بروز محشر منافقین مرد اور عورتیں ایمان والے مردوں اور عورتوں کو یہ کہتے ہوئے پکاریں گے کہ کیا ہم دنیا میں تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ ہم بھی دینی شعائر تمہاری طرح ادا کر رہے تھے۔ ایمان والے لوگ منافقوں کو بتائیں گے کہ وہ کن اسباب کی بدولت جنت میں نہیں گئے، تو بتایئے کہ منافقین کے جنت میں نہ جانے کے اسباب کیے ہوں گے؟ ان آیات کی روشنی میں بتایئے۔

يُنَادُوْنَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ {۱۴} فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ {۱۵} الحدید.

جواب ترجمہ: وہ (منافقین) مومنوں کو پکاریں گے کہ: کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ مومن کہیں گے کہ: ہاں تھے تو سہی، لیکن تم نے خود اپنے آپ کو فتنے میں ڈال لیا، اور انتظار میں رہے، شک میں پڑے رہے، اور جھوٹی آرزوؤں نے تمہیں دھوکے میں ڈالے رکھا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آگیا اور وہ بڑا دھوکے باز (یعنی شیطان) تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکا ہی دیتا رہا۔ بس آج تم سے کسی طرح کا فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا اور نہ ان لوگوں سے جنہوں نے انکار کیا، تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے، وہی تمہارے ساتھ ہے اور وہ بدترین انجام ہے۔

ایمان والے منافقوں سے کہیں گے کہ جی ہاں، آپ بظاہر تو ہمارے ساتھ ہی تھے لیکن تم نے اپنے کو منافقت اور گناہوں کی بدولت ہلاکت وبربادی میں ڈالا تھا۔ تم لوگ اس قدر دھوکے میں مبتلا ہوگئے تھے کہ حضرت نبی کریم ﷺ اور اہل ایمان کی گردش زمانہ کی لپیٹ میں آنے اور موت کے منہ میں چلے جانے کا انتظار کرتے رہے، جس کے باعث تم وہ کام نہ کرسکے جو اہل ایمان اللہ کو راضی کرنے کے لیے کرتے تھے، یہ سبب ہے تمہارے دوزخ میں جانے اور جنت سے محروم ہونے کا۔ ایمان والے منافقوں سے کہیں گے کہ تم لوگوں نے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونے کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا، تم مرنے کے بعد والی زندگی کو تسلیم نہیں کرتے تھے، یہ سبب تھا تمہارے دوزخ میں جانے اور جنت سے محروم رہنے کا۔

ایمان والے منافقوں سے کہیں گے کہ تمہیں تمہاری باطل آرزؤں اور امیدوں نے دھوکے میں ڈالا تھا، جس کے باعث تم درست طریقے پر نہیں تھے، اسی لیے دوزخ کے حقدار اور جنت سے محروم ٹھہرے۔ ایمان والے ان منافقین سے کہیں گے کہ تمہیں اللہ کی ذات کے بارے میں شیطان نے جس دھوکے میں مبتلا کیا تھا، جن شکوک وشبہات میں ڈالا تھا، تم آخر دم تک اسی حال میں رہے، یہاں تک کہ تمہیں موت نے گلے لگالیا تھا، اس لیے تم دوزخ میں ڈالے گئے اور جنت سے دور رکھے گئے۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: فدیہ قبول نہ ہونے کا مفہوم: اس آیت میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن منافقین اور کافروں سے خطاب کررہا ہے کہ آج کے دن تم سے کوئی فدیہ (یعنی بدلہ، معاوضہ، یا کوئی چیز دے کر اپنے آپ کو عذاب سے بچانے کی کوشش) قبول نہیں کی جائے گی۔ نہ تم سے اور نہ ہی ان کافروں سے جو کھلم کھلا کفر کرتے تھے۔ اس دن نہ مال، نہ اولاد، نہ کوئی اور چیز تمہیں عذاب سے نہیں بچاسکے گی۔ امام طبری رحمہ اللہ لکھتے ہیں: یعنی: آج تم سے کوئی فدیہ، کوئی عوض یا بدل قبول نہیں کیا جائے گا جو تمہیں اللہ کے عذاب سے بچاسکے۔ اور یہی حال ان لوگوں کا بھی ہوگا جنہوں نے کھلم کھلا کفر کیا۔

مَاْوٰىكُمُ النَّارُ هِيَ مَوْلٰىكُمْ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ: اس سے مراد یہ ہے کہ تمہارا اصل ٹھکانہ، تمہاری آخری منزل جہنم ہے۔ تم ہمیشہ کے لیے اسی میں رہو گے اور اس سے نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ہو گی۔ هِيَ مَوْلٰىكُمْ : مفسرین نے اس جملے کے کئی معانی بیان کیے ہیں: بعض نے کہا: "مولا" سے مراد "اولیٰ بکم" یعنی جہنم ہی تمہارے لیے سب سے زیادہ مناسب اور تمہارے اعمال کا اصل بدلہ ہے۔ بعض نے کہا: "مولا" یعنی "ناصر" (مددگار) کے معنی میں ہے، لیکن یہاں یہ معنی بطورِ طنز و توبیخ کے ہیں، یعنی اگر تمہارا کوئی مددگار ہے تو وہ جہنم ہی ہے، اور حقیقت میں تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ بعض نے کہا: "مولا" یعنی وہ تم پر مکمل اختیار رکھتی ہے، جیسے مالک اپنے غلام پر اختیار رکھتا ہے۔

وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ: یعنی جہنم بہت ہی برا انجام اور بدترین ٹھکانہ ہے، اس سے زیادہ برا اور کوئی انجام ہیں ہو سکتا۔

دلوں کی سختی اور نرمی

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ {١٦} الحدید.

جواب ترجمہ: جو لوگ ایمان لے آئے ہیں، کیا ان کے لیے اب بھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کے ذکر کے لیے اور جو حق اترا ہے اس کے لیے پسیج جائیں؟ اور وہ ان لوگوں کی طرح نہ بنیں جن کو پہلے کتاب دی گئی تھی، پھر ان پر ایک لمبی مدت گزر گئی، اور ان کے دل سخت ہو گئے، اور (آج) ان میں سے بہت سے نافرمان ہیں؟

اللہ تعالیٰ یہ فرما رہے ہیں کہ کیا ان لوگوں کے لیے جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی تصدیق

کی اور جنہوں نے ان کی ہدایت کی پیروی کی وہ وقت نہیں آیا کہ اللہ تعالیٰ کے ذکر اور تلاوت قرآن کریم کے دوران ان کے دل نرم ہو جائیں اور وہ سنگدلی میں ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جو ان سے پہلے تھے اہل کتاب میں سے، یہودیوں اور نصرانیوں کی طرح نہ ہو جائیں، جن پر ایک طویل زمانہ گزرا، پھر انہوں نے اللہ کے کلام کو تبدیل کیا، پھر ان کے دل سخت ہو گئے، بہت بڑی تعداد ان کی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے باہر نکل گئی؟

یہ آیت حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان میں نازل ہوئی ہے، کیونکہ یہی وہ لوگ تھے جب اللہ تعالیٰ کا کلام نازل ہوتا تھا، پڑھا جاتا تھا، تلاوت کیا جاتا تھا تو ان کے دلوں میں رقت و نرمی پیدا ہو جاتی تھی، ان کے دل پسیج جاتے تھے، اللہ تعالیٰ کا خوف ان پر طاری ہو جاتا تھا، وہ یہود و نصاریٰ کی مشابہت اختیار کرنے سے خوف زدہ ہوتے تھے، کہ کہیں وہ سخت دل بن جائیں اور اللہ کی اطاعت سے باہر نکل جائیں۔

ابن کثیر رحمہ اللہ لکھتے ہیں پروردگار عالم فرماتا ہے کیا مومنوں کے لئے اب تک وہ وقت نہیں آیا کہ ذکر اللہ وعظ نصیحت آیات قرآنی اور احادیث نبوی سن کر ان کے دل موم ہو جائیں؟ سنیں اور مانیں احکام بجالائیں ممنوعات سے پرہیز کریں۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں قرآن نازل ہوتے ہی تیرہ سال کا عرصہ نہ گذرا تھا کہ مسلمانوں کے دلوں کو اس طرف نہ جھکنے کی دیر کی شکایت کی گئی۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں چار ہی سال گذرے تھے جو ہمیں یہ عتاب ہوا (مسلم) اصحاب رسول پر ملال ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہیں حضرت کچھ بات تو بیان فرمایئے پس یہ آیت اترتی ہے۔

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (یوسف:۳) ایک مرتبہ کچھ دنوں بعد یہی عرض کرتے ہیں تو آیت اترتی ہے۔ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ

فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ (الزمر: ۲۳) پھر ایک عرصہ بعد یہی کہتے ہیں تو یہ آیت (الم یان) اترتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں سب سے پہلے خیر جو میری امت سے اٹھ جائے گی وہ خشوع ہو گا۔ پھر فرمایا تم یہود و نصاریٰ کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کتاب اللہ کو بدل دیا تھوڑے تھوڑے مول پر اسے فروخت کر دیا۔ پس کتاب اللہ کو پس پشت ڈال کر رائے و قیاس کے پیچھے پڑھ گئے اور از خود ایجاد کردہ اقوال کو ماننے لگ گئے اور اللہ کے دین میں دوسروں کی تقلید کرنے لگے۔

اپنے علماء اور درویشوں کی بے سند باتیں دین میں داخل کر لیں، ان بداعمالیوں کی سزا میں اللہ نے ان کے دل سخت کر دیئے، کتنی ہی اللہ کی باتیں کیوں نہ سناؤ ان کے دل نرم نہیں ہوتے، کوئی وعظ و نصیحت ان پر اثر نہیں کرتا، کوئی وعدہ وعید ان کے دل اللہ کی طرف موڑ نہیں سکتا، بلکہ ان میں سے اکثر و بیشتر فاسق اور کھلے بدکار بن گئے، دل کے کھوٹے اور اعمال کے بھی کچے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں ارشاد فرمایا فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً (المآئدہ: ۱۳) ان کی بدعہدی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت نازل کی اور ان کے دل سخت کر دیئے یہ کلمات کو اپنی جگہ سے بدل دیتے ہیں اور ہماری نصیحت کو بھلا دیتے ہیں، یعنی ان کے دل فاسد ہو گئے، اللہ کی باتیں بدلنے لگ گئے، نیکیاں چھوڑ دیں، برائیوں میں منہمک ہو گئے۔

اسی لئے رب العالمین اس امت کو متنبہ کر رہا ہے۔ ہے کہ جان رکھو مردہ زمین کو اللہ زندہ کر دیتا ہے اس میں اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ سخت دلوں کے بعد بھی اللہ انہیں نرم کرنے پر قادر ہے۔ گمراہیوں کی تہہ میں اتر جانے کے بعد بھی اللہ راہ راست پر لاتا ہے جس طرح بارش خشک زمین کو تر کر دیتی ہے، اسی طرح کتاب اللہ مردہ دلوں کو زندہ کر دیتی ہے۔ دلوں میں جبکہ گھٹاٹوپ اندھیرا چھا گیا ہو کتاب اللہ کی روشنی اسے دفعتاً منور کر دیتی ہے، اللہ کی وحی کے قفل کی کنجی ہے۔ سچا ہادی وہی ہے، گمراہی کے بعد راہ پر لانے والا، جو چاہے کرنے والا، حکمت و عدل والا، لطف و خیر والا، کبر و جلال والا، بلندی و علو والا وہی ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

مردہ دل کیسے زندہ ہوتے ہیں؟

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ {۱۷} الحدید

جواب ترجمہ: جان رکھو کہ یقیناً اللہ ہی زمین کو مردہ ہونے کے بعد زندہ کرتا ہے، ہم نے تمہارے لیے نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دیں تاکہ تم عقل سے کام لو۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ: اس آیت میں اللہ تعالیٰ ایک حسی اور مشاہداتی مثال کے ذریعے ایک عظیم روحانی حقیقت سمجھا رہے ہیں، جس طرح بارش کے ذریعے بنجر، سوکھی اور مردہ زمین سرسبز ہو جاتی ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ مردہ دلوں کو ایمان سے، غفلت زدہ روحوں کو نصیحت سے، جمود کو توبہ اور رجوع سے، زندہ فرما دیتا ہے، یہ مثال اس لیے دی گئی ہے تاکہ انسان اللہ کی قدرتِ کاملہ کو پہچانے، یہ یقین پیدا ہو کہ مردوں کو زندہ کرنا اللہ کے لیے بالکل آسان ہے، دل کی سختی اور ناامیدی کو ختم کیا جائے۔

قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ: "ہم نے تمہارے لیے نشانیاں کھول کھول کر بیان کر دی ہیں، یعنی: قرآن کی آیات، کائنات کے مشاہدات، تاریخ کے واقعات سب انسان کو یہی پیغام دیتے ہیں کہ زندگی، موت، ہدایت اور گمراہی سب اللہ کے اختیار میں ہیں۔

لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم عقل سے کام لو۔ یہاں عقل سے مراد محض ذہانت نہیں، بلکہ حق کو پہچاننا، نصیحت قبول کرنا، دل کو نرم کرنا اور عملی تبدیلی لانا یہ آیت بندۂ مومن کو یہ پیغام دیتی ہے کہ: جس رب نے مردہ زمین کو زندہ کر دیا، وہی رب مردہ دلوں کو بھی زندہ کر سکتا ہے، مایوسی کی کوئی گنجائش نہیں، ہدایت کا دروازہ بند نہیں ہوا، لہٰذا دل کو قرآن کی بارش کے لیے کھلا رکھو، کیونکہ زندہ

دل ہی ایمان کی فصل اُگاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں زندہ دل، بیدار عقل اور نصیب ہدایت عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین بحرمۃ النبی الکریم ﷺ۔

صدقہ خیرات کرنے والوں کا اجر وثواب

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ {۱۸} الحدید

جواب ترجمہ: یقیناً صدقہ دینے والے مرد اور صدقہ دینے والی عورتیں اور جنہوں نے اللہ کو اچھا قرض دے رکھا ہے ان کے لیے (ان کا مال) کئی گنا بڑھا دیا جائے گا اور ان کے لیے باعزت اجر ہے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ: یہاں مراد وہ مرد وعورتیں ہیں جو اللہ کی رضا کے لیے صدقہ دیتے ہیں، بعض مفسرین نے اس میں زکوٰۃ اور نفلی صدقات دونوں کو شامل کیا ہے۔ امام نسفی رحمہ اللہ کے مطابق: اَلْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ میں مبالغہ ہے، یعنی وہ لوگ جو کثرت سے صدقہ دیتے ہیں اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں سبقت لے جاتے ہیں۔

وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا: یعنی جو لوگ اللہ کو "قرض حسن" دیتے ہیں، اس سے مراد خالص نیت اور حلال مال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ امام نسفی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ "قرض" لغوی طور پر مال کا ایک حصہ کاٹ کر کسی کو دینا ہے، اور یہاں اللہ کی طرف منسوب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اصل میں اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور اس میں کسی پر احسان جتانے کی گنجائش نہیں۔

يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ: یعنی اللہ تعالیٰ ان کے صدقات اور انفاق کو کئی گنا بڑھا کر واپس کرے گا اور ان کے لیے عزت والا اجر (یعنی جنت) ہے۔ یہاں "یضاعف" میں کثرت اور عظمتِ اجر کی طرف اشارہ ہے، جیسا کہ سورۃ البقرہ میں بھی ہے کہ ایک دانہ سات سو دانے بن جاتا ہے۔

آیت کا سیاق وسباق: مفسرین رحمہم اللہ نے اس آیت کے ربط کے بارے میں لکھا ہے کہ اس سے پہلے کی آیات میں ایمان اور انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی گئی ہے اور بخل سے روکا گیا ہے۔ اس سے پہلے آیت ۱۰ میں انفاق کی فضیلت اور اس کے درجات بیان ہوئے، پھر آیت ۱۱ میں "قرض حسن" کی ترغیب دی گئی، اور اب یہاں اس پر مزید تاکید اور خوشخبری دی گئی ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، ان کے لیے کئی گنا اجر اور عزت والی جزا ہے۔

اس آیت میں مرد و عورت دونوں کو شامل کر کے عمومی ترغیب دی گئی ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اللہ کے ہاں سب کے اعمال محفوظ ہیں اور سب کو ان کے عمل کے مطابق بہترین بدلہ ملے گا۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کرنے والے مرد و عورتوں اور اللہ کی راہ میں خالص نیت سے خرچ کرنے والوں کے لیے کئی گنا اجر اور عزت والی جزا (یعنی جنت) کا وعدہ کیا ہے۔ اس آیت کا ربط یہ ہے کہ اس سے پہلے انفاق کی ترغیب اور اس کے درجات بیان ہوئے، اور یہاں اس پر مزید تاکید اور خوشخبری دی گئی ہے تاکہ لوگ بخل چھوڑ کر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی طرف راغب ہوں۔

اہل ایمان کا مقام اور اہل کفر کا انجام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۚ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ {۱۹} الحدید

جواب ترجمہ: اور جو لوگ اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے وہی لوگ اپنے رب کے نزدیک صدیقین اور شہداء (کا مقام رکھتے) ہیں، ان کے لیے ان کا اجر ہو گا اور ان کا نور ہو گا، اور جنہوں نے انکار کیا اور ہماری نشانیوں کو جھٹلایا وہی لوگ جہنم والے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ: امام قرطبی رحمہ اللہ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ الصِّدِّيقُونَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان میں سچائی اور تصدیق میں کمال رکھتے ہیں، یہ

وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی تصدیق کی۔

وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ: کے بارے میں قرطبی نے مختلف اقوال نقل کیے ہیں: بعض کے نزدیک یہاں "شہداء" سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں شہید ہوئے۔ بعض کے نزدیک مراد وہ لوگ ہیں جو قیامت کے دن امتوں پر گواہی دیں گے۔ بعض مفسرین کے نزدیک "الصِّدِّيقُونَ" اور "الشُّهَدَاءُ" دونوں صفات اہل ایمان کے لیے ہیں، یعنی جو ایمان میں سچے ہیں اور اللہ کے دین کی گواہی دینے والے ہیں۔

لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ: یعنی ان کے لیے اللہ کے ہاں عظیم اجر اور قیامت کے دن نور ہے، جو ان کے آگے اور دائیں طرف چمکے گا۔

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ: یعنی جو لوگ کفر اور تکذیب میں مبتلا رہے، ان کا انجام جہنم ہے اور وہ ہمیشہ اس میں رہیں گے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی دو عظیم صفات بیان کی ہیں: وہ ایمان میں سچے اور تصدیق میں کامل ہیں (صِدِّیق) وہ دین کی گواہی دینے والے یا اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے ہیں (شہداء) ان کے لیے اللہ کے ہاں اجر اور نور ہے، جبکہ کافروں کے لیے جہنم ہے۔ یہی مفہوم دیگر معتبر تفاسیر میں بھی بیان ہوا ہے کہ "الصِّدِّيقُونَ" سے مراد ایمان میں سچائی اور "الشُّهَدَاءُ" سے مراد یا تو شہید یا گواہی دینے والے ہیں، اور دونوں صفات اہل ایمان کے لیے ہیں۔

حیات دنیا کھیل، تماشا اور زینت

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ

وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ {۲۰}الحدید.

جواب ترجمہ: خوب سمجھ لو کہ اس دنیاوالی زندگی کی حقیقت بس یہ ہے کہ وہ نام ہے کھیل کود کا، ظاہری سجاوٹ کا، تمہارے ایک دوسرے پر فخر جتانے کا، اور مال اور اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کرنے کا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بارش جس سے اگنے والی چیزیں کسانوں کو بہت اچھی لگتی ہیں، پھر وہ اپنازور دکھاتی ہیں، پھر تم اس کو دیکھتے ہو کہ زرد پڑ گئی ہے، پھر وہ چوراچورا ہو جاتی ہے۔ اور آخرت میں (ایک تو) سخت عذاب ہے، اور (دوسرے) اللہ کی طرف سے بخشش ہے، اور خوشنودی، اودنیاوالی زندگی دھوکے کے سامان کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اے انسانو! دنیا کی زندگانی کھیل تماشا ہے، انسانی جسم متاع دنیا کے ساتھ کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں، جب کہ انسانی دل غفلت کا شکار ہو جاتے ہیں، دنیوی زندگی زیب وزینت کا سامان ہے جس سے انسانی اجسام خوبصورت بنائے جاتے ہیں، دنیوی زندگی ایسا سازوسامان ہے جس پر انسان باہم یک دگر فخر ومباہات کرتے ہیں۔

دنیوی زندگی ایسی ہے کہ انسان اس میں اپنے اموال کی کثرت کو گنتا رہتا ہے، اپنی اولاد کی کثرت کو شمار کرتا رہتا ہے، مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ دنیوی زندگانی کی مثال بارش کی طرح ہے، جس کے باعث اگنے والی بوٹیاں اور کھیتیاں زراع اور کسانوں کو خوش کر دیتی ہیں، تعجب میں ڈال دیتی ہیں، پھر یہ کھیتیاں اور بوٹیاں تیار ہو کر خشک ہو جاتی ہیں، پھر ان کی سرسبزی وشادابی کے بعد انسان اپنی کھلی آنکھوں سے ملاحظہ کرتا ہے کہ وہ پیلی ہو جاتی ہیں، پھر وہ چوراچورا ہو جاتی ہیں۔

دنیا میں سازوسامان زندگی کام نہیں آیا اور نہ ہی آخرت میں یہ کام آیا، وہاں تو کفار کو سخت ترین عذاب سے دوچار کیا جائے گا، آخرت میں کامرانی اور شادکامی اہل ایمان کے نصیب میں آئے گی، اللہ کی رضا اور خوشنودی کا پروانہ انہیں ملے گا، اس لیے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آخرت کو فراموش

کر کے دنیا کی زندگی کو اپنانے والے کھلے دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔

امام تفسیر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غیث کہتے ہیں اس بارش کو جو لوگوں کی ناامیدی کے بعد برسے۔ جیسے فرمان ہے وَهُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ الْغَيْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَيَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيْدُ (الشوری:۲۸) اللہ وہ ہے جو لوگوں کی ناامیدی کے بعد بارش برساتا ہے۔ پس جس طرح بارش کی وجہ سے زمین سے کھیتیاں پیدا ہوتی ہیں اور وہ لہلہاتی ہوئی کسان کی آنکھوں کو بھی بھلی معلوم ہوتی ہیں، اسی طرح اہل دنیا اسباب دنیوی پر پھولتے ہیں، لیکن نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہی ہری بھری کھیتی خشک ہو کر زرد پڑ جاتی ہے پھر آخر سوکھ کر ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔

ٹھیک اسی طرح دنیا کی تر و تازگی اور یہاں کی بہبودی اور ترقی بھی خاک میں مل جانے والی ہے، دنیا کی بھی یہی صورتیں ہوتی ہیں کہ ایک وقت جوان ہے پھر ادھیڑ ہے پھر بڑھیا ہے، ٹھیک اسی طرح خود انسان کی حالت ہے اس کے بچپن جوانی ادھیڑ عمر اور بڑھاپے کو دیکھتے جایئے پھر اس کی موت اور فنا کو سامنے رکھیے، کہاں جوانی کے وقت اس کا جوش و خروش زور طاقت اور کس بل؟ اور کہاں بڑھاپے کی کمزوری جھریاں پڑا ہوا جسم خمیدہ کمر اور بے طاقت ہڈیاں؟ جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ، اللہ وہ ہے جس نے تمہیں کمزوری کی حالت میں پیدا کیا پھر اس کمزوری کے بعد قوت دی پھر اس وقت کے بعد کمزوری اور بڑھاپا کر دیا وہ جو چاہے پیدا کرتا ہے اور وہ عالم اور قادر ہے۔

اس مثال سے دنیا کی فنا اور اس کا زوال ظاہر کر کے پھر آخرت کے دونوں منظر دکھا کر ایک سے ڈراتا ہے اور دوسرے کی رغبت دلاتا ہے، پس فرماتا ہے عنقریب آنے والی قیامت اپنے ساتھ عذاب اور سزا کو لائے گی اور مغفرت اور رضامندی رب کو لائے گی، پس تم وہ کام کرو کہ ناراضگی سے بچ جاؤ اور رضا حاصل کر لو سزاؤں سے بچ جاؤ اور بخشش کے حقدار بن جاؤ۔

دنیا صرف دھوکے کا گھر ہی نہیں ہے بلکہ اس کی طرف جھکنے والے پر آخر وہ وقت آجاتا ہے کہ یہ یہ اس کے سوا کسی اور چیز کا خیال ہی نہیں کرتا، اسی کی دھن میں روز و شب مشغول رہتا ہے بلکہ اس کی

والی اور زوال والی کمینی دنیا کو آخرت پر ترجیح دینے لگتا ہے، شدہ شدہ یہاں تک نوبت پہنچ جاتی ہے کہ بسا اوقات آخرت کا منکر بن جاتا ہے۔ حضرت نبی کریم ﷺ ارشاد فرماتے ہیں ایک کوڑے برابر جنت کی جگہ ساری دنیا اور اس کی تمام چیزوں سے بہتر ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

شیخ عبدالکریم بن ہوازن قشیری رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں اَلْحَيَاةُ الدُّنْيَا مُعَرَّضَةٌ لِلزَّوَالِ، غَيْرُ لَابِثَةٍ وَلَا مَاكِثَةٍ، وَهِيَ فِي الْحَالِ شَاغِلَةٌ عَنِ اللهِ، مُطْمِعَةٌ غَيْرُ مُشْبِعَةٍ، وَتَجْرِي عَلَى غَيْرِ سُنَنِ الِاسْتِقَامَةِ كَجَرَيَانِ لَعِبِ الصِّبْيَانِ، فَهِيَ تُلْهِي عَنِ الصَّوَابِ وَاسْتِبْصَارِ الْحَقِّ، وَهِيَ تَفَاخُرٌ وَتَكَاثُرٌ فِي الْأَمْوَالِ وَالْأَوْلَادِ.

دنیوی زندگانی زوال پذیر ہونے والی ہے، اسے ٹھہراؤ نہیں ملنے والا، فی الحال دنیوی زندگانی اللہ تعالیٰ سے بے خبر کرنے والی ہے، طمع اور لالچ دلانے والی ہے، سیر ابی دلانے والی نہیں ہے، استقامت اور ٹھہراؤ کے طریقوں کے خلاف چل رہی ہے، جیسے بچوں کے کھیل تماشے ہوتے ہیں، درست راہوں سے غافل کرتی ہے، حق دیکھنے سے غافل کرتی ہے، دنیوی زندگانی باہمی فخر ومباہات، مال واولاد کی کثرت پر غرور کرنے کا نام ہے۔

حافظ ابن جوزی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرات مفسرین کرام رحمہم اللہ اس طرف گئے ہیں کہ اس کا مشار الیہ کافروں کی دنیوی حالت ہے، کیونکہ کافروں کی زندگی لہوولعب میں، دنیوی زندگانی کو خوبصورت بنانے میں، باہمی تفاخر ومباہات میں گزرتی ہے، جس سے وہ اپنے معاصرین اور پڑوسیوں میں فخر ومباہات کرتے ہیں، مال واولاد کی کثرت پر اتراتے ہیں، اولاد ومال کی کثرت کی وجہ سے ہی وہ اللہ کے ولیوں پر دست طعن وتشنیع دراز کرتے ہیں، اپنے خدم وحشم، اپنی اولاد کے باعث ہی اولیاء اللہ کو ستاتے ہیں، یونہی ان کی عمر تمام ہوجاتی ہے، انہی چیزوں میں مشغول رہتے ہیں، انہیں آخرت کے عمل کی طرف توجہ ہی نہیں رہتی۔ (زادالمسیر)

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں أَنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ، قَالَ: الدُّنْيَا نَفْسٌ نَائِمَةٌ، وَالْآخِرَةُ نَفْسٌ يَقْظَانَةٌ. قِيلَ: فَمَا النَّجَاةُ مِنْهَا؟ قَالَ: أَصْلُ ذٰلِكَ الْعِلْمُ، ثُمَّ ثَمَرَتُهُ مُخَالَفَةُ الْهَوَى فِي اجْتِنَابِ الْمَنَاهِي، ثُمَّ مُكَابَدَةُ النَّفْسِ عَلَى أَدَاءِ الْأَوَامِرِ عَلَى الطَّهَارَةِ مِنَ الْأَدْنَاسِ، فَيُورِثُ السُّهُولَةَ فِي التَّعَبُّدِ، وَالْحُلُولَ بَعْدَهُ فِي مَقَامَاتِ الْعَابِدِينَ، ثُمَّ يُذِيقُهُ اللهُ مَا أَذَاقَ أَوْلِيَاءَهُ وَأَصْفِيَاءَهُ، وَهِيَ دَرَجَةُ الْمَذَاقِ. اللہ تعالیٰ کا فرمان عالی شان ہے، دنیا کی زندگانی ایک کھیل اور تماشہ ہے، فرمایا، دنیا سونے والی جان کی طرح ہے، جب کہ آخرت ایک جاگنے والی جان کی طرح ہے، پوچھا گیا کہ پھر اس سے نجات اور خلاصی کی کیا صورت ہو گی؟ فرمایا کہ اس میں اصل چیز علم ہے، پھر اس کا ثمرہ اور پھل منہیات سے بچنا اور نفسانی خواہشات کی مخالفت کرنا ہے، پھر اللہ کے احکامات کی ادائیگی میں نفس کے مکر و فریب سے ہوشیار رہنا ہے، میل کچیل سے پاکیزگی حاصل کر کے اوامر ادا کیے جائیں، یہ چیزیں عبادت کرنے میں سہولت مہیا کرتی ہیں، اس کے بعد عابدین کے مقامات تک اتارتی ہیں، پھر اس کے بعد اللہ تعالیٰ اسے وہ ذوق عبادت چکھاتے ہیں جو وہ اپنے ولیوں، اپنے چنے ہوئے لوگوں کو چکھاتے ہیں، اسی کو درجہ مذاق کہا جاتا ہے۔

حضرت سہل بن عبد اللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ نقل فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سخت گرمی کے دن ایک روز جنگل میں سخت پیاس نے ستایا، اچانک آپ کی نگاہ ایک حبشی پر پڑ گئی جو اونٹ چرا رہا تھا، آپ علیہ السلام نے اس سے پوچھا کہ کیا تیرے پاس پانی ہے؟ اس نے کہا، اے ابراہیم! پانی یا میں سے آپ کو کون سی چیز زیادہ محبوب ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ پانی، چنانچہ اس حبشی نے اپنا پاؤں ایک چٹان پر مارا، جس سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا، اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بڑا تعجب ہوا، اس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی کی کہ اے ابراہیم! اگر یہ شخص مجھ سے کہتا کہ میں زمین و آسمان کو اپنی جگہ سے ہٹا دوں تو ہٹا دیتا، ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے رب! وہ کیوں؟

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اس لیے کہ اس شخص کا مطلوب دنیا اور آخرت میں میں ہی ہوں۔ (تفسیر تستری)

شیخ ابو اللیث نصر بن محمد سمرقندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آیت میں لعب کا مطلب ہے باطل، لہو کا مطلب ہے سرور جس میں وہ مشغول ہیں، زینت سے مراد زینت دنیا ہے، تفاخر کا مطلب ہے حسب کا باہمی تفاخر، مال واولاد میں تکاثر کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں پر وہ فخر کرتے ہیں۔

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں مَا لِي وَلِلدُّنْيَا، إِنَّمَا مَثَلِي وَمَثَلُ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رَاكِبٍ قَامَ فِي ظِلِّ شَجَرَةٍ فِي يَوْمٍ صَائِفٍ، ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا (تفسیر تستری) مجھے دنیا سے کیا غرض، میری اور دنیا کی مثال ایک سوار کی سی ہے، جو کسی درخت کے سایہ میں گرمی والے دن ٹھہرتا ہے پھر چل پڑتا ہے اور سایہ کو چھوڑ دیتا ہے۔ (بحر العلوم سمرقندی)

پھر دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری کی ایک اور مثال بیان کی گئی ہے، کہ دنیا بارش کی طرح ہے، جو آسمان سے اترتی ہے، اس کے ذریعے کھیت لہلہاتے ہیں اور جڑی بوٹیاں اگ آتی ہیں، اس سبزے اور ہریالی کو دیکھ کر کسان خوش ہوتے ہیں۔

یہاں آیت میں زراع کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، اس کا ایک مطلب تو زراعت کرنے والے، کھیتی باڑی کرنے والے، جن کو کسان کہا جاتا ہے، دوسرا معنیٰ یہ بیان کیا گیا کہ اس زراع سے مراد کفار ہیں، کفار زراع سے کنایہ ہے، اس لیے کہ کفر لغت میں چھپانے کو کہتے ہیں، کافر کو کافر بھی اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ حق کو باطل کے پردے میں چھپا دیتا ہے۔

زراع (کسان) کو کفار اس لیے کہا گیا کہ وہ دانے کو زمین کے نیچے چھپاتے ہیں، اس وقت اس سے مراد وہ کفر نہیں ہوگا جو ایمان کی ضد ہے، اگر اس زراع سے مراد کفار لیا جائے تو وہ زیادہ مناسب ہے اس لیے کہ ان کا میلان دنیا کی طرف بہت ہوتا ہے۔

پھر کھیتی پک کر تیار ہو جاتی ہے، سبزہ پیلا ہو جاتا ہے، پھر پیلا ہونے کے بعد خشک ہو جاتا ہے، خشکی کے بعد چورا چورا ہو جاتا ہے، پھر ہوا کے دوش پر اڑتا پھرتا ہے، کچھ عرصہ بعد کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا،

یونہی دنیا باقی نہیں رہتی، جس طرح یہ سبزے اور کھیتاں باقی نہیں رہتیں۔

آخرت میں سخت عذاب ان لوگوں کو ہو گا جو دنیا کی زندگانی پر فخر و غرور کیا کرتے تھے، آخرت کے مقابلے میں دنیا کو ترجیح دیتے اور اسے پسند کرتے تھے، اور اللہ کی مغفرت اور بخشش کے حق دار وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے دنیا کو چھوڑا ہوا تھا، اور انہوں نے دنیا کے مقابلے میں آخرت کو پسند کیا ہوا تھا، آخرت کو ترجیح دے رکھی تھی، یہ بھی کہا گیا ہے کہ عذاب شدید اللہ کے دشمنوں کو ہو گا، اور مغفرت اور بخشش اللہ کے ولیوں کی ہو گی۔ متاع الغرور کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح انسان شیشے کی چیزیں بناتا ہے، ملمع سازی کرتا ہے جو بہت ہی جلد فنا کے گھاٹ اتر جاتی ہیں، ختم ہو جاتی ہیں، اسی طرح یہ دنیا کی زندگانی فانی ہے، جو جلد ختم ہو جائے گی۔ (تفسیر بحر العلوم سمرقندی)

اللہ تعالیٰ نے دنیا کی زندگانی کی جو مذمت فرمائی ہے وہ اپنی جگہ سو فیصد درست اور صحیح ہے، اس میں حکمت پوشیدہ ہے، اس لیے کہ رب تعالیٰ نے سورۃ البقرہ میں انسان کو اپنا خلیفہ فی الارض بنانے کا ذکر فرمایا ہے، پھر اس کے ساتھ فرشتوں کو یہ اطلاع دی کہ جو کچھ میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے، اگر حیات دنیویہ کی کوئی حکمت اللہ کے ہاں نہ ہوتی تو اللہ کبھی ایسا نہ فرماتے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے زندگی اور موت کو انسانی آزمائش کے لیے پیدا فرمایا، اگر اللہ تعالیٰ کی اس میں کوئی حکمت نہ ہوتی تو اللہ ایسا نہ کرتے، کیونکہ وہ فعل عبث یعنی بے کار کام نہیں کرتے، جیسے اللہ نے واضح فرمایا کہ کیا تم خیال کرتے ہو کہ ہم نے تمہیں بے کار پیدا کیا ہے؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ ہم نے آسمان و زمین کی پیدائش، ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے اس کی پیدائش میں کوئی بے کار کام نہیں کیا۔

پھر یہ بات بھی ذہن نشین کر لینے کی ہے کہ حیات اللہ کی طرف سے عطا کی گئی ایک نعمت ہے، بلکہ حیات ہی تمام نعمتوں کی اصل اور بنیاد ہے، اور چیزوں کی حقیقتیں دنیا ہو یا آخرت ہو تبدیل نہیں ہوتیں، پھر یہ بات بھی ذہن نشین رہے کہ اللہ تعالیٰ نے حیاتی کی تخلیق کو بہت بڑا احسان قرار دیا ہے،

جیسے سورۃ البقرہ میں ہے کہ تم اللہ کا انکار کیسے کر سکتے ہو، یا کرتے ہو کہ اس نے تمہیں عدم سے وجود بخشا، تم کچھ نہیں تھے اس نے تمہیں زندہ کیا، تو نعمتوں کی قسموں میں سب سے پہلے جس کا ذکر ہے وہ زندگی ہے۔

یہ سارے دلائل پیش نظر رکھتے ہوئے اندازہ لگانا بہت آسان ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطلق حیات دنیویہ کی مذمت نہیں فرمائی گئی، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ جس شخص نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت، فرمانبرداری اور اطاعت شعاری کی بجائے شیطان کی اطاعت، فرمانبرداری اور اطاعت کی، خواہشات نفسانیہ کا غلام بنا، یہ قابل مذمت فعل ہے، اس کی یہاں حیات دنیویہ کہہ کر مذمت کی جارہی ہے۔

پھر قرآنی اسلوب نگارش پر غائر نظر ڈالی جائے کہ اللہ نے یہاں لعب کا لفظ استعمال فرمایا ہے، لعب (کھیل) یہ بچوں کا فعل ہے، جو کھیل کی خاطر اپنے آپ کو بہت ہی کھپاتے اور بہت ہی مشقت میں ڈالتے ہیں، اپنے کو کھیل میں تھکا دیتے ہیں مگر بغیر کسی مقصد اور فائدے کے کھیل ختم کر دیتے ہیں، اس کے بعد لھو کا لفظ استعمال فرمایا، لھو یہ جوانوں کا فعل ہے، زیادہ تر جوان لھو سے فارغ ہوتے ہیں تو ان کے ہاتھ میں افسوس اور حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ ایک عاقل، دانا اور سمجھدار آدمی لھو کے خاتمے کے بعد اپنا مال برباد ہوتے دیکھتا ہے، اپنی عمر کو ضائع ہوتے دیکھتا ہے، کیونکہ لذت تو ختم ہونے والی چیز ہے، جب کہ دل کا شوق اور پیاس اس لذت کے خاتمے کے بعد مزید لذت کا تقاضا کرتا ہے، جب کہ لذت جا چکی ہوتی ہے۔ یوں اس کا نقصان یکجا ہو جاتا ہے اور پے در پے ہوتا ہے۔

تیسری چیز اللہ تعالیٰ نے یہاں زینت کا لفظ استعمال فرمایا ہے، زیب وزینت، بناؤ سنگھار یہ عورتوں کی پسندیدہ عادات میں سے ہے، اس لیے کہ زینت سے مقصود قبیح کو خوبصورت بنانا ہوتا ہے۔

بلند وبالا، فلک شگاف عمارتیں اس لیے تعمیر کرنا کہ وہ خرابی اور بربادی کی نذر ہو جائیں، نکمی اور ناقص چیزوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی کاوشیں بروئے کار لانا، باوجود یکہ عرضی ذاتی کو نہیں ہٹا سکتی، پھر جب دنیا اپنی ذات کے لحاظ سے ختم ہونے والی ہے، اپنی ذات کے لحاظ سے خراب ہے تو پھر ایک

عاقل، دانا اور بینا شخص ان مفاسد اور خرابیوں کو دور کرنے کے لیے یہاں کیسے ڈیرے ڈال سکتا ہے۔

حضرت سیدنا ابن عباس رضی اللہ عنہما نے تو واضح فرمایا تھا کہ "کافر ساری زندگی دنیا کی زیب وزینت کی تلاش میں دنیا میں مشغول رہتا ہے، آخرت کے لیے کوئی کام نہیں کرتا" اسی لیے تو ان غلامان دنیا، شائقین دنیا، محبین دنیا سے کہا گیا کہ حَيَاتُكَ يَا مَغْرُورُ سَهْوٌ وَّغَفْلَةٌ، اے مغرور! اے دھوکے میں مبتلا! تیری حیاتی سہو اور غفلت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

پھر اللہ تعالیٰ نے تفاخر کا لفظ استعمال فرمایا ہے، تفاخر کا معنیٰ اور مفہوم یہ ہے کہ باہمی فخر وغرور کرنا، ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کا اظہار کرنا، یہ تفاخر یا تو نسبی لحاظ سے ہوتا ہے، کوئی خاندانی اعتبار سے برگزیدہ ہے، برتر ہے تو نیچ اور دوسرے کم حیثیت والے خاندانوں پر اپنی برتری دکھانا اور فخر کرنا، یا پھر قدرت، قوت، طاقت اور لشکروں کی وجہ سے تفاخر کا اظہار کرنا، حالانکہ اس ساری شان وشوکت نے ایک دن ختم ہو جانا ہے، پھر تفاخر کا کیا مطلب؟

پھر اللہ تعالیٰ نے تکاثر فی الاموال اور تکاثر فی الاولاد کا لفظ استعمال فرمایا ہے، کسی کے پاس بہت زیادہ مال ودولت ہے تو وہ دوسروں پر اس مال ودولت کے باعث رعب ودبدبہ جماتا ہے، اپنے کو برتر ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسی طرح کسی کو اولاد زیادہ دے دی گئی تو وہ اس پر گھمنڈ کرتا ہے، غرور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کی مذمت فرمائی ہے۔

حضرت سیدنا عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ يَجْمَعُ الْمَالَ فِي سَخَطِ اللهِ، وَيَتَبَاهَى بِهِ عَلَى أَوْلِيَاءِ اللهِ وَيَصْرِفُهُ فِي مَسَاخِطِ اللهِ. فَهُوَ ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں مال جمع کرتا ہے، اللہ کے ولیوں پر اس مال کی بدولت فخر ومباہات کا اظہار کرتا ہے، اس مال کو اللہ کی ناراضگی والے لوگوں پر اڑاتا ہے، یہی وہ اندھیرے ہیں جو ایک دوسرے پر فوقیت لیے ہوئے ہیں۔

بس ان فخر ومباہات والی عارضی اور فانی چیزوں سے بچ کر جان چھڑا کر انسان کو کوشش یہ کرنا چاہیے کہ وہ اپنے اللہ کو راضی کرنے کی کوشش کرے، وہ دنیا کی جھمیلوں میں گم ہو کر آخرت کو

فراموش نہ کر دے، اسے دنیوی مکانات کی ٹھاٹھ باٹھ کی بجائے آخرت کے ابدی گھر کی فکر کرنا چاہیے۔

مغفرت وجنت کی طرف دوڑ

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ {۲۱} الحدید

جواب ترجمہ: ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرو اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف اور اس جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کی چوڑائی جیسی ہے، یہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے ہیں، یہ اللہ کا فضل ہے جو وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

اس آیت میں اہلِ ایمان کو نیکیوں میں سبقت کی ترغیب دی گئی ہے، اور جنت کی وسعت کو آسمان وزمین کی وسعت کے برابر قرار دے کر اس کی عظمت اور فراخی کو بیان کیا گیا ہے۔ جنت کی لمبائی لازماً اس کی چوڑائی سے زیادہ ہوگی۔ جنت اس وقت بھی موجود ہے اور یہ اللہ کے فضل سے ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ جنت کا حصول محض اعمال پر واجب نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے ہے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ: اہلِ تفسیر نے یہاں "سابقوا" سے مراد یہ لیا ہے کہ اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ نیکیوں، توبہ اور اعمالِ صالحہ میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کریں، تاکہ اللہ کی مغفرت اور جنت حاصل ہو۔ امام بیضاوی لکھتے ہیں: سَابِقُوا سَارِعُوا مُسَارَعَةَ الْمُسَابِقِينَ فِي الْمِضْمَارِ إِلَى مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُم إِلَى مُوجِبَاتِهَا یعنی نیکیوں میں اس طرح دوڑو

جیسے گھڑ دوڑ میں لوگ سبقت لے جاتے ہیں۔

وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: آیت میں جنت کی "عرض" (چوڑائی) کو آسمان و زمین کی چوڑائی کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ امام نسفی، طبری، قاسمی، صابونی اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں "عرض" سے مراد جنت کی وسعت اور فراخی ہے۔ امام قاسمی لکھتے ہیں: تخصیصِ عرض سے مراد یہ ہے کہ جنت کی وسعت اتنی ہے کہ اس کا عرض آسمان و زمین کے برابر ہے، اور جب عرض اتنا وسیع ہے تو اس کی لمبائی لازماً اس سے زیادہ ہو گی۔

بعض مفسرین نے کہا کہ "عرض" یہاں مجازاً استعمال ہوا ہے، یعنی جنت کی وسعت کو بیان کرنے کے لیے، جیسے عرب کہتے ہیں **بلاد عریضة** یعنی وسیع علاقے۔ امام بیضاوی اور صابونی نے بھی یہی کہا کہ اگر عرض اتنا ہے تو طول اس سے کہیں زیادہ ہو گا۔ امام نسفی نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول نقل کیا: "تمام آسمان و زمین کو اگر ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا جائے تو جنت کی چوڑائی اتنی ہے۔

اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: آیت میں "اُعِدَّتْ" (تیار کی گئی) کے لفظ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جنت اس وقت بھی موجود اور مخلوق ہے، جیسا کہ امام قشیری، نسفی اور دیگر مفسرین نے واضح کیا۔ آیت میں وضاحت ہے کہ جنت ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔ یعنی ایمان ہی جنت کے حصول کی اصل شرط ہے۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ: آیت کے آخر میں **ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ** سے واضح ہوتا ہے کہ جنت اللہ کا فضل ہے، محض اعمال پر واجب نہیں، بلکہ اللہ جسے چاہے اپنے فضل سے عطا کرے۔

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ: یہ اعلان ہے کہ جنت کی وسعت، مغفرت کی فراوانی، اور درجات کا تفاوت سب اللہ کے بے پایاں فضل سے ہے، اور یہی فضل بندوں کو امید، عاجزی اور محنت پر قائم رکھتا ہے۔

نوشتہ تقدیر ٹل نہیں سکتا

سوال بہت سے لوگ مصائب، مشکلات، آلام وحادثات آنے پر سخت جزع فزع، واویلا، چیخ وپکار کرتے ہیں، ثابت قدمی کا مظاہرہ نہیں کرتے، جب ان لوگوں کو کوئی خیر کثیر یا خوشی کی خبر ملتی ہے تو اس پر بہت زیادہ فرحت وسرور کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں، غم وخوشی کے موقع پر یہ لوگ ذرا نہیں سوچتے کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے، ان آیات کی روشنی میں بیان ترجمہ وتفسیر کیجیے۔

مَآ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ فِى الۡاَرۡضِ وَلَا فِىۡۤ اَنۡفُسِكُمۡ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مِّنۡ قَبۡلِ اَنۡ نَّبۡرَاَهَا ؕ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيۡرٌ ۚ﴿۲۲﴾ لِّكَيۡلَا تَاۡسَوۡا عَلٰى مَا فَاتَكُمۡ وَلَا تَفۡرَحُوۡا بِمَآ اٰتٰىكُمۡ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخۡتَالٍ فَخُوۡرِ ۙ﴿۲۳﴾ الحدید.

جواب ترجمہ: کوئی مصیبت ایسی نہیں ہے جو زمین میں نازل ہوتی یا تمہاری جانوں کو لاحق ہوتی ہو، مگر وہ ایک کتاب میں اس وقت سے درج ہے جب ہم نے ان جانوں کو پیدا بھی نہیں کیا تھا، یقین جانو یہ بات اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ اس لیے تاکہ جو چیز تم سے جاتی رہے، اس پر تم غم میں نہ پڑو، اور جو چیز اللہ تمہیں عطا فرمادے، اس پر تم اتراؤ نہیں، اور اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اتراہٹ میں مبتلا ہو، شیخی بگھارنے والا ہو۔

اس کائنات میں جو واقعہ بھی پیش آتا ہے، وہ اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ اللہ نے پہلے سے قلم بند کرلیا ہے۔ اور اس کائنات کے منصوبے اور نقشے میں متعین اور محسوب ہے۔ اس میں محض بخت واتفاق کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس پوری کائنات کی تخلیق سے بھی پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل اور شامل علم کے ذریعے ایسا کرلیا ہے۔ اور بہت ہی تفصیل کے ساتھ سب کچھ قلم بند کردیا ہے، یہ اللہ کے علم میں تھا۔

اللہ کے علم میں کوئی ماضی حال اور مستقبل نہیں ہے۔ یہ زمان و مکان کے فاصلے اور حدیں اللہ کے علم پر حاوی نہیں ہیں، یہ تو ہم اپنے محدود علم کے ذریعے ان چیزوں کو اس طرح زمان و مکان کی قید میں دیکھتے ہیں۔ ہم تو ان حدود و قیود کے بغیر نہیں دیکھ سکتے۔ پھر ہم حقیقت مطلقہ کا ادراک ہی نہیں کر سکتے، ہاں بعض اوقات انسانوں کی قوت مدرکہ کو ایک ایسی چمک حاصل ہو جاتی ہے جس وقت ہماری روح حقیقت مطلقہ سے جڑ جائے۔

ہم اشیاء کی حقیقت کو اس عادی طریقے سے جان سکتے ہیں یعنی بذریعہ حواس، رہا اللہ تعالیٰ جو حقیقت مطلقہ ہے اور وہ اس کائنات کی ہر چیز کو بلا حدود و قیود جانتا ہے۔ یہ کائنات اور اس کے اندر واقعات اپنے آغاز سے انتہا تک اللہ کے علم میں ہیں۔ یہ علم مطلق ہے اور بلا حدود و قیود ہے۔ اور اللہ کے نقشے میں ہر ایک چیز اور واقعہ کا ایک مقام ہے جو اللہ کے علم میں ہے، لہٰذا ہر واقعہ جسے انسان خیر سمجھتا ہے یا شر سمجھتا ہے، زمین پر وہ واقع ہوتا ہے۔ اور انسانوں کی زندگیوں میں وہ پیش آتا ہے یہ اللہ کی کتاب میں ثبت ہے۔ إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيرٌ (۲۲ الحدید) یسا کرنا اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔

اس کا فائدہ کیا ہے؟ اس حقیقت کا فائدہ یہ ہے کہ ایک انسان جسے اس دنیا کے واقعات پر خوشی بھی ہوتی ہے اور پریشانی بھی ہوتی ہے وہ اسے منجانب اللہ سمجھیں اور اس دنیا میں سکون اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اگر کوئی ناگوار چیزیں دیکھیں تو حسرتوں سے اپنے آپ کو فنا نہ کر دیں اور اگر کوئی فرحت بخش واقعات دیکھیں تو آپے سے باہر نہ ہو جائیں اور جس طرح حقیقت ہے یہ سمجھیں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے۔ (تفسیر فی ظلال القرآن)

اس آیت کی تفسیر میں علماء مفسرین کے چار قول ہیں پہلا قول تو یہ ہے کہ جو جانی یا مالی کوئی آفت یا مصیبت لوگوں پر دنیا میں آتی ہے اس مصیبت کے پیدا کرنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت کے پہنچنے کا سارا حال لوح محفوظ میں لکھ لیا ہے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ جن لوگوں پر وہ مصیبت اور آفت آتی ہے ان کے پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت کا حال لوح محفوظ میں لکھ لیا ہے۔

تیسرا قول یہ ہے کہ زمین کے پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اس مصیبت کا حال لوح محفوظ میں لکھ لیا ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ اس مصیبت کے اور مصیبت والوں کے اور تمام دنیا کے پیدا کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے ان مصیبتوں کا حال لوح محفوظ میں لکھا ہے۔

بعض مفسروں نے لکھا ہے کہ یہ آخری قول سب قولوں سے اچھا ہے۔ یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ صحیح مسلم میں حضرت عبد اللہ بن عمرو کی حدیث کا مضمون یہ ہے کہ زمین و آسمان کے پیدا کرنے سے پچاس ہزار برس پہلے اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کا حال لوح محفوظ میں لکھ لیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سب سے آخری قول جو اوپر بیان کیا گیا ہے وہی قول اس صحیح حدیث کے مضمون کے موافق ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ ایسا آدمی تو دنیا میں کوئی نہیں ہے کہ راحت سے کسی قدر خوشی اور مصیبت سے کسی قدر رنج اس کے دل پر نہ ہوتا ہو اس لئے مطلب آیت کا یہ ہے کہ رنج اور مصیبت کے وقت بالکل بے صبر ہو جانا اور راحت کے وقت اترانا نہیں چاہئے بلکہ یہ سمجھنا چاہئے کہ ہر طرح کا رنج اور ہر طرح کی راحت تقدیر الٰہی کے موافق ہے۔ بندہ کی بے صبری اور بندہ کا اترانا بے فائدہ ہے اس لئے اللہ تعالیٰ نے یہاں اترانے والوں کی مذمت فرمائی ہے۔ (احسن التفاسیر)

یہاں اللہ تعالیٰ نے تقدیر کا مسئلہ بیان فرمایا ہے، مسئلہ تقدیر کی حکمت بھی اللہ تعالیٰ نے خود ہی بیان فرمادی لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ ۔ تقدیر الٰہی پر جن لوگوں کا عقیدہ مضبوط ہے انہیں بتایا جارہا ہے کہ اگر تمہارا کوئی مقصد فوت ہو جائے، کوئی ناگہانی پریشانی، مصیبت، الم، رنج و غم تم پر ٹوٹ پڑا ہے تو اس پر زیادہ افسوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے کہ یہ سب کچھ تمہارے لیے تمہاری تقدیر میں تمہارے خالق نے لکھ دیا تھا۔

اسی طرح اگر کسی کو کوئی مقصد ہاتھ آجائے، کامیابی مل جائے، کامرانی اور شادکامی قدم چوم لے تو اس پر اتنا خوش ہونا کہ انسان تکبر اور غرور تک پہنچ جائے یہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اس خوشی اور فرحت کے حصول میں انسان کا اپنا کوئی کمال نہیں ہے بلکہ یہ تو انسان کے خالق نے اس کی تقدیر میں یونہی لکھا ہوا تھا۔

حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جو شخص دنیا کے تمام واقعات و حالات کا خالق اور مالک اللہ تعالیٰ کو جانتے ہیں اور ان کا عقیدہ یہ ہے کہ جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے وہ تقدیر الٰہی سے ہوتا ہے اور اس کا واقع ہونا ناگزیر ہے۔ کسی کی طاقت اس کو روک نہیں سکتی وہ عیش و مصیبت اور راحت و تکلیف کی دونوں حالتوں میں اعتدال پر رہتا ہے۔

اس کی واضح مثال یہ کہ دو شخص ہوں ایک قائل تقدیر دوسرا منکر تقدیر اور دونوں کے دو لڑکے ہوں اور دونوں اکلوتے ہوں اور وہ دونوں ایک ہی وقت ایک ہی مرض میں مبتلا ہو جاویں اور علاج معالجہ کے باوجود دونوں مر جاویں۔ پھر دونوں کے متعلق یہ ثابت ہو جاوے کہ علاج میں غلطی ہو گئی تو اب دونوں کا حال دیکھیے منکر تقدیر کو عمر بھر اضطراب اور بے چینی رہے گی کبھی قرار نہ آئے گا اور قائل تقدیر کو اس طرح کا اضطراب نہیں ہو گا کیونکہ وہ سمجھے گا کہ یہ معالج کی غلطی بھی مقدر ہی تھی جس کا واقع ہونا ضروری تھا۔

دنیا کو اللہ تعالیٰ نے عالم اسباب بنایا ہے جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے پردوں سے اس کا ظہور ہوتا ہے حقیقت ناشناس لوگ انہیں پردوں میں رکھ کر رہ جاتے ہیں اور جن کو حقیقت کا علم ہے اور جانتے ہیں کہ اسباب عالم سب پردے ہیں اصل فاعل تو قدرت حق ہے۔ (اشرف التفاسیر منسوب الی الشیخ اشرف علی تھانوی نور اللہ مرقدہ)

جس وقت یہ آیات نازل ہوئیں اس وقت مکہ مکرمہ میں اہل ایمان کے لئے شدید ترین حالات تھے۔ ہر طرف مصیبتیں گھر گھر آرہی تھیں اور کسی طرف سے امید کی کوئی کرن نظر نہیں آرہی تھی۔

ان حالات میں گھبرا جانا اور صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھنا ایک فطری بات ہے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں اہل ایمان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں جو چیز ہاتھ نہ لگے اس پر رنجیدہ نہ ہوا کرو اور جب مل جائے تو اس کو اپنی ذاتی کوشش اور جدوجہد کا نتیجہ سمجھ کر اترایا نہ کرو کیونکہ اللہ کو ایسے لوگ سخت ناپسند ہیں جو فخر و غرور کرتے اور اتراتے ہیں۔ (تفسیر بصیرت قرآن)

دنیا میں کسی چیز کا ملنا یا کسی چیز کا چھننا دونوں امتحان کے لیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے پیشگی طور پر مقرر فرما دیا ہے کہ کس شخص کو اس کے امتحان کا پرچہ کن کن صورتوں میں دیا جائے گا۔ آدمی کو اصلاً جس چیز پر توجہ دینا چاہئے وہ یہ نہیں کہ اس کو کیا ملا اور اس سے کیا چھینا گیا بلکہ یہ کہ اس نے کس موقع پر کس قسم کا ردعمل پیش کیا۔ صحیح اور مطلوب ردعمل یہ ہے کہ آدمی سے کھویا جائے تو وہ دل برداشتہ نہ ہو اور جب اس کو ملے تو وہ اس کی بنا پر فخر و غرور میں مبتلا نہ ہو جائے۔ (تفسیر تذکیر القرآن)

بعض لوگوں کو وہم ہوتا ہے کہ دنیا میں تکلیفات آتی ہیں تو نیک و بد دونوں کو آتی ہیں نہ بد ان سے بچتے ہیں نہ نیک چھوٹتے ہیں اس لئے ایسے لوگوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ جو بھی مصیبت آتی ہے زمین پر ہو جیسے زراعت یا پھلوں کا نقصان یا خود تمہارے نفسوں پر ہو جیسی بیماریاں وغیرہ یہ سب کچھ ہماری تقدیری نوشت میں اس کے پیدا کرنے سے پہلے کی مکتوب ہے۔ یہ خیال نہ کرو کہ اتنے اتنے واقعات اتنی مدت پہلے کس طرح لکھے گئے۔ سنو! اس میں شک نہیں کہ یہ کام اللہ تعالیٰ پر آسان ہے کیونکہ اس کا علم کسبی یا وہبی نہیں بلکہ ذاتی اور ازلی ابدی ہے مگر تم کو اس لئے یہ بتایا گیا ہے کہ تم لوگ کسی ضائع شدہ چیز پر رنجیدہ نہ ہو اور جو تم کو اللہ نے دی ہے اس پر اتراؤ نہیں بلکہ اللہ کی تقدیر جان کر ضائع پر صبر کرو۔ اور حاصل شدہ پر شکر۔ اگر تم ایسا نہ کرو گے تو اللہ کے ہاں متکبر شمار ہو گے۔ اور اللہ تعالیٰ متکبروں شیخی بازوں سے محبت نہیں کرتا۔ (تفسیر ثنائی)

مفسرین نے لکھا ہے کہ اس آیت سے فرقہ قدریہ کے مذہب کی پوری غلطی ثابت ہوتی ہے کیونکہ اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ لوح محفوظ میں علم ازلی الٰہی کے موافق پہلے سب کچھ

لکھا جاچکا ہے اب دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اسی کے موافق ہوتا ہے تمام ملک کی آفت جیسے عام قحط یا عام وبا، جان کی آفت جیسے عزیز و قارب اولاد کا مر جانا، انسان کو آئندہ کا حال معلوم نہیں کہ کیا ہونے والا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان آیتوں میں انسان کو سمجھایا ہے کہ اللہ کا علم ایسا نہیں ہے اس کے علم میں حال کی موجود چیزیں اور آئندہ کی موجود ہونے والی چیزیں دونوں برابر ہیں اس واسطے اس کو دنیا کے پیدا کرنے سے پہلے تمام دنیا کا حال لوح محفوظ میں لکھ لینا چاہیے کچھ مشکل نہیں اور یہ بھی سمجھایا کہ اس لوح محفوظ کے نوشتہ کے حال سے تم لوگوں کو اس لیے خبردار کیا گیا ہے تاکہ تم مصیبت کے وقت بہت رنج اور بے صبری نہ کرو اور یہ سمجھ لو کہ جو مصیبت آئی وہ تقدیر کے نوشتہ کے موافق ہے جو کبھی ٹلنے والی نہیں۔ غرض رنج اور مصیبت کے وقت بالکل بے صبر ہو جانا اور راحت کے وقت اترانا بے فائدہ ہے۔

معتبر سند سے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بعض بندوں کا درجہ عقبیٰ میں بڑھانا چاہتا ہے تو ان پر کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے جس پر ان کو صبر کی توفیق دیتا ہے جس صبر کے اجر میں وہ اس درجہ کے قابل ہو جاتے ہیں اس قسم کی اور بھی صحیح حدیثیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے نصیب میں جو مصیبت اور آفت لکھی گئی ہے وہ حکمت سے خالی نہیں ہے مصیبت کے بعد راحت کے باب میں یہ نصیحت فرمائی ہے کہ راحت کے وقت اتراؤ نہیں کیونکہ دنیا کی راحت اور دنیا کی راحت والے سب ناپائدار ہیں ایسی ناپائدار حالت ہرگز اترانے کے قابل نہیں ہے۔ (تفسیر مظہر القرآن)

ان آیات میں بھی تقدیر الٰہی سے متعلق مضمون بیان کیا گیا ہے، ہم اس سے پہلے بھی لکھ چکے ہیں کہ قضاء اور قدر پر ایمان لانا فرض ہے، تقدیر پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس بات پر یقین اور اعتقاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے ہی خیر اور شر، ایمان اور کفر، ہدایت اور ضلالت، اطاعت اور معصیت کو مقدر کر دیا ہے، اس کو لکھ دیا ہے، اب دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، کائنات میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کے ارادے، اللہ تعالیٰ کی چاہت و مشیت سے ہو رہا

ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے اسے پہلے سے ہی اللہ تعالیٰ جانتے ہیں۔

تقدیر کے معنیٰ اندازہ کرنے کے ہیں، رب تعالیٰ نے کائنات کو عدم سے وجود میں لانے سے پہلے اس کا اندازہ فرمالیا، کہ میں نے کس طرح اس کائنات کو بنانا ہے، اسے سجانا ہے، اس کو مزین کرنا ہے، اس میں کیا کچھ لانا ہے، جیسے کوئی شخص مکان کی تعمیر سے پہلے اس کا نقشہ دوسروں سے تیار کرواتا ہے، نقشہ نویسوں سے نقشہ تیار کروایا جاتا ہے، انجینئر اس تعمیر سے پہلے تعمیر کے تمام پہلوؤں پر غور وحوض کرتا ہے، مگر یہ انسانوں کے اندازے وہ ہیں جن میں کوئی غلطی بھی ہو سکتی ہے، نقشے معمار خراب بھی کر دیتے ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کا علم چونکہ کامل، شامل اور محیط ہے اس لیے وہاں غلطی کا، بھول چوک کا، خطاء وسہو کا کوئی دور دور تک امکان نہیں ہے، بلکہ ان چیزوں کا اس کی طرف منسوب کرنا بھی گناہ ہے، اس نے کائنات بنانے سے پہلے پورا پورا اندازہ کیا ہے کہ اسے کرنا کیا ہے، وقدرہ تقدیرا۔

جب رب تعالیٰ نے کارخانہ عالم کو بنانے کا ارادہ فرمایا تو بنانے سے پہلے اس کا نقشہ تیار فرمایا، ازل سے ابد تک ہر چیز کا ایک اندازہ فرمالیا، اسی اندازہ اور اسی نقشہ کا نام تقدیر الٰہی ہے، رب تعالیٰ نے اپنے ازلی علم سے اندازہ لگالیا کہ آنے والے فلاں وقت میں فلاں جگہ پر، فلاں چیز اس طرح اور اس طرح ہو گی، فلاں بندہ فلاں وقت میں پیدا ہو گا، فلاں وقت میں ایمان لائے گا، فلاں شخص فلاں وقت میں پیدا ہونے کے بعد فلاں وقت میں کفر اختیار کرے گا، یہ سب کچھ اس نے کائنات بنانے سے ہزاروں سال پہلے اندازہ لگایا، اسے تقدیر میں لکھوایا اور اسی کے مطابق یہ ساری کائنات چل رہی ہے، چلتی رہے گی، یہاں تک کہ وہ اس ساری بساط کو اپنے حکم سے لپیٹ دے گا۔

جو نقشہ رب تعالیٰ نے کائنات کے وجود میں آنے سے ہزاروں سال پہلے بنایا، اس نقشے کے مطابق کائنات کی چیزیں بنانے اور وجود میں لانے کا نام قضاء ہے، علماء اہل سنت والجماعت نے قضاء وقدر کے عنوان سے کتابیں بھی مرتب فرمائی ہیں، لغت میں قضاء کا معنیٰ پیدا کرنا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کی پیدائش کے لیے قضاھن کے الفاظ قرآن کریم میں استعمال فرمائے ہیں۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے قضاء وقدر حق ہے، کائنات ہستی کا کوئی ذرہ اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی قضاء اور تقدیر کو دنیا کی کوئی ہستی ملائکہ ،انبیاء، اولیاء، قطب ،ابدال غرضیکہ بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی مخلوق ٹال نہیں سکتی، اللہ کی تقدیر کے فیصلوں کو آگے پیچھے بھی کرنا محال ہے۔

اللہ ہی کے قبضہ اوراختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے ہدایت کی دولت سے مالا مال کر دے، اللہ ہی کے اختیار میں ہے کہ وہ جسے چاہے چاہ ضلال میں پھینک دے، وہ سارے انسانوں کو ہدایت دے دے اسے کوئی پوچھ نہیں سکتا، وہ سارے انسانوں کو گمراہ کر دے اس سے کوئی سوال نہیں کر سکتا، یہ بات اس نے لکھ دی ہے کہ اطاعت اور فرمانبرداری پر جزا دے گا، ثواب دے گا، جب کہ نافرمانی پر سزا دے گا۔

اللہ تعالیٰ حق ہے، اللہ کی تقدیر حق ہے، اللہ کی تقدیر پر ایمان لانا فرض ہے، مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے، ذہن نشین ہونا چاہیے کہ انسان اپنے افعال، اپنے اعمال میں کوتاہیوں کا ارتکاب کر کے تقدیر کو بطور عذر پیش نہیں کر سکتا، ایسا کرنا ٹھیک نہیں ہے، جیسے کوئی چور چوری کا ارتکاب کرے، کوئی زانی زنا کا ارتکاب کرے، کوئی ڈاکو ڈاکہ زنی کرے، کوئی قاتل قتل کا ارتکاب کرے، اور یوں چوری کے بعد سینہ زوری کرے کہ یہ کچھ کرنا میری تقدیر میں لکھا ہوا تھا، تو یہ عذر بندے کا ٹھیک نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی گرفت سے اسے یہ چیز بچانے کے لیے کافی نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سب کچھ تقدیر میں لکھوا دیا ہے، مگر بندے کو تو اس کا علم نہیں ہے کہ میری تقدیر میں میرے رب نے کیا لکھوایا ہوا ہے، بندے نے جو جرائم کیے وہ اس نے تقدیری علم کو سامنے رکھ کر، مجبور ہو کر نہیں کیے، بلکہ اس نے تو اپنی خوشی اور رضامندی کے ساتھ یہ کام کیے ہیں۔

یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی تقدیر سے مجبور نہیں ہوتا، بندہ جو کچھ کرتا ہے وہ اپنے ارادے سے کرتا ہے، اپنے اختیار سے کرتا ہے، اگرچہ بندے کا ارادہ، بندے کا

اختیار بھی اللہ کی طرف سے ہی ہوتا ہے، اس لیے بندہ اس فعل میں بااختیار ہے، مجبور نہیں ہے۔

شیخ المحدثین حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "عقائد الاسلام" میں مسئلہ تقدیر کے مختلف پہلوؤں پر تفصیلی بحث کی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ رہا یہ امر کہ بندہ سے خلاف تقدیر کسی فعل کا سرزد ہونا محال اور ناممکن کیوں ہے، سو اس کی یہ وجہ نہیں کہ بندہ مجبور ہے اور قدرت اور اختیار سے عاری ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا علم اور اس کی خبر اور اس کی تقدیر میں غلطی کا امکان نہیں، اس لیے اس کے خلاف ہونا محال اور ناممکن ہے، تقدیر تو اللہ کی ایک حکایت اور خبر ہے اور علم معلوم کے تابع ہوتا ہے اور حکایت اور خبر محکی عنہ اور واقع کے مطابق ہوتی ہے۔

معلوم، علم کے تابع نہیں ہوتا اور واقعہ خبر اور حکایت کے تابع نہیں ہوتا، علم مجبوری کا سبب نہیں اللہ تعالیٰ کو جس طرح ہمارے افعال اور اعمال کا علم ہے، اسی طرح حق تعالیٰ کو اپنے افعال کا بھی علم ہے، مگر خدا تعالیٰ اس علم کی وجہ سے کسی فعل میں مجبور نہیں، اس طرح سمجھو کہ بندہ اللہ کے علم اور تقدیر سے مجبور نہیں ہو جاتا۔

اللہ کا علم اپنی جگہ پر ہے اور بندہ اپنی جگہ پر ہے، دنیا میں بندہ کو کوئی مجبور نہیں سمجھتا، بندہ اگر مجبور ہوتا تو حکومت مجرموں کے لیے جیل خانہ نہ بناتی، خدا تعالیٰ نے بندہ کو قدرت اور اختیار دیا ہے، جس سے وہ اپنی دین اور دنیا کے کام کرتا ہے، لیکن بندہ اپنے اس اختیار میں مستقل نہیں، جیسے بندہ اپنے وجود میں مستقل نہیں، اسی طرح بندہ اپنے اختیار میں مستقل نہیں، جس طرح خدا کے عطا کردہ وجود سے موجود کہلاتا ہے اور اس کی عطا کردہ آنکھ اور کان سے بینا اور شنوا کہلاتا ہے، اسی طرح خداداد قدرت اور اختیار سے بندہ قادر اور مختار کہلاتا ہے، پس جس طرح بندہ کی سمع اور بصر اختیاری نہیں لیکن اس کا دیکھنا اور سننا اختیاری ہے، اسی طرح بندہ کا اختیار اختیاری نہیں لیکن بندہ کا فعل اختیاری ہے، اس لیے اہل حق یہ کہتے ہیں کہ بندہ اپنی صفت اختیار میں مختار نہیں، مگر اپنے افعال اور اعمال میں مختار ہے۔ (عقائد الاسلام حصہ اول ۲۳، ۲۴)

حضرت کاندھلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کو بندہ کے افعال اور اس کے حرکات وسکنات کا خالق ماننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ حرکات بندہ کی قدرت اور اختیار سے خارج ہو جائیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے قدرت اور مقدور دونوں ہی کو پیدا کیا اور اختیار اور ذی اختیار دونوں کو بنایا، قدرت بندہ کی ایک صفت ہے اور خدا تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی ہے اور بندہ اور بندہ کی صفت قدرت سب خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہے اور اسی کے قبضہ قدرت میں ہے، اور بندہ جو خدا کی دی ہوئی صفت قدرت سے کوئی حرکت کرتا ہے تو وہ حرکت تمام عقلاء کے نزدیک اختیاری ہے لرزہ اضطراری نہیں، غرض یہ کہ بندہ کی ذات اور اس کی کسی صفت اور کسی فعل کے ساتھ خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کے ارادہ اور مشیت کے متعلق ہو جانے سے بندہ مجبور نہیں ہو جاتا۔

مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ آخر خدا تعالیٰ کی قدرت اور مشیت بندہ کے صفت وجود سے بھی متعلق ہے مگر اس تعلق کی وجہ سے بندہ معدوم نہیں ہو گیا، اسی طرح اللہ کی قدرت اور مشیت، بندہ کی قدرت اور اختیار کے ساتھ متعلق ہو جانے سے بندہ مجبور نہیں ہو جائے گا، بندہ بہر حال بندہ ہے اور خدا تعالیٰ کی مخلوق ہے اور مخلوق کی ذات اور صفات کا خالق کے دائرہ قدرت و مشیت سے باہر نکلنا عقلاً محال اور ناممکن ہے، جن لوگوں کا یہ خیال ہے کہ بندہ فاعل مستقل ہے اور خود اپنے افعال کا خالق ہے اور معاذ اللہ خدا تعالیٰ کی قدرت اور مشیت کو بندہ کے افعال سے تعلق نہیں تو اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ایک مخلوق، اپنے افعال اور اعمال میں اپنے خالق کے دائرہ قدرت و مشیت سے باہر نکل سکتی ہے، تمام امت بالاتفاق یہ کہتی ہے مَاشَآءَ اللّٰہُ کَانَ مَالَم یَشَآء لَم یَکُن، کہ جو اللہ نے چاہا وہ تو ہوا اور جو نہ چاہا وہ نہیں ہوا، معتزلہ بندہ کے افعال کو خدا کی مشیت سے مستثنیٰ سمجھتے ہیں، ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم (ایضاً)

حضرت رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حق جل شانہ نے یہ کارخانہ ایک طرح پر نہیں پیدا فرمایا قسم قسم کی چیزیں پیدا فرمائیں، صورت اور شکل بھی ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ بنائی، ہر ایک میں استعداد بھی جداگانہ

رکھی ایک ہی درخت کو لے لیجیے جس میں ہزاروں قسم کی لکڑی موجود ہے، بعض ان میں سے جلانے کے قابل ہے اور بعض تخت بنانے کے قابل ہے اور کوئی چھت میں لگانے کے قابل اور کوئی بیت الخلاء کے قدمچوں میں لگانے کے قابل ہے، ایک ہی کان سے لوہے کے نکلے ہوئے دو ٹکڑے ہوتے ہیں، ایک سے آئینہ شاہی بناتے ہیں اور ایک سے چوپایوں کا نعل بناتے ہیں، یہ استعدادوں کا تفاوت اللہ کے ارادہ اور مشیت سے ہے، تمام عالم کے عقلاء اس پر متفق ہیں کہ کائنات کی استعدادیں اور صفتیں اور کیفیتیں برابر اور یکساں نہیں اور اگر سب یکساں ہوتیں تو یہ رنگ برنگ کا کارخانہ تو نہ چلتا کوئی اور عالم ہوتا

ہر یکے را بہر کارے ساختند میل اورا در دلش انداختند

اب رہا یہ امر کہ یہ استعدادوں میں اختلاف اور تفاوت کیوں ہے تو یہ عقدہ آج تک تو کسی سے حل نہیں ہوا اور نہ حل ہو گا کس نہ کشود و نہ کشاید بحکمت ایں معمّارا، پس جس طرح حق تعالیٰ نے شجر اور حجر کو اپنی قدرت اور حکمت سے ایک قسم کا نہیں پیدا کیا بلکہ ہر ایک میں نئی استعداد پیدا کی، کسی میں اچھی استعداد پیدا کی اور کسی میں بری استعداد، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے تمام بندوں کو یکساں اور برابر نہیں پیدا کیا کہ سب کی استعداد برابر ہوتی، کسی کو عاقل اور ذکی بنایا اور کسی کو غبی اور بد عقل بنایا، کسی میں قبول حق کی استعداد پیدا کی اور کسی میں قبول شر کی استعداد رکھی، کسی کے دل کو آئینہ کی طرح صاف وشفاف بنادیا کہ آفتاب کے عکس کو قبول کر سکے اور کسی کے دل کو کالے توے کی طرح بنادیا، اسی طرح کسی کے دل کو اپنے انوار و تجلیات کا شہ نشین بنالیا اور کسی کو اپنے مطبخ (جہنم) کے لیے ایندھن بنالیا، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر است دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نباشد

اور کسی کی مجال نہیں کہ خداوند ذوالجلال سے کوئی یہ سوال کر سکے کہ آپ نے اس چیز کو ایسا اور

اس چیز کو ایسا کیوں پیدا کیا لَا یُسْئَلُ عَمَّا یَفْعَلُ وَھُمْ یُسْئَلُوْنَ (عقائد الاسلام حصہ اول ۲۵، ۲۶)

مولانا کاندھلوی رحمہ اللہ یہاں ایک شبہ کا جواب دیتے ہیں، وہ شبہ یہ ہے کہ بندوں کے اقوال اور افعال کا دارومدار استعدادوں پر ہے اور وہ سب ازلی ہیں اور آدمیوں کی طاقت سے باہر ہیں، لہذا کافروں پر الزام کیا اور کیا وہ فی الحقیقت مجبور اور بے اختیار ہیں؟ حضرت جواب دیتے ہیں کہ، حق تعالیٰ شانہ نے مخلوقات کو دو قسم پر پیدا کیا ہے، ایک قسم تو وہ ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ نے علم اور ارادہ کی صفت ہی نہیں رکھی جیسے درخت اور پتھر، اس نوع سے نہ کوئی خطاب ہے اور نہ اس پر کسی قسم کا عتاب ہے اور نہ مؤاخذہ ہے اور نہ ثواب اور عقاب ہے اور دوسری قسم وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے یہ دونوں صفتیں (علم وارادہ) امانت رکھی ہیں، جیسے جنات اور انسان، ان کو اللہ تعالیٰ نے علم بھی دیا، فہم بھی، قدرت اور اختیار بھی دیا، اعضاء وجوارح بھی دیے، جان بوجھ کر اپنے اختیار سے افعال کرتے ہیں اور ان افعال کو اپنی طرف منسوب کرتے ہیں، مثلاً یہ کہتے ہیں کہ یہ افعال ہم نے اپنے ہاتھوں اور پیروں سے کیے ہیں اور میں نے یہ کہا اور میں نے یہ کیا اور اس کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ افعال ہمارے ارادہ اور اختیار سے صادر ہوتے ہیں اور دنیا میں جو کچھ ان افعال پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے، اس کو قبول کرتے ہیں، لیکن جب اخروی جزا و سزا کا ذکر آتا ہے تو یہ کہنے لگتے ہیں کہ ہم مجبور ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں علم اور ارادہ اور اختیار کی جو صفت پیدا کی ہے وہ اسی لیے پیدا کی ہے کہ وہ احکام خداوندی کے مکلف اور مخاطب بن سکیں اور اطاعت اور معصیت پر جزا اور سزا مرتب ہوسکے اور جس طرح شاہان دنیا محض قابلیت پر کوئی انعام یا سزا نہیں دیتے اسی طرح حق تعالیٰ محض استعداد پر جزا و سزا نہیں دیتے جب تک عمل خیر و شر ظہور میں نہ آجائے۔ محض شجاعت اور بہادری پر انعام نہیں ملتا، جب تک کسی میدان میں بہادری نہ دکھلائے، اسی طرح محض استعداد پر ثواب اور عقاب نہیں ملتا جب تک کوئی طاعت اور معصیت ظہور میں نہ آئے۔ (عقائد الاسلام حصہ اول ۲۶)

بخل و بخیلی کی مذمت

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ {۲۴} الحدید

جواب ترجمہ: وہ ایسے لوگ ہیں جو کنجوسی کرتے ہیں، اور دوسرے لوگوں کو بھی کنجوسی کی تلقین کرتے ہیں۔(۱۹) اور جو شخص منہ موڑ لے تو یاد رکھو کہ اللہ ہی ہے جو سب سے بے نیاز ہے، بذات خود قابل تعریف۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ: مفسرین نے لکھا ہے کہ یہاں الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ سے مراد وہ لوگ ہیں جو اپنے مال میں سے اللہ کا حق (زکوٰۃ، صدقہ وغیرہ) ادا نہیں کرتے اور دوسروں کو بھی اس سے روکتے ہیں۔ امام طبری کے مطابق: یہ وہ لوگ ہیں جو دنیا میں جو کچھ انہیں دیا گیا ہے، اس پر فخر کرتے ہیں اور اس میں سے اللہ کا حق ادا نہیں کرتے، بلکہ دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔ امام ابن عجیبہ اور دیگر مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ لوگ نہ صرف خود بخل کرتے ہیں بلکہ دوسروں کو بھی بخل کی طرف مائل کرتے ہیں، یعنی انہیں بھی انفاق اور صدقہ سے روکتے ہیں۔ (تفسیر البحر المدید)

حضرت مقاتل رحمہ اللہ، سدی رحمہ اللہ، کلبی رحمہ اللہ نے اس آیت کو یہود کے بارے میں قرار دیا ہے کہ وہ نہ صرف مال میں بخل کرتے تھے بلکہ علم اور نبی اکرم ﷺ کی صفات کو بھی چھپاتے تھے اور لوگوں کو بھی اس سے روکتے تھے۔ بعض اہلِ تفسیر نے وضاحت کی ہے کہ بخل صرف مال میں نہیں بلکہ علم، شفاعت، نصیحت اور دیگر معاملات میں بھی ہو سکتا ہے، یعنی جو شخص علم یا خیر کو دوسروں تک نہیں پہنچاتا، وہ بھی اس آیت کے تحت آتا ہے۔

وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ : یعنی جو شخص اللہ کے حکم سے منہ موڑ لے، انفاق اور طاعت سے اعراض کرے، تو اس کا نقصان اللہ کو نہیں بلکہ خود اسی کو ہے۔ امام طبری اور دیگر مفسرین نے لکھا: اللہ تعالیٰ غنی ہے، اس کو کسی کے مال یا عمل کی ضرورت نہیں اور وہ اپنی ذات میں محمود ہے، اس کی حمد اس کے کمالات اور عطا کی وجہ سے ہے۔ (تفسیر الطبری)

اس آیت میں بخل اور اس کی ترغیب دینے والوں کی شدید مذمت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو کسی کے مال یا عمل کی ضرورت نہیں، اصل فائدہ انسان کو خود ہے۔ امام بیضاوی لکھتے ہیں": اس میں تھدید اور تنبیہ ہے کہ انفاق کا حکم منفق (خرچ کرنے والے) کی بھلائی کے لیے ہے، اللہ کو اس کی کوئی حاجت نہیں۔ (تفسیر البیضاوی)

لوہے کے فوائد اور مقاصد

سوال اس آیت کی روشنی میں اس معدن (کان) کا ذکر کیجیے جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں بہت زیادہ قوت رکھی ہے، اس میں لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ {۲۵} الحدید.

جواب ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ ہم نے اپنے پیغمبروں کو کھلی ہوئی نشانیاں دے کر بھیجا، اور ان کے ساتھ کتاب بھی اتاری، اور ترازو بھی، تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور ہم نے لوہا اتارا جس میں جنگی طاقت بھی ہے اور لوگوں کے لیے دوسرے فائدے بھی، اور یہ اس لیے تاکہ اللہ ظاہر کر دے کہ کون ہے جو اس کو دیکھے بغیر اس (کے دین) کی اور اس کے پیغمبروں کی مدد کرتا ہے۔ یقین رکھو کہ اللہ بڑی قوت کا، بڑے اقتدار کا مالک ہے۔

یہ معدن (کان) جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں بہت زیادہ قوت رکھی ہے اور اس میں لوگوں کے لیے بہت سے فائدے ہیں یہ لوہا ہے، لوہے کی اہمیت کا اندازہ اسی بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس اور آخری کتاب قرآن کریم میں الحدید کے نام پر ایک پوری سورت رکھ دی ہے۔

اس مقام پر حق تعالیٰ نے لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنَاتِ سے اپنے رسولوں کی بعثت کا ذکر فرمایا اور اس امر کو ثابت فرمایا کہ رسولوں کی بعثت عالم کی ہدایت اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اللہ نے مقدر فرمائی۔ وہ دلائل وبینات کے ذریعے عالم کو ہدایت اور رشد وفلاح کی دعوت دیتے رہے۔

اب اس کے بعد ارسال رسل کی نعمت کے ساتھ ایک اور انعام کا ذکر فرمادیا گیا کہ لوہے کو اتارا جس میں سختی ہے اور لوگوں کے واسطے منافع ہیں یعنی عالم کی ہدایت جن رسولوں اور آسمانی کتابوں کے ذریعہ ہے اسی کے ساتھ ہدایت کا دوسرا ذریعہ جہاد ہے کہ جو لوگ اپنی طبعی کجروی سے باز نہ آئیں نہ اللہ کے احکام کو مانیں اور نہ انصاف کی ترازو کو سیدھا رکھیں جس سے نظام عالم اور اس کا امن وراحت اور رشد و فلاح وابستہ ہے تو پھر ان سے جہاد و قتال ہو گا اور اس وقت ان باغیوں کے مقابلہ کے لیے تلوار اٹھانا پڑے گی اور ظاہر ہے کہ اس خالص دینی جہاد میں لوہے سے ہی کام لینا ہو گا پھر یہ ظاہر ہو جائے گا کہ کون اللہ کا مخلص و فرمانبردار ہے اور کون نافرمان و باغی۔

الغرض لوہے کی سختی سے محض ظاہری اور مادی سختی ہی مراد نہیں بلکہ ارسال رسل اور نزول کتب کے ساتھ لوہے کی یہ سختی جہاد میں اسلحہ کا استعمال ہے دلائل وبینات سے بھی کافروں اور کفر کا جہاد و مقابلہ ہے چنانچہ اس نوع کا جہاد مکی زندگی میں تیرہ سال تک جاری رہا اس کے بعد مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد دلائل کے بجائے بصورت جہاد، مقاتلہ شروع ہو گیا۔

امام ابوداؤد نے ایک حدیث بروایت عبداللہ بن عمر بیان فرمائی ہے کہ حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا بُعِثْتُ بِالسَّيْفِ بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ حَتَّى يُعْبَدَ اللّٰهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ لَهُ، وَجُعِلَ رِزْقِي تَحْتَ

ظِلِّ رُمْحِی، وَجُعِلَ الذِّلَّةُ والصِّغار عَلَى مَنْ خَالَفَ أَمْرِی، وَمَنْ تَشبَّه بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ ، میں مبعوث کیا گیا ہوں تلوار دیکر جہاد مع الکفار کے لئے قیامت سے پہلے اور اس کا مامور ہوں کہ جہاد کرتا رہوں تا آں کہ اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت و بندگی کی جانے لگے اور میرا رزق میرے تیروں کے سایہ میں بنایا گیا ہے اور ذلت وناکامی ان لوگوں کے حق میں طے کر دی گئی ہے جو میرے حکم کی نافرمانی کریں، اور جو کسی قوم سے مشابہت اختیار کرے گا وہ انہی میں سے ہو گا۔

اس آیت مبارکہ میں بعثت رسل اور انزال کتب کے ساتھ میزان اتارنے کا ذکر فرما کر یہ اشارہ کر دیا گیا کہ دنیا میں عدل و انصاف کا قیام دو چیزوں کے ذریعہ سے ہے ایک کتب سماویہ اور وحی الٰہی اور دوسرے میزان جس سے ہر ایک کو اس کا حق ناپ تول کو پہنچا دیا جائے نہ کسی کی حق تلفی ہو اور نہ عدل وانصاف سے ذرہ برابر انحراف ہو یہی چیز ہدایت کی روح اور نظام عالم کو صحیح خطوط پر چلانے والی ہے اور عدل و انصاف جن ہدایات و اصول کے ماتحت ہو سکتا ہے وہ آسمانی ہدایات اور پیغمبروں کے ذریعہ ہی سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ (معارف القرآن للکاندھلوی رحمہ اللہ)

لوہے کا استعمال: لوہے کی دریافت بڑی پرانی ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے پوتے حضرت ادریس علیہ السلام نے سب سے پہلے لوہے کی سوئی بنا کر اس سے کپڑے سیئے۔ چنانچہ لوہے کا استعمال اس وقت سے ہو رہا ہے، قدیم زمانے سے جنگی ہتھیار تلوار، نیزہ تیر، زرہ، ڈھال وغیرہ لوہے سے ہی تیار کی جارہی ہیں۔

گزشتہ صدی کو لوہے کا زمانہ (IrAn age) کا نام دیا گیا تھا، چنانچہ اس دور سے لے کر لوہے سے بے انتہا کام لیا گیا ہے۔ آج زندگی کے کسی شعبے سے بھی لوہے کو خارج نہیں کیا جاسکتا۔ آلات حرب کے طور پر استعمال ہونے والی اشیاء بندوق، توپ، گولہ بارود، ٹینک، گاڑیاں، ہوائی جہاز، بحری جہاز وغیرہ سب لوہے سے تیار ہوتی ہیں صنعتی میدان میں تمام چھوٹی بڑی مشینری لوہے سے تیار ہوتی ہے، جن کی وجہ سے دنیا میں صنعتی ترقی اپنے عروج کو پہنچ چکی ہے اب تو زراعت کے لئے بھی روایتی زرعی آلات کی جگہ لوہے سے تیار ہونے والے جدید آلات، ٹریکٹر، ٹرالی، ہل، بلڈوزر وغیرہ استعمال ہو رہے

ہیں جس سے زراعت میں بھی بڑی ترقی ہوئی ہے۔

عام گھریلو استعمال کی اشیاء میں لوہے کو جس حد تک دخل ہے وہ سب کے سامنے ہے حتیٰ کہ اب تو چارپائیاں بھی لوہے کی بن رہی ہیں۔ ٹرانسپورٹ کا سارا نظام لوہے پر منحصر ہے۔ چھوٹی بڑی گاڑیوں سے لے کر ریل گاڑیوں اور اس کی پٹڑی سب لوہے سے بنتی ہیں۔ غرضیکہ لوہا ایک نہایت ہی کار آمد دھات ہے جس کے متعلق اللہ نے فرمایا ہے کہ ہم نے لوہے کو اتارا جس میں سخت لڑائی ہے یعنی جنگ کے دوران اس کی افادیت مزید بڑھ جاتی ہے اور اس میں لوگوں کے لئے دیگر بھی بہت سے فوائد ہیں۔ بعض تفسیری روایات میں یہ بھی آتا ہے کہ اللہ نے لوہا، آگ، پانی اور نمک آسمان سے اتارا۔

جوں جوں آبادی بڑھ رہی ہے ضروریات زندگی بھی بڑھ رہی ہیں۔ زیر زمین لوہا، کوئلہ، تانبا، پٹرول جیسی چیزویں کا ذخیرہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ لہٰذا دنیا اب لوہے کے دور سے نکل کر ایٹمی دور میں داخل ہو رہی ہے ایٹمی توانائی سے بجلی کی ضروریات پوری کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایٹم کا استعمال شعبہ طب میں بھی آگے بڑھ رہا ہے اور مزید تجربات کیے جارہے ہیں حتیٰ کہ اب جنگیں بھی ایٹمی دور میں داخل ہو چکی ہیں اور بیشمار ایٹمی ہتھیار ایجاد ہو رہے ہیں۔ بہر حال لوہے کی اپنی افادیت ہے اور ایٹمی توانائی کو بھی لوہے کے بغیر استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ (تفسیر معالم العرفان للسواتی رحمہ اللہ)

نزول آہن کا مقصد: اللہ نے فرمایا کہ لوہا بڑی اہم چیز ہے جس میں اللہ نے بڑے فوائد رکھے ہیں۔ اور اس سے مقصود یہ ہے لِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ، اور تاکہ اللہ معلوم کرلے یعنی ظاہر کردے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی بن دیکھے مدد کرتا ہے اللہ اور اس کے رسولوں کی مدد سے مراد اللہ کے دین کی مدد ہے، اور دین حق کو دنیا میں غالب کرنا مقصود ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے طاقت کی ضرورت ہے جس میں افرادی قوت اور اسلحہ دونوں چیزیں درکار ہیں۔ اسلحہ سازی میں لوہے کی اہمیت کو واضح کیا جاچکا ہے لہٰذا اللہ نے لوہے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ ظاہر کرنا چاہتا ہے کہ اس کے دین کی کون مدد کرتا ہے۔ مسلمانوں میں کون سا ملک یا کون سا خطہ ہے جو

لوہے کو صحیح طریقے سے استعمال کر کے اس امتحان میں پورا اترے اور اس طرح پوری دنیا میں اسلام کو غالب بنادے۔ فرمایا اِنَّ اللّٰهَ قَوِیٌّ عَزِیزٌ ، بیشک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔ وہ کمال قدرت کا مالک ہے۔ اس کو تو کسی چیز کی ضرورت نہیں، وہ صرف مخلوق کا امتحان لیتا ہے کہ کون اس کے احکام پر عمل کرتے ہوئے دین کے غلبے کی کوشش کرتا ہے۔ (تفسیر معالم العرفان للسواتی رحمہ اللہ)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے جو چیزیں ساتھ لے کر آئے تھے ان میں حجر اسود ہے۔ یہ جنت کے ہیروں میں سے ایک ہیرا ہے۔ بڑا روشن اور چمکیلا تھا فرمایا سَوَّدَتْهُ خَطَایَا بَنِی آدَمَ انسانوں کی خطاؤں نے اس کو کالا کر دیا ہے۔

ترمذی شریف کی روایت ہے۔ یوں سمجھو کہ دلوں کی سیاہی اس بے چارے پر پڑ گئی وہ جنت کا ہیرا ہمارے گناہوں سے کالا ہو گیا۔ تو حضرت آدم علیہ السلام حجر اسود جنت سے ساتھ لے کر آئے تھے اور آئرن وہ لوہا جس پر لوہے کو کوٹتے ہیں اور مطرقہ اور ہتھوڑا اور کلبان سنی جس کے ساتھ پکڑتے ہیں یہ بھی جنت سے ساتھ لے کر آئے تھے۔ (تفسیر ابن جریر طبری)

طبقات ابن سعد میں ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام جنت سے نو چیزیں ساتھ لائے تھے، ① حجر اسود ② جنتی درختوں کی پتیاں یا پھول کی پنکھڑیاں ③ وہ لاٹھی جو جنت کے درخت آس کی تھی ④ بیلچہ۔ ⑤ کدال ⑥ کندر یا صنوبر ⑦ سندان (اہران) ⑧ ہتھوڑا ⑨ سنڈاسی۔ (طبقات ابن سعد)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام، پیروکاران عیسیٰ اور رہبانیت

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِیْمَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّیْنَا بِعِیْسَی ابْنِ مَرْیَمَ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِیَّةَ ِۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ۚ فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَ كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ {۲۷} الحدید.

جواب ترجمہ: اور ہم نے نوح کو اور ابراہیم کو پیغمبر بنا کر بھیجا، اور ان دونوں کی اولاد میں نبوت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ پھر ان میں سے کچھ تو ہدایت پر آ گئے، اور ان میں سے بہت سے لوگ نافرمان رہے۔ پھر ہم نے ان کے پیچھے انہی کے نقش قدم پر اپنے اور پیغمبر بھیجے، اور ان کے پیچھے عیسیٰ ابن مریم کو بھیجا اور انہیں انجیل عطا کی، اور جن لوگوں نے ان کی پیروی کی ان کے دلوں میں ہم نے شفقت اور رحم دلی پیدا کر دی۔ اور جہاں تک رہبانیت کا تعلق ہے وہ انہوں نے خود ایجاد کر لی تھی، ہم نے اس کو ان کے ذمے واجب نہیں کیا تھا۔ لیکن انہوں نے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنی چاہی، پھر اس کی ویسی رعایت نہ کر سکے جیسے اس کا حق تھا۔ غرض ان میں سے جو ایمان لائے تھے، ان کو ہم نے ان کا اجر دیا، اور ان میں سے بہت لوگ نافرمان ہی رہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانی بستی کی رشد و ہدایت کے لیے حضرت نوح علیہ السلام کو مبعوث فرمایا، پھر ان کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھیجا، اللہ نے انہیں دلائل، معجزات اور براہین کے اسلحہ سے لیس فرمایا، پھر ان کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے سب سے آخری تاجدار نبوت بنا کر بھیجے گئے، جنہیں انجیل عطا کی گئی، پھر اللہ نے یہ کرم نوازی فرمائی کہ جن لوگوں کو ان کا پیروکار بنایا انہیں نرمی اور شفقت عطا فرمائی، یہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور پیار کے جذبات رکھتے تھے۔

البتہ یہود جس طرح تورات کی تعلیم کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں قساوتِ قلبی کا شکار ہوئے اور انھوں نے تاریخ کے مختلف ادوار میں جابجا اس کا ثبوت بھی فراہم کیا۔ اور پھر ان کے رویے اور ان کی تعلیمات میں بھی اس کا اثر اس حد تک گہرا ہوا کہ وہ دین کی حقیقی روح سے بیگانہ ہو گئے۔ ان کے پاس الفاظ کا انبار تو رہا لیکن روحانیت جاتی رہی۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی قساوتِ قلبی کے پیش نظر اپنے ماننے والوں میں رافت و رحمت کی تبلیغ کی۔ رافت دل کی اس نرمی کو کہتے ہیں جو کسی کو تکلیف و مصیبت میں دیکھ کر ایک شخص کے دل میں

پیدا ہوتی ہے۔ اور رحمت سے مراد وہ جذبہ ہے جو مظلوم مقہور آدمی کی مدد پر اکساتا ہے۔ لیکن مقصود اس رافت و رحمت سے دلوں کو نرم کرنا، قساوتِ قلبی کو ختم کرنا اور اس کی جگہ ہمدردی و خیر خواہی کے جذبے کو پیدا کرنا تھا اور یہ بات کوئی نئی نہ تھی ہر پیغمبر نے اسی کی تعلیم دی۔ اور خود آنحضرت ﷺ اسی کا پیکر تھے۔ اور مسلمانوں کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے یہی بات ارشاد فرمائی تھی کہ اہل ایمان باہمی ہمدردی اور دردمندی میں اس طرح ہیں جس طرح ایک جسم کے اعضاء باہم دگر ہوتے ہیں۔ (تفسیر روح القرآن)

الٰہی تعلیمات میں غلو کرتے ہوئے حضرت مسیح کے نام لیواؤں نے رہبانیت اختیار کرلی تھی، رہبانیت اختیار کرنے کا حکم اللہ کی طرف سے نہیں تھا، نہ ہی یہ فرض تھی، بلکہ اس رہبانیت کو انہوں نے اپنی طرف سے اختیار کر لیا تھا، اس رہبانیت سے ان کا مقصود اللہ تعالیٰ کو راضی کرنا تھا۔

مفسر قرآن ڈاکٹر اسلم صدیقی لکھتے ہیں لیکن بعد کے مبتدعین نے اس میں اضافہ کرتے ہوئے اسے رہبانیت تک پہنچادیا۔ اور پھر رہبانیت عیسائیت کی پہچان بن گئی۔ رہبانیت اصطلاحی طور پر ترک دنیا کو کہتے ہیں۔ یعنی اگر کوئی شخص کسی خوف میں مبتلا ہو کر چاہے وہ کسی ظلم کا ہو یا اپنے نفس کے فتنوں کا تارک الدنیا بن جاتا ہے۔ اور دنیوی زندگی سے بھاگ کر جنگلوں اور پہاڑوں میں پناہ لے لیتا ہے تو ایسے شخص کو راہب کہتے ہیں۔

اس بات کا حکم پروردگار نے عیسائیوں کو نہیں دیا تھا۔ انھوں نے اس رہبانیت کو خود اختیار کیا اور ایک بدعت کے طور پر دین میں اسے داخل کر دیا۔ حالانکہ انھیں جس بات کا حکم دیا گیا تھا وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا حصول ہے اور یہ بات بھی تمام انبیائے کرام کے دین کا مقصد رہی ہے۔

پھر اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ انہوں نے رہبانیت کے لیے جو حدود و قیود مقرر کیے تھے اس کی پابندی اور پاسداری نہ کرسکے۔ بعد میں رہبانیت نے جو شکل اختیار کی جسے ترک دنیا کا نام دیا گیا وہ ابتدائی صدیوں میں نہ تھی۔

بدعت چونکہ ایک جگہ نہیں رکتی وہ مختلف شکلیں اختیار کرتی چلی جاتی ہے، یہاں بھی یہی حادثہ پیش آیا۔ نبی کریم ﷺ نے اس کی مزید توضیح فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا لَارَهبَانِيَةَ فِي الاِسلَامِ اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں اور ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ اس امت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

بلکہ اس رہبانیت سے بچانے کے لیے آنحضرت ﷺ نے تاکید کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اپنے اوپر سختی نہ کرو کہ اللہ تم پر سختی کرے، ایک گروہ نے یہی تشدد اختیار کیا تھا تو اللہ تعالیٰ نے بھی اسے سخت پکڑا، دیکھ لو ان کے بقایا راہب خانوں اور کلیسوں میں موجود ہیں۔ (ابوداؤد بحوالہ تفسیر روح)

امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ فرماتے ہیں آیت ۲۷ سے دین میں رہبانیت کی حیثیت واضح ہو جاتی ہے کہ یہ اللہ کی طرف سے ان پر فرض نہیں کی گئی تھی بلکہ انہوں نے خود اپنے اوپر فرض کرلی تھی، اور اس سے بزعم خود وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا چاہتے تھے مگر اسلام نے اس قسم کی رہبانیت اور عزلت نشینی کی نفی کی، نبی ﷺ نے فرمایا، لَارَهبَانِيَةَ فِي الاِسلَامِ کہ رہبانیت ایک غیر اسلامی چیز ہے اور میری امت کی رہبانیت جہاد فی سبیل اللہ ہے عیسائیوں نے اس سلسلہ میں دوہری غلطی کی۔

ایک یہ کہ اپنے اوپر وہ پابندیاں عائد کیں جن کا اللہ تعالیٰ نے حکم نہیں دیا تھا اور پھر ان پابندیوں کی صحیح طور پر رعایت بھی نہ کرسکے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد دو سو سال تک عیسائی کلیسا رہبانیت سے ناآشنا تھا مگر مسیحیت میں ایسے تخیلات پائے جاتے تھے جن پر بعد میں رہبانیت کی اساس قائم ہوئی بلکہ دنیاوی کاروبار سے علیحدگی اور تجرد کی زندگی کو افضل سمجھا جاتا تھا مگر تیسری صدی میں اس تخیل نے ایک فتنے کی شکل اختیار کی اور رہبانیت ایک وبا کی طرح مسیحیت میں پھیل گئی۔

شہوانیت اور بدکاری کو روکنے کے لیے عورت اور مرد کے باہمی تعلق کو نجس قرار دیا گیا اور مذہب کی توسیع کے لیے بدعات کو فروغ دیا گیا اولیا پرستی، مسیح اور مریم کے مجسموں کی پوجا، تعویذ، گنڈے، جن بھوت نکالنے کا عمل، یہ سب باتیں عیسائی درویشوں میں مقبول ہو گئیں۔ پھر چونکہ تنہا

انجیل کے اندر کوئی ضابطہ حیات نہ تھا اس لیے عیسائی علماء نے مستعار فلسفوں کو اپنانا شروع کر دیا اور بدھ مذہب کے بھکشوؤں اور جوگیوں، ایران کے مانویوں اور افلاطون کے پرواشراقیوں سے بہت سے طور وطرق اخذ کر لیے اس طرح قرآن مجید کے زمانہ نزول میں اس مذہب کے بڑے بڑے علماء خود راہب اور رہبانیت کے علمبردار بن گئے تھے اور انہیں کی کوششوں سے کلیسا میں رہبانیت نے رواج پایا۔ (تفسیر ترجمان القرآن)

مولانا ابوالکلام آزاد رحمہ اللہ رہبانیت کی حقیقت سے پردہ اٹھاتے ہوئے فرماتے ہیں یہ رہبانیت کیا تھی؟ سخت ریاضتوں سے اپنے جسم کو تکالیف میں مبتلا رکھتے تھے اور خانقاہوں میں نفس کشی کے لیے مشقتیں کی جاتی تھیں اس سلسلہ میں ان کی ریاضتیں مشہور ہیں اور یہی راہب ان کے اولیاء اللہ کہلاتے تھے اسی بگاڑ کی طرف قرآن مجید نے مختصر الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے۔ (ترجمان القرآن)

آیت کے آخر میں فرمایا کہ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے ہم نے انہیں ان کا پورا اجر دیا۔ ذکر چونکہ اس آیت کریمہ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نام لیواؤں کا ہے اس لیے یہ قرینہ ہے اس بات پر کہ یہاں ایمان لانے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے اور پھر اپنے ایمان پر ہر طرح کے حالات میں ثابت قدم رہے۔ یہاں اٰمَنُوْا اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی انہوں نے اپنے ایمان میں حالات کے دباؤ کے تحت کوئی کمی بیشی نہیں ہونے دی۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس سے مراد حضرت مسیح علیہ السلام کے سچے خلیفہ حضرت شمعون اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے نصاریٰ ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں کہ جب اسلام کی دعوت بلند ہوئی تو ان ہی کے نام لیواؤں اور ان کے راستے پر چلنے والوں نے نہایت خوشدلی کے ساتھ اسلام کی دعوت کا خیر مقدم کیا۔ ان کے علاوہ باقی لوگوں میں سے بیشتر لوگوں نے تثلیث اور رہبانیت کی بدعتیں ایجاد کر کے دین مسیح کا حلیہ بگاڑا۔ اور یہی وہ لوگ ہیں جو سینٹ پال کے پیروکار بنے۔ ان ہی کو اس آیت کریمہ میں فاسق بتایا گیا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ ضال بھی تھے اور مضل بھی۔ (روح القرآن)

مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کے اجر میں فرق

سوال ان آیات کی تفسیر کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۲۸} لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ {۲۹} الحدید

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور اس کے پیغمبر پر ایمان لاؤ تاکہ وہ تمہیں اپنی رحمت کے دو حصے عطا فرمائے، اور تمہارے لیے وہ نور پیدا کرے جس کے ذریعے تم چل سکو، اور تمہاری بخشش فرمادے۔ اور اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ تاکہ اہل کتاب کو معلوم ہو جائے کہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر انہیں کوئی اختیار نہیں ہے، اور یہ کہ فضل تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے جو وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے، اور اللہ فضل عظیم کا مالک ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نجاشی کے ساتھیوں میں سے چالیس آدمی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور آپ کے ساتھ غزوۂ احد میں شامل ہوئے۔ ان میں سے کئی زخمی ہوئے مگر ان میں سے کوئی بھی قتل نہیں ہوا۔ جب ان لوگوں نے مومنین کی حاجات وضرورت کو دیکھا تو کہنے لگے یا رسول اللہ! ہم وسعت والے ہیں ہم کو اجازت دیجیے کہ ہم اپنے مالوں کو لے آئیں اور اس کے ذریعہ مسلمانوں کی دلجوئی کریں۔ تو ان کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی آیت اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ يُؤْمِنُوْنَ اور وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی ان سے پہلے وہ اس کے ساتھ ایمان لاتے ہیں سے لے کر آیت اُولٰٓئِكَ يُؤْتَوْنَ اَجْرَهُمْ مَّرَّتَيْنِ بِمَا صَبَرُوْا (القصص) یہی لوگ ہیں کہ ان کو دو مرتبہ اجر دیا جائے گا ان کے صبر کرنے کے بدلے میں یعنی ان

کے لیے دو اجر بنا دیئے گئے پھر فرمایا آیت وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اور وہ دفع کرتے ہیں برائی کو نیکی کے ساتھ یعنی وہ خرچ کرنا کہ جس کے ذریعہ انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کی۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو انہوں نے کہا اے مسلمانوں کی جماعت! جو ہم میں تمہاری کتاب پر ایمان لایا اس کے لیے دو اجر ہیں۔ اور جو تمہاری کتاب پر ایمان نہیں لایا اس کے لیے ایک اجر ہے تمہارے اجر کی طرح تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اتاری آیت {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَحْمَتِهِ} اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اللہ تم کو اپنی رحمت سے ثواب کے دو حصے دے گا اور تم کو ایک ایسا نور عطا کرے گا کہ اس کو لیے ہوئے تم چلو گے اور تم کو بخش دے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایمان والوں کے لیے نور اور مغفرت میں اضافہ فرمادیا۔ (طبرانی فی الاوسط، تفسیر در منثور)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں جن مومنوں کا یہاں ذکر ہے اس سے مراد اہل کتاب کے مومن ہیں اور انہیں دوہرا اجر ملے گا جیسے کہ سورۃ قصص کی آیت میں ہے اور جیسے کہ ایک حدیث میں آیا ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ثَلَاثَةٌ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ: رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمَنَ بِنَبِيِّهِ وَآمَنَ بِي فَلَهُ أَجْرَانِ، وَعَبْدٌ مَمْلُوكٌ أَدَّى حَقَّ اللهِ وَحَقَّ مَوَالِيهِ فَلَهُ أَجْرَانِ، وَرَجُلٌ أَدَّبَ أَمَتَهُ فَأَحْسَنَ تَأْدِيبَهَا ثُمَّ أَعْتَقَهَا وَتَزَوَّجَهَا فَلَهُ أَجْرَانِ

تین شخصوں کو اللہ تعالیٰ دوہرا اجر دے گا ایک وہ اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لایا پھر مجھ پر بھی ایمان لایا اسے دوہرا اجر ہے اور وہ غلام جو اپنے آقا کی تابعداری کرے اور اللہ کا حق بھی ادا کرے اسے بھی دو دو اجر ہیں اور وہ شخص جو اپنی لونڈی کو ادب سکھائے اور بہت اچھا ادب سکھائے یعنی شرعی ادب پھر اسے آزاد کر دے اور نکاح کر دے وہ بھی دوہرے اجر کا مستحق ہے (بخاری و مسلم)

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں لَمَّا افْتَخَرَ أَهْلُ الْكِتَابِ بِأَنَّهُمْ يُؤْتَوْنَ أَجْرَهُمْ مَرَّتَيْنِ أَنْزَلَ اللهُ هٰذِهِ الْآيَةَ فِي حَقِّ هٰذِهِ الْأُمَّةِ (ابن جریر) جب اہل کتاب اس دوہرے اجر پر

فخر کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت اس امت کے حق میں نازل فرمائی۔ پس انہیں دوہرے اجر کے بعد نور ہدایت دینے کا بھی وعدہ کیا اور مغفرت کا بھی پس نور اور مغفرت انہیں زیادہ ملی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے یہودیوں کے ایک بہت بڑے عالم سے دریافت فرمایا کہ تمہیں ایک نیکی پر زیادہ سے زیادہ کس قدر فضیلت ملتی ہے اس نے کہا ساڑھے تین سو تک، آپ نے اللہ کا شکر کیا اور فرمایا ہمیں تم سے دوہرا اجر ملا ہے۔ (تفسیر طبری) حضرت سعید نے اسے بیان فرما کر یہی آیت پڑھی اور فرمایا اسی طرح جمعہ کا دوہرا اجر ہے۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری اور یہود و نصاریٰ کی مثال اس شخص جیسی ہے جس نے چند مزدور کسی کام پر لگانے چاہے اور اعلان کیا کہ کوئی ہے جو مجھ سے ایک قیراط لے اور صبح کی نماز سے لے کر آدھے دن تک کام کرے؟ پس یہود تیار ہو گئے، اس نے پھر کہا ظہر سے عصر تک اب جو کام کرے اسے میں ایک قیراط دوں گا، اس پر نصرانی تیار ہوئے کام کیا اور اجرت لی اس نے پھر کہا اب عصر سے مغرب تک جو کام کرے میں اسے دو قیراط دوں گا پس وہ تم مسلمان ہو، اس پر یہود و نصاریٰ بہت بگڑے اور کہنے لگے کام ہم نے زیادہ کیا اور دام انہیں زیادہ ملے۔ ہمیں کم دیا گیا۔ تو انہیں جواب ملا کہ میں نے تمہارا کوئی حق تو نہیں مارا؟ انہوں نے کہا ایسا تو نہیں ہوا۔ جواب ملا کہ پھر یہ میرا فضل ہے جسے چاہوں دوں، (مسند احمد)

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مسلمانوں اور یہود و نصاریٰ کی مثال اس شخص کی طرح ہے جس نے چند لوگوں کو کام پر لگایا اجرت ٹھہرالی اور کہا دن بھر کام کر کے کہہ دیا کہ اب ہمیں ضرورت نہیں جو ہم نے کیا اس کی اجرت بھی نہیں چاہتے اور اب ہم کام بھی نہیں کریں گے، اس نے انہیں سمجھایا بھی کہ ایسا نہ کرو کام پورا کرو اور مزدوری لے جاؤ لیکن انہوں نے صاف انکار کر دیا اور کام ادھورا چھوڑ کر اجرت لئے بغیر چلتے بنے، اس نے اور مزدور لگائے اور کہا کہ باقی کام شام تک تم پورا کرو اور پورے دن کی مزدوری میں تمہیں دوں گا، یہ کام پر لگے، لیکن

عصر کے وقت یہ بھی کام سے ہٹ گئے اور کہہ دیا کہ اب ہم سے نہیں ہو سکتا ہمیں آپ کی اجرت نہیں چاہئے اس نے انہیں بھی سمجھایا کہ دیکھو اب دن باقی ہی کیارہ گیا ہے تم کام پورا کرو اور اجرت لے جاؤ لیکن یہ نہ مانے اور چلے گئے، اس نے پھر اوروں کو بلایا اور کہا لو تم مغرب تک کام کرو اور دن بھر کی مزدوری لے جاؤ چنانچہ انہوں نے مغرب تک کام کیا اور ان دونوں جماعتوں کی اجرت بھی یہی لے گئے۔ یہ ہے ان کی مثال اور اس نور کی مثال جسے انہوں نے قبول کیا۔ (بخاری شریف)

پھر فرماتا ہے یہ اس لئے کہ اہل کتاب یقین کر لیں کہ اللہ جسے دے یہ اس کے لوٹانے کی اور جسے نہ دے اسے دینے کی کچھ بھی قدرت نہیں رکھتے اور اس بات کو بھی وہ جان لیں کہ فضل و کرم کا مالک صرف وہی پروردگار ہے، اس کے فضل کا کوئی اندازہ و حساب نہیں لگا سکتا۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ، اللہ تعالیٰ کی دستگیری اور یاوری سے آج سورۃ الحدید کے چیدہ و چنیدہ مقامات کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی، اللہ تعالیٰ اسے ہمارے لیے اور والدین ماجدین کے لیے، ہمارے اساتذہ و مشائخ کے لیے، ہمارے دوست احباب کے لیے، ہمارے معاونین و مساعدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، ہماری نجات کا سامان بنائے، اس کاوش کو قیامت تک جاری و ساری رکھے۔ آمین بحرمۃ النبی الکریم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی (کان اللہ لہ)

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

۱۴ اگست ۲۰۱۸ء، بمطابق ۲۱ ذی قعدہ ۱۴۳۹ھ بروز ہفتہ، ڈھائی بجے سہ پہر

☆☆☆☆

تعارف سورۃ المجادلہ

سوال سورۃ المجادلہ کا تعارف کروایئے۔

جواب یہ مدنی سورت ہے، ترتیب مصحف کے لحاظ سے ۵۸ویں نمبر پر ہے، یہ ۲۲ آیات اور ۳ رکوع پر مشتمل ہے، یہ ۴۷۵ کلمات اور ۲۰۴۶ حروف پر مشتمل ہے۔

وجہ تسمیہ: سورۃ المجادلہ کو اس نام سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ اس کی ابتدا ایک عورت کی "مجادلہ" یعنی بحث و گفتگو سے ہوئی، جو اپنے شوہر کے معاملے میں رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی، اس عورت کا نام خولہ بنت ثعلبہ تھا اور اس کے شوہر کا نام اوس بن صامت تھا، اس نے اپنے شوہر کے ظہار (یعنی بیوی کو ماں کی پشت کی طرح قرار دینا، جو جاہلیت میں طلاق کی ایک قسم تھی) کے مسئلے پر رسول اللہ ﷺ سے بحث کی اور اللہ تعالیٰ نے اس کی فریاد سن لی۔

اس سورت کو "المجادلہ" اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس میں اس عورت کی بحث و گفتگو کا ذکر ہے۔ بعض مصاحف میں اسے "سورۃ الظہار" بھی کہا گیا ہے۔

شان نزول: سورۃ المجادلہ مدنی سورت ہے اور اس کے نزول کا پس منظر یہ ہے کہ خولہ بنت ثعلبہ اپنے شوہر اوس بن صامت کے ظہار کے مسئلے پر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی اور شکایت کی، اس نے کہا: "یارسول اللہ! اس نے میری جوانی کھالی، میرے بچے پیدا کیے، اب جب میں بوڑھی ہو گئی تو اس نے مجھ پر ظہار کر دیا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اب تم اس پر حرام ہو گئی ہو، خولہ نے کہا: میرے بچے ہیں، اگر میں انہیں اس کے پاس چھوڑ دوں تو ضائع ہو جائیں گے اور اگر اپنے پاس رکھوں تو بھوکے مر جائیں گے، اس کی فریاد پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمائیں اور ظہار کے مسئلے کا شرعی حل بیان کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں، الحمد للہ جس نے اپنی سماعت کو ہر آواز کے لیے وسیع کیا، میں رسول اللہ ﷺ کے پاس تھی اور خولہ کی باتیں سن رہی تھی، بعض باتیں مجھ پر مخفی رہیں، لیکن اللہ نے

سات آسمانوں کے اوپر سے اس کی بات سن لی۔

سورۃ المجادلہ کے اہم مضامین ① ظہار اور اس کی شرعی حیثیت: سورت کے آغاز میں ظہار کی مذمت اور اس کی شرعی حیثیت بیان کی گئی ہے۔ ظہار کو جاہلیت کی رسم قرار دیا گیا اور اس کی کفارہ مقرر کی گئی: غلام آزاد کرنا۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو دو ماہ مسلسل روزے۔ اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا، یہ سب اس لیے ہے کہ لوگ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائیں اور اس کی حدود کو پہچانیں۔

② اللہ کی صفات، سورت میں اللہ تعالیٰ کی صفات "سمیع" اور "بصیر" (سننے والا اور دیکھنے والا) کو بار بار ذکر کیا گیا، تاکہ واضح ہو کہ اللہ بندوں کی فریاد سنتا اور ان کے حالات سے باخبر ہے۔

③ آداب گفتگو اور مجالس، سورت میں مسلمانوں کو مجالس اور گفتگو کے آداب سکھائے گئے ہیں، جیسے مجلس میں جگہ دینا، بات چیت میں عدل و انصاف، اور نجویٰ (سرگوشی) کے آداب۔ ④ منافقین اور یہود کی مذمت، سورت میں منافقین اور یہود کی سازشوں اور ان کے باہمی تعلقات کی مذمت کی گئی ہے، اور مسلمانوں کو ان سے دور رہنے کی تلقین کی گئی ہے۔ ⑤ صدقات اور مجلس نبوی کے آداب، مسلمانوں کو رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص مجلس میں صدقہ دینے کی ترغیب دی گئی، اور اس حکم کے بعد اس میں تخفیف بھی کی گئی۔ ⑥ اللہ کی قدرت اور علم، سورت میں اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت کا بیان ہے کہ وہ ہر چیز سے باخبر ہے، چاہے وہ چھپ کر ہو یا ظاہر۔

المختصر: سورۃ المجادلہ مدنی سورت ہے، اس کا نام اس عورت کی بحث و گفتگو کی وجہ سے رکھا گیا جس نے اپنے شوہر کے ظہار کے مسئلے پر رسول اللہ ﷺ سے فریاد کی، اس سورت میں ظہار کے مسئلے کا شرعی حل، اللہ کی صفات، آدابِ گفتگو، منافقین کی مذمت، صدقات اور اللہ کی قدرت و علم جیسے اہم مضامین بیان کیے گئے ہیں۔ اس سورت کا پیغام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر فریاد سنتا ہے اور اس کے احکام میں حکمت اور رحمت ہے۔

سورۃ المجادلہ

خولہ کی شکایت سات آسمانوں پر

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ اس آیت میں کس خاتون کا ذکر ہے جس کی بات اللہ تعالیٰ نے سنی؟ اور یہ خاتون اللہ کی بارگاہ میں کیا شکایت کر رہی تھیں؟

قَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّتِیْ تُجَادِلُكَ فِیْ زَوْجِهَا وَتَشْتَكِیْۤ اِلَى اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ یَسْمَعُ تَحَاوُرَكُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیْعٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۱﴾ المجادلة.

جواب ترجمہ: بیشک اللہ تعالیٰ نے اس عورت کی بات سن لی جو آپ سے اپنے شوہر کے معاملہ میں جھگڑتی تھی، اور اللہ تعالیٰ سے شکایت کر رہی تھی، اور اللہ تعالیٰ تم دونوں کی گفتگو سن رہا تھا، بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اس سورت کی ابتدائی آیات کے نزول کا سبب ایک خاص واقعہ ہے کہ حضرت اوس بن الصامت رضی اللہ عنہ نے ایک مرتبہ اپنی بیوی خولہ کو یہ کہہ دیا کہ اَنتِ عَلَیَّ کَظَھرِ اُمِّی تو میرے حق میں ایسی ہے جیسے میری ماں کی پشت یعنی حرام ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے زمانہ جاہلیت میں یہ لفظ ابدی اور دائمی حرمت کے لئے بولے جاتے تھے، جو طلاق مغلظہ سے بھی زیادہ سخت ہے، حضرت خولہ یہ واقعہ پیش آنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس کا حکم شرعی معلوم کرنے کے لئے حاضر ہوئیں، اس وقت تک اس خاص مسئلے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر کوئی وحی نازل نہ ہوئی تھی، اس لئے آپ نے قول مشہور کے موافق ان سے فرمادیا مَا اَرَاكِ اِلَّا قَدْ حَرَّمتِ عَلَیہِ یعنی میری رائے میں تو تم اپنے شوہر پر حرام ہو گئیں۔

وہ یہ سن کر واویلا کرنے لگیں کہ میری جوانی سب اس شوہر کی خدمت میں ختم ہو گئی، اب بڑھاپے میں انہوں نے مجھ سے یہ معاملہ کیا، میں کہاں جاؤں؟ میرا اور میرے بچوں کا گزارہ کیسے ہو گا؟

اور ایک روایت میں ہے کہ خولہ نے یہ عرض کیا کہ مَا ذَکَرَ طَلَاقًا یعنی میرے شوہر نے طلاق کا تو نام بھی نہیں لیا تو پھر طلاق کیسے ہو گئی؟ اور ایک روایت میں ہے کہ خولہ نے اللہ تعالیٰ سے فرمایا کہ اَللّٰھُمَّ إِنِّی أَشْکُو إِلَیْکَ (اے اللہ! میں تجھ سے شکایت کرتی ہوں) اور ایک روایت میں ہے کہ آپ نے خولہ سے یہ فرمایا مَآ اُمِرْتُ فِی شَانِکِ بِشَیٍ حَتّٰی الآن یعنی ابھی تک تمہارے مسئلے کے متعلق مجھ پر کوئی حکم نازل نہیں ہوا (ان سب روایات میں کوئی تضاد و تعارض نہیں، سبھی اقوال صحیح ہو سکتے ہیں) اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، (کذا فی الدر المنثور و ابن کثیر بحوالہ تفسیر معارف القرآن)

اس لئے اس سورت کی ابتدائی آیات میں اس خاص مسئلے کا جس کا نام ظہار ہے حکم شرعی بیان فرمایا گیا، جس میں حق تعالیٰ نے حضرت خولہ کی فریاد سنی اور ان کے لئے آسانی فرما دی، ان کی وجہ سے حق تعالیٰ نے قرآن میں یہ مستقل احکام نازل فرما دیئے، اسی لئے حضرات صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

اپنی خلافت کے زمانہ میں ایک روز فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مجمع کے ساتھ چلے جا رہے تھے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ گدھے پر سوار تھے، اس عورت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو روکا، بہت دیر تک روکے رکھا، یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کوئی وعظ و نصیحت کی باتیں کہہ رہی تھیں۔

اس عورت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اے عمر! تو وہی تو ہے جسے عمیر کہا جاتا تھا، پھر تجھے عمر کہا جانے لگا، پھر تجھے امیر المومنین کہا جانے لگا، اے عمر! تو اللہ سے ڈر، اس لیے کہ جسے موت کا یقین ہے اسے فوت ہونے کا ڈر نہیں، جسے حساب کا یقین ہے اسے عذاب کا ڈر نہیں ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کھڑے کھڑے یہ باتیں سنتے رہے، اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ساتھیوں نے ان سے کہا کہ اے امیر المومنین! کیا آپ اس بڑھیا کی خاطر اس قدر کھڑے رہے، اس پر حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا وَیْحَکَ! وَتَدْرِی مَنْ ھٰذِہٖ؟ قَالَ: لَا. قَالَ: ھٰذِہِ امْرَأَۃٌ سَمِعَ اللّٰہُ شَکْوَاھَا مِنْ فَوْقِ سَبْعِ سموات، ھٰذِہِ خَوْلَۃُ بِنْتُ ثَعْلَبَۃَ، وَاللّٰہِ لَوْ لَمْ تَنْصَرِفْ عَنِّی إِلَی اللَّیْلِ مَا

انْصَرَفْتُ عَنْهَا حَتّٰى تَقْضِيَ حَاجَتَهَا إِلَى أَنْ تَحْضُرَ صَلَاةٌ فَأُصَلِّيَهَا، ثُمَّ أَرْجِعَ إِلَيْهَا حَتّٰى تَقْضِيَ حَاجَتَهَا (الدارمی، قرطبی) خبر ہے یہ کون ہے ؟ اس نے کہا کہ نہیں، فرمایا کہ یہ وہ عورت ہے جس کی بات اللہ تعالیٰ نے سات آسمانوں کے اوپر سنی، یہ خولہ بنت ثعلبہ ہیں، اللہ کی قسم ! اگر یہ عورت رات تک مجھ سے چلی نہ جاتی تو میں بھی اس کا مسئلہ حل کیے بغیر واپس نہ ہوتا، یہاں تک کہ نماز کا وقت ہو جاتا اور میں نماز ادا کرتا، پھر نماز کے بعد میں اس کی طرف واپس آتا، یہاں تک کہ اس کا مسئلہ حل کر دیتا۔

اس عورت کے نام کے بارے میں ایک قول یہ کیا گیا کہ یہ خولہ بن صامت تھیں، مگر ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے خولہ بنت ثعلبہ درست قرار دیا ہے، جو اوس بن صامت کی بیوی تھیں۔ حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ یہ عورت جس کا ذکر اس آیت میں ہے وہ حضرت اوس ابن الصامت کی بیوی خولہ بنت ثعلبہ ہیں، جن کے شوہر نے ان سے ظہار کر لیا تھا اور یہ اس کی شکایت کے لئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔

حق تعالیٰ نے اس کو یہ عزت بخشی کہ اس کے جواب میں قرآن کی یہ آیات نازل ہوئیں اور ان میں صرف ظہار کا حکم شرعی اور اس کی تکلیف دور کرنے کا انتظام ہی نہیں فرمایا بلکہ اس کی دلداری کے لئے شروع کلام میں فرما دیا کہ ہم اس عورت کی باتیں سن رہے تھے، جو اپنے شوہر کے معاملہ میں آپ سے مجادلہ کر رہی تھی۔

مجادلہ سے مراد وہ جھگڑا جس سے مراد ایک مرتبہ جواب دے دینے کے باوجود اپنی تکلیف کو بار بار بیان کر کے آپ کو متوجہ کرنا۔

اور بعض روایات میں یہ بھی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے جب ان کو یہ جواب دیا کہ تمہارے معاملہ میں مجھ پر کوئی حکم اللہ کا نازل نہیں ہوا تو اس پر غم زدہ کی زبان سے یہ نکلا کہ یوں تو آپ پر ہر چیز کے حکم نازل ہوتے رہتے ہیں میرے بارے میں کیا ہوا کہ وحی بھی رک گئی ؟ (قرطبی)

بیوی کو ماں کہنا یا ماں کی طرح کہنا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِہِمۡ مَّا ہُنَّ اُمَّہٰتِہِمۡ ؕ اِنۡ اُمَّہٰتُہُمۡ اِلَّا الّٰٓیۡ وَلَدۡنَہُمۡ ؕ وَ اِنَّہُمۡ لَیَقُوۡلُوۡنَ مُنۡکَرًا مِّنَ الۡقَوۡلِ وَ زُوۡرًا ؕ وَ اِنَّ اللّٰہَ لَعَفُوٌّ غَفُوۡرٌ {۲} المجادلہ

جواب ترجمہ: تم میں سے جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں (ان کے اس عمل سے) وہ بیویاں ان کی مائیں نہیں ہو جاتیں۔ ان کی مائیں تو وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنم دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ ایسی بات کہتے ہیں جو بہت بری ہے، اور جھوٹ ہے۔ اور اللہ بہت معاف کرنے والا، بہت بخشنے والا ہے۔

اَلَّذِیۡنَ یُظٰہِرُوۡنَ مِنۡکُمۡ مِّنۡ نِّسَآئِہِمۡ مَّا ہُنَّ اُمَّہٰتِہِمۡ : مفسرین کے مطابق "ظہار" عرب جاہلیت کی ایک رسم تھی جس میں شوہر اپنی بیوی سے کہتا: تو میرے لیے ایسے ہے جیسے میری ماں کی پیٹھ یعنی بیوی اس پر ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی، اللہ تعالیٰ نے اس رسم کو باطل قرار دیا اور فرمایا کہ بیوی کو ماں قرار دینے سے وہ ماں نہیں بن جاتی۔

لغوی و شرعی پہلو: امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ظہار کا لفظ ظَہۡرٌ (پیٹھ) سے نکلا ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ شوہر بیوی کو اپنی ماں کی پیٹھ کی طرح قرار دے، یعنی اس پر ہمیشہ کے لیے حرام سمجھ لے، اللہ نے اس رسم کو منکر اور جھوٹ قرار دیا۔

اِنۡ اُمَّہٰتُہُمۡ اِلَّا الّٰٓیۡ وَلَدۡنَہُمۡ : مفسرین کرام رحمہم اللہ نے وضاحت کی کہ بیوی کو ماں کہنا یا اس کے ساتھ ماں جیسا معاملہ کرنا حقیقت میں نہ تو اسے ماں بناتا ہے اور نہ ہی اس پر ماں جیسے احکام لاگو ہوتے ہیں، صرف وہی عورت ماں ہے جس نے جنا ہے۔

وَ اِنَّہُمۡ لَیَقُوۡلُوۡنَ مُنۡکَرًا مِّنَ الۡقَوۡلِ وَ زُوۡرًا : یہاں اللہ تعالیٰ نے ظہار کی مذمت کی ہے، اللہ

تعالیٰ نے ظہار کو "منکر" (بہت برا اور ناپسندیدہ قول) اور "زوراً" (جھوٹ اور باطل بات) قرار دیا ہے، یعنی یہ نہ عقل میں آتی ہے، نہ شریعت میں اس کی کوئی حقیقت ہے اور نہ ہی حقیقت میں بیوی ماں بن سکتی ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ: آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت "عفو" (معاف کرنے والا) اور "غفور" (بخشنے والا) بیان کی، یعنی اگر کسی سے یہ غلطی ہو جائے اور وہ توبہ کرے یا کفارہ ادا کرے تو اللہ اسے معاف فرما دیتا ہے۔

ظہار کا شرعی حکم

سوال اسلامی تعلیمات میں ظہار کا کیا حکم ہے؟ قرآنی آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَالَّذِيْنَ يُظٰهِرُوْنَ مِنْ نِّسَآىِٕهِمْ ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا قَالُوْا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ؕ ذٰلِكُمْ تُوْعَظُوْنَ بِهٖ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ {۳} فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّتَمَآسَّا ۚ فَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ؕ ذٰلِكَ لِتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ؕ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ {۴} المجادلة.

جواب ترجمہ: اور جو لوگ اپنی بیویوں سے ظہار کرتے ہیں پھر انہوں نے جو کچھ کہا ہے، اس سے رجوع کرتے ہیں، تو ان کے ذمے ایک غلام آزاد کرنا ہے، قبل اس کے کہ وہ (میاں بیوی) ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ یہ ہے وہ بات جس کی تمہیں نصیحت کی جا رہی ہے، اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ پھر جس شخص کو غلام میسر نہ ہو، اس کے ذمے دو متواتر مہینوں کے روزے ہیں، قبل اس کے کہ وہ (میاں بیوی) ایک دوسرے کو ہاتھ لگائیں۔ پھر جس کو اس کی بھی استطاعت نہ ہو اس کے ذمے ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے۔ یہ اس لئے تاکہ تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور یہ اللہ کی مقرر کی ہوئی حدیں ہیں اور کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہاں سے ظہار کا حکم بیان فرمایا جارہا ہے اور وہ یہ کہ ظہار کے بعد میاں بیوی کے لئے اپنے مخصوص تعلقات یعنی جماع بوس وکنار وغیرہ جائز نہیں رہتے، البتہ ظہار سے رجوع ہو سکتا ہے، جس کے بعد میاں بیوی والے تعلقات بحال ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے لئے کفارہ ادا کرنا ضروری ہے۔

ان آیتوں میں کفارہ یہ بیان فرمایا گیا ہے کہ اگر کسی کے لئے ایک غلام کو آزاد کرنا ممکن ہو تو اس کے ذمے واجب ہے کہ وہ غلام آزاد کرنے کی صورت میں کفارہ ادا کرے؛ لیکن اگر کسی کو غلام کی قدرت نہ ہو (جیسے کہ آج کل غلاموں کا وجود ہی نہیں رہا) تو اس کو دو مہینے متواتر روزے رکھنے ہوں گے۔

اور اگر کوئی شخص بڑھاپے یا بیماری وغیرہ کی وجہ سے روزے بھی نہ رکھ سکے تو وہ ساٹھ مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلا دے، تو اس سے بھی کفارہ ادا ہو جاتا ہے، کفارہ ادا کرنے کے بعد میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے حلال ہو جاتے ہیں۔ (آسان ترجمہ مفتی تقی عثمانی)

عارف باللہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمہ اللہ اپنی تفسیر مظہری میں مسئلہ ظہار پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ظہار کا معنی ہے کسی شخص کا اپنی بی بی سے یہ کہہ دینا کہ تو میرے لیے ایسی (ہی حرام) ہے جیسی میری ماں کی پشت۔

جاہلیت کے زمانہ میں اس کو طلاق مانا جاتا تھا اور اس سے وہ عورت اپنے شوہر کے لیے ہمیشہ کے واسطے حرام ہو جاتی تھی، شریعت نے ظہار کو حرمت دوامی کا موجب قرار نہیں دیا بلکہ ایک خاص وقت تک ایسی عورت کو حرام کر دیا، کفارہ ادا کرنے کے بعد ظہار والی عورت حرام نہیں رہتی، شوہر کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔

ظِهَار، **ظَهر** سے مشتق ہے (ظہر کا معنی ہے پیٹھ) لیکن فقہاء نے عورت کے بدن کے ہر اس حصہ کو جس کو کھلا رکھنا حرام ہے جیسے ران یا شرمگاہ وغیرہ ظہر کے حکم میں شامل کر دیا ہے بلکہ امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک تو اپنی بی بی کو اپنی ماں کے کسی حصہ بدن سے بھی تشبیہ دینا جو واجب الستر نہ ہو اور

جس کو دیکھنا اس کے لیے جائز ہو جیسے ہاتھ، آنکھ وغیرہ ظہار کے حکم میں داخل ہے، اسی طرح بی بی کو اپنی دادی، نانی، بیٹی، پھوپھی، خالہ یا ایسی غیر عورت سے تشبیہ دینا جس سے نکاح کرنا ہمیشہ کے لیے اس پر حرام ہے موجب ظہار ہے۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ کے نزدیک اگر اپنی بیوی کو اپنی دودھ پلانے والی ماں یا اپنے باپ کی منکوحہ سے تشبیہ دی تو ظہار کا حکم نہ ہو گا کیونکہ یہ حرمت نکاح عارض کی وجہ یعنی دودھ پلانے والی ماں یا باپ کی زوجہ ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے لیکن امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ان عورتوں سے تشبیہ بھی موجب ظہار ہے کیونکہ ان عورتوں سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے۔

اسی طرح اگر اپنی عورت کے کسی غیر معین حصہ کو یا ایسے عضو کو جو کل کے قائم مقام مانا جاتا ہے تشبیہ دی تب بھی ظہار کا حکم جاری ہو گا۔ مثلاً یوں کہا: میرے لیے تیرا سر یا تیری شرمگاہ یا تیرا چہرہ یا تیری گردن یا تیرا بدن یا تیرا جسم یا تیری جان یا تیرا نفس یا تیرا آدھا بدن یا تیرا ایک تہائی بدن میری ماں کی پشت کی طرح ہے کیونکہ ان الفاظ میں سے بعض ایسے ہیں کہ ان کو بول کر پوری شخصیت مراد ہوتی ہے یا ایسے اجزاء بدن ہیں جو غیر معین ہیں (مثلاً تیرا آدھا بدن یا تیرا ایک تہائی بدن وغیرہ) اس صورت میں حکم سارے جسم کی طرف متعدی ہے۔

ہاں! اگر یوں کہا کہ تیرا ہاتھ یا تیرا پاؤں میرے لیے میری ماں کی پشت کی طرح ہے تو ظہار نہ ہو گا۔ شافعی کا ظاہر قول اس کے خلاف ہے، اگر کسی نے اپنی بی بی سے کہا: تو میرے لیے ایسی ہے جیسی میری ماں یا یوں کہا کہ تو میرے لیے میری ماں کی مثل ہے، تو تعیین مراد نیت پر موقوف ہو گی اور نیت کے مطابق حکم ہو گا۔

اگر ان الفاظ سے بی بی کی تکریم اور اعزاز کی نیت ہو گی تو اس کی تکذیب نہیں کی جائے گی کیونکہ اپنی ماں کے ساتھ تعظیم و اعزاز میں کسی کو تشبیہ دینا بکثرت کلام میں مستعمل ہے اور ظہار کی نیت ہو گی تو اس کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ جب پورے جسم مادر سے تشبیہ دی تو بعض اعضاء سے بھی تشبیہ

ہو جائے گی، کل بول کر جزء مراد ہو سکتا ہے لیکن صریح نہ ہونے کی وجہ سے نیت کی ضرورت ہے اور اگر اس جملہ سے اس کی نیت طلاق کی ہو گی تو طلاق بائن پڑ جائے گی، اس وقت یہ مراد ہو گی کہ تو میرے لیے میری ماں کی طرح حرام ہے اور اگر کچھ نیت نہ ہو تو کلام لغو مانا جائے گا۔ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک بالکل کوئی نیت نہ ہونے کی صورت میں بھی ظہار ہو جائے گا۔ (تفسیر مظہری)

کتب فقہ میں ظہار سے متعلق بڑی تفصیل سے مسائل لکھے گئے ہیں، حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی مشہور زمانہ کتاب بہشتی زیور میں بھی ظہار سے متعلق مسائل تحریر کیے گئے ہیں، ان میں سے چند مسائل ہم یہاں نقل کرتے ہیں، اسی طرح فقہ حنفی کی اکثر و بیشتر کتابوں میں یہ مسائل موجود ہیں۔

مسئلہ ۔ نابالغ لڑکے اور پاگل آدمی کے ظہار کا اعتبار نہیں ہے۔

مسئلہ ۔ اگر کوئی غیر عورت سے ظہار کرے جس سے ابھی نکاح نہیں کیا تو بھی کچھ نہیں ہوا، اب اس سے نکاح کرنا درست ہے۔

مسئلہ ۔ ظہار کا حکم یہ ہے کہ عورت رہے گی تو اسی کے نکاح میں لیکن مرد جب تک اس کا کفارہ ادا نہ کرے تب تک صحبت کرنا، شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانا، منہ چومنا، پیار کرنا حرام ہے۔ جب تک کفارہ نہ دے گا تب تک وہ عورت حرام رہے گی، چاہے جتنے برس گزر جائیں، جب مرد کفارہ دے دے تو دونوں میاں بیوی کی طرح رہیں، پھر سے نکاح کرنے کی ضرورت نہیں اور اس کا کفارہ اسی طرح دیا جاتا ہے جس طرح روزہ توڑنے کا کفارہ دیا جاتا ہے۔

مسئلہ ۔ اگر کفارہ دینے سے پہلے ہی صحبت کر لی تو بڑا گناہ ہوا، اللہ تعالیٰ سے توبہ واستغفار کرے اور اب سے پکا ارادہ کرے کہ اب بغیر کفارہ دیے پھر کبھی صحبت نہ کروں گا، اور عورت کو چاہیے کہ جب تک مرد کفارہ نہ دے تب تک اس کو اپنے پاس نہ آنے دے۔

مسئلہ ۔ جب تک کفارہ نہ دے تب تک دیکھنا، بات چیت کرنا حرام نہیں البتہ شرمگاہ کو دیکھنا جائز نہیں۔

مسئلہ۔ اگر کئی بیویوں سے ایسا کہا تو جتنوں سے کہا ہے اتنے کفارے دے۔

مسئلہ ۔ کفارے میں روزے رکھنے کی طاقت تھی اور روزے رکھنے شروع کر دیے تو اب جب تک روزے ختم نہ ہو جائیں تب تک اس عورت سے صحبت نہ کرے، اگر روزے ختم ہونے سے پہلے اسی عورت سے صحبت کر لی تو سب روزے پھر سے رکھے، چاہے دن میں اس عورت سے صحبت کی یا رات میں اور چاہے قصداً ایسا کیا ہو یا بھول سے سب کا ایک ہی حکم ہے۔

مسئلہ ۔ اگر روزوں کی طاقت نہ تھی اور ساٹھ مسکینوں کو دو وقت کھانا کھلانے لگا، اگر سب فقیروں کو ابھی نہیں کھلا چکا تھا کہ بیچ میں صحبت کر لی تو گناہ ہوا مگر اس صورت میں کفارہ دوہرا نا نہ پڑے گا۔

مسئلہ ۔ کسی کے ذمہ ظہار کے دو کفارے تھے اس نے ساٹھ مسکینوں کو چار چار سیر گیہوں دے دیے اور یہ سمجھا کہ ہر کفارے سے دو سیر دیتا ہوں اس لیے دونوں کفارے ادا ہو گئے، تب بھی ایک ہی کفارہ ادا ہوا، دوسرا کفارہ پھر دے اور اگر ایک کفارہ روزہ توڑنے کا تھا، دوسرا ظہار کا اس میں ایسا کیا تو دونوں ادا ہو گئے۔

مسئلہ ۔ اگر ظہار میں چار مہینے یا اس سے زیادہ مدت تک صحبت نہ کی اور کفارہ نہ دیا تو طلاق نہیں پڑی، اس سے ایلاء نہیں ہوتا۔

مسئلہ ۔ اگر ہمیشہ کے لیے ظہار نہیں کیا بلکہ کچھ مدت مقرر کر دی جیسے یوں کہا سال بھر کے لیے یا چار مہینے کے لیے تو میرے لیے ماں کے برابر ہے تو جتنی مدت مقرر کی ہے اتنی مدت تک ظہار رہے گا اور اگر اس مدت کے اندر صحبت کرنا چاہے تو کفارہ دے اور اگر مدت کے بعد صحبت کرے تو کچھ نہ دینا پڑے گا، عورت حلال ہو جائے گی۔

مسئلہ۔ ظہار کا لفظ اگر کئی دفعہ کہے جیسے دو دفعہ یا تین دفعہ یہی کہا کہ تو میرے لیے ماں کے برابر ہے تو جتنی دفعہ کہا ہے اتنے کفارے دینے پڑیں گے۔ البتہ اگر دوسری اور تیسری مرتبہ کہنے سے خوب مضبوط اور پکے ہو جانے کی نیت کی ہو نئے سرے سے ظہار کرنا مقصود نہ ہو تو ایک ہی کفارہ دے۔

مسئلہ ۔ اگر یوں کہا کہ تو میرے لیے ماں کی طرح حرام ہے تو اگر طلاق دینے کی نیت کی ہو تو طلاق پڑے گی اور اگر ظہار کی نیت کی ہو یا کچھ نیت نہ کی ہو تو ظہار ہو جائے گا۔ کفارہ دے کر صحبت کرنا درست ہے اور اگر ایلاء کی نیت کی ہے تو ایلاء ہو جائے گا۔ (مسائل بہشتی زیور حصہ دوم معاملات)

مسئلہ ۔ کسی نے اپنی بیوی سے کہا تو میری ماں کے برابر ہے یا یوں کہا تو میرے لیے ماں کے برابر ہے یا تو میرے نزدیک ماں کے برابر ہے یا تو میرے نزدیک ماں کے مثل ہے، ماں کی طرح ہے تو دیکھو اس کا مطلب کیا ہے۔ اگر یہ مطلب لیا کہ تعظیم میں اور بزرگی میں ماں کے برابر ہے یا یہ مطلب لیا کہ تو بالکل بڑھیا ہے عمر میں میری ماں کے برابر ہے تب تو اس کے کہنے سے کچھ نہیں ہوا۔ اسی طرح اگر اس نے کہتے وقت کچھ نہیں کی اور کچھ مطلب نہیں لیا یوں ہی کہہ دیا تب بھی کچھ نہیں ہوا اور اگر اس کہنے سے طلاق دینے اور چھوڑنے کی نیت کی ہے تو اس کو ایک طلاق بائن پڑ گئی اور اگر طلاق دینے کی نیت نہیں تھی اور عورت کو چھوڑنا بھی مقصود نہیں تھا بلکہ مطلب فقط اتنا تھا کہ اگرچہ تو میری بیوی ہے اور اپنے نکاح سے تجھے الگ نہیں کرتا لیکن اب تجھ سے کبھی صحبت نہ کروں گا تجھ سے صحبت کرنے کو اپنے اوپر حرام کر لیا، بس روٹی کپڑا لے اور پڑی رہ تو یہ ظہار ہو گیا۔

مسئلہ ۔ اگر برابر کا لفظ نہیں کہا نہ مثل اور طرح کا لفظ کہا بلکہ یوں کہا کہ تو میری ماں ہے یا یوں کہا کہ تو میری بہن ہے تو اس سے کچھ نہیں ہوا، عورت حرام نہیں ہوئی، لیکن ایسا کہنا گناہ کی بات ہے۔

مسئلہ ۔ کسی نے یوں کہا کہ تجھ کو رکھوں تو ماں کو رکھوں یا یوں کہا کہ اگر تجھ سے صحبت کروں تو گویا ماں سے کروں تو اس سے بھی کچھ نہیں ہوا۔

مسئلہ ۔ کسی نے کہا تو میرے لیے سؤر کے برابر ہے تو اگر طلاق دینے اور چھوڑنے کی نیت تھی تب تو طلاق پڑ گئی اور اگر ظہار کی نیت کی تو کچھ نہیں ہوا۔ اسی طرح اگر کچھ نیت نہیں کی تب بھی کچھ نہیں ہوا۔

مسئلہ ۔ اگر شوہر ظہار کرنے کے بعد کفارہ نہ دیتا ہو اور اس طرح بیوی سے صحبت نہ کرتا ہو تو چونکہ چار مہینے میں ایک دفعہ صحبت ہونا عورت کا بعض حضرات کے نزدیک ازروئے قضا بھی حق ہے اور

ازروئے دیانت توسب کے نزدیک ہے، اس لیے عورت شوہر سے مطالبہ کرسکتی ہے کہ وہ کفارہ ادا کرکے اس کا حق ادا کرے۔ (مسائل بہشتی زیور)

اللہ اور رسول اللہ کی دشمنی کی سزائے دارین

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ یہاں یُحَادُّونَ اور کُبِتُوا کا کیا مطلب ہے؟

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ كُبِتُوْا كَمَا كُبِتَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ وَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ {۵} المجادلة.

جواب ترجمہ: بیشک وہ لوگ جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ذلیل کیے جائیں گے، جیسے وہ لوگ ذلیل کیے گئے جو ان سے پہلے تھے اور بلاشبہ ہم نے واضح آیات نازل کی ہیں اور کافروں کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

جو لوگ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دشمنی رکھتے ہیں، اس کی دو صورتیں ہیں ایک تو اس طرح کہ اللہ کے ولیوں کے ساتھ انسان دشمنی رکھے، اولیاء اللہ کے ساتھ دشمنی کے بارے میں تو حدیث قدسی میں واضح فرمایا گیا کہ جو میرے ولیوں کے ساتھ دشمنی رکھے گا وہ اللہ کے ساتھ دشمنی رکھے گا، دوسرا اللہ اور رسول اللہ کی دشمنی اور مخالفت اس طرح ہوتی ہے کہ اللہ اور رسول اللہ کے دین کے سامنے رکاوٹیں کھڑی کی جائیں اور اس سے روکا جائے۔

فارسی زبان میں اس کا معنیٰ ہے اللہ اور رسول ﷺ کی مخالفت کرنا، یا اس کا مطلب ہے امر و نہی کی حدود سے تجاوز کرنا، ابو مسلم اصفہانی بیان کرتے ہیں کہ محادہ باب مفاعلہ سے ہے، جو لفظ حدید سے ہے، حدید عربی میں لوہے کو کہا جاتا ہے، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو لوہے کے ساتھ مقابلہ کرتے ہیں، خواہ یہ لوہا حقیقی معنیٰ میں ہو یا سخت اور شدید قسم کی مخالفت اور لڑائی جھگڑے کی صورت میں ہو، اسے لوہے کے ساتھ لڑائی کرنے کی تشبیہ دی گئی ہے۔

بعض حضرات یہ فرماتے ہیں کہ آیت کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی حدود کو ان جگہوں پر نہیں رکھتے جن جگہوں پر انہیں رکھنا چاہیے، اس میں بادشاہوں اور امراء کے لیے سخت وعید فرمائی گئی ہے جو شرعی حدود سے ہٹ کے قوانین بناتے اور نافذ کرتے ہیں۔

پادشاہے کہ طرح ظلم افگند... پائے دیوار ملک خویش بکند

جو بادشاہ ظلم کی بنیاد رکھتا ہے وہ اپنی سلطنت کے در و دیوار ہلا کر رکھ دیتا ہے۔

امام تفسیر فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں یُحَادُّونَ میں ضمیر ممکن ہے منافقین کی طرف لوٹ رہی ہو جو کافروں کے ساتھ دوستی رکھتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف چڑھائی کرتے تھے، یا اس کی ضمیر تمام کافروں کی طرف لوٹتی ہے، جس پر اللہ تعالیٰ نے خبر دار کیا کہ یہ رسوا کر دیے جائیں گے۔

بحر العلوم ابو اللیث محمد بن نصر سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت سے مراد اولیاء اللہ کی دشمنی اور مخالفت ہے، کیونکہ کوئی بھی اللہ کے ساتھ دشمنی اور اللہ کی مخالفت نہیں کر سکتا، لیکن جس نے اولیاء اللہ کی مخالفت کی گویا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کی مخالفت کی۔ (بحر العلوم)

شیخ عبد الکریم بن ہوازن قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں آیت میں یحادون اللہ ورسولہ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو چھوڑتے ہیں، اس لیے وہ ذلیل کیے گئے اور رسوا کیے گئے، جس طرح ان سے پہلے کے کفار اور نافرمان ذلیل و رسوا کیے گئے تھے۔

اللہ تعالیٰ نے جرائم پیشہ لوگوں سے انتقام لینے کا یہی طریقہ جاری فرمایا ہے کہ جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو ضائع کیا، اور دین میں بدعات پیدا کیں وہ اس لڑی سے نکل جاتے ہیں اور ذلت کی کھائی میں جا گرتے ہیں۔ (تفسیر قشیری)

شیخ ابو جعفر النحاس رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یُحَادُّونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ کی مخالفت کرتے ہیں اور یوں وہ اس کے دشمنوں کی حدود میں چلے جاتے ہیں۔(اوضح التفاسیر)

مصری عالم علامہ سید طنطاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یُحَادُّونَ کا مطلب ہے دشمنی اور بغض رکھنا، اصل اس کا معنٰی یہ ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ آپ اس حد پر ہیں اور آپ کا دشمن اُس حد پر ہے، اسے کنایۃً دشمنی سے تعبیر کیا گیا کیونکہ دو مخالفین اور دو دشمنوں کے درمیان ایسا ہونا لازم ہے۔(الوسیط)

شیخ علامہ محمد بن امین ہروی شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں یُحَادُّونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے جن باتوں کا حکم دیا اور جن باتوں سے روکا وہ ان کی مخالفت کرتے ہیں۔(تفسیر حدائق الروح والریحان)

شیخ اسعد حومد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یُحَادُّونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ اور رسول اللہ کی مخالفت کرتے ہیں، اور اپنے لیے وہ حدود پسند کرتے ہیں جو اللہ اور رسول اللہ ﷺ نے ان کے لیے مشروع نہیں قرار دی ہیں، ان لوگوں کو رسوائی ملے گی اور عبرت کا نشان بنائے جائیں گے، دنیا میں ان کی رسوائی اور روسیاہی اس طرح ہو گی جیسے ان سے پہلے کافروں کو مل چکی ہے۔

اور ایسا کیوں نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بہت ہی واضح انداز میں اپنی آیات بیان کی ہیں، اور اپنی حدود قائم فرمائی ہیں، اور بڑی تفصیل سے اپنے احکامات جاری فرمائے ہیں، اس لیے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور ان سے انحراف کرنے کے لیے ان کے پاس کوئی معقول بہانہ اور عذر نہیں ہے، اور ان آیات کا انکار کرنے والوں کے لیے قیامت کے دن ذلت آمیز عذاب ہو گا۔((ایسر التفاسیر للحومد)

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یُحَادُّونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ کا مطلب ہے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جھگڑا کرنا۔(تفسیر در منثور لجلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ)

شیخ ابو محمد مکی اندلسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یُحَادُّونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهٗ کا مطلب یہ ہے جو لوگ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی حدود اور فرائض کی مخالفت کر کے اپنی حدود قائم کرتے ہیں، ان لوگوں کو ان سے

پہلے والے ان لوگوں کی طرح ذلیل وروسیاہ کیا جائے گا جس طرح انہیں اللہ کی مخالفت کرنے کی وجہ سے ذلیل وروسیاہ کیا گیا تھا۔(الہدایہ الی بلوغ النہایہ)

شیخ محمد طاہر تیونسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کا دین لے کر تشریف لائے ہیں، تو ان منافقین اور کافروں نے حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کی، ان کے ساتھ دشمنی کی، تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اللہ کے نبی اور رسول ہیں، ان کی مخالفت اور دشمنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ دشمنی کے مترادف ہے۔(التحریر والتنویر)

شیخ عبد الکریم یونس الخطیب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں یُحَادُّونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ اللہ کی حدود سے نکل جاتے ہیں، اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو ہلکا خیال کرتے ہیں، اس لیے انہیں ذلیل وروسیاہ کیا جائے گا، اور ان کی اہانت کی جائے گی، اس سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے حکموں کی پاسداری نہیں کرتے، جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دیا ہے انہیں حرام نہیں سمجھتے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام نہیں سمجھتے، ان کی عاقبت، ان کا انجام رسوائی، روسیاہی، ذلت اور نقصان ہے، یہ انجام ہر زمانے میں ان لوگوں کا ہوا ہے جو اللہ کی حدود سے نکلنے والے ہوتے ہیں، سورۃ الحج میں ارشاد فرمایا گیا کہ جن لوگوں کو اللہ ذلیل کردے انہیں عزت دینے والا کوئی نہیں ہے (آیت ۱۸) اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبانی یہ بات واضح فرمادی ہے کہ کافروں کو ذلت آمیز عذاب دیا جائے گا۔(التفسیر القرآنی للقرآن)

شیخ ابوزید عبد الرحمان بن محمد بن مخلوف الثعالبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت منافقین اور یہود میں سے ایک گروہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو اس انتظار میں رہتے تھے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کو کوئی گزند وتکلیف پہنچے۔(تفسیر الثعالبی)

امام تفسیر حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یُحَادُّونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ دین میں اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرتے ہیں اور ان کے ساتھ دشمنی کرتے

ہیں۔(تفسیر ابن عباس)

شیخ ابو الطیب محمد صدیق قنوجی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں محادون یعنی مخالفت اور دشمنی کرنے والوں سے مراد مکہ والے لوگ ہیں، یہ آیت غزوہ احزاب کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جو ہجرت کے چوتھے سال میں ہوا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ غزوہ احزاب ہجرت کے پانچویں سال ہوا تھا، اس سے مقصود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خوشخبری دینا تھا کہ ان کے دشمن جو لشکروں کی صورت میں آگے کی سمت بڑھ رہے ہیں وہ رسوا اور روسیاہ کیے جائیں گے، انہیں ذلت آمیز عذاب سے دوچار کیا جائے گا۔(فتح البیان)

امام تفسیر شیخ علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں رب تعالیٰ خبر دے رہے ہیں کہ جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالف کی، جنہوں نے اس کی شریعت کے ساتھ دشمنی روا رکھی تو ان کی اہانت کی جائے گی، ان پر لعنت کی جائے گی، انہیں رسوا اور روسیاہ کیا جائے گا جیسے ان سے پہلے والے ان جیسے لوگوں کے ساتھ کیا گیا تھا، اللہ تعالیٰ نے واضح آیات اور نشانیاں بیان فرمادی ہیں کہ اس کی مخالفت اور دشمنی صرف کافر لوگ ہی کرتے ہیں اور کافروں کے لیے ان کے تکبر اور استکبار کی وجہ سے دردناک عذاب ہو گا، کہ انہوں نے اللہ کی شریعت سے تکبر کیا۔(تفسیر ابن کثیر)

شیخ ابو حیان اثیر الدین اندلسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت مشرکین قریش کے بارے میں اتری ہے، جنہیں خندق کے موقع پر شکست کے ذریعے رسوا اور روسیاہ کیا گیا، جیسے ان سے پہلے ان لوگوں کو رسوا و ذلیل کیا گیا تھا جنہوں نے انبیاء و رسولوں کو قتل کیا تھا، جب اللہ تعالیٰ نے ان اہل ایمان کا ذکر کیا جو اللہ کی حدود کی پاسداری کرنے والے تھے تو ساتھ ہی محادین یعنی مخالفین و معاندین کا بھی ذکر کیا جو اللہ اور رسول اللہ کی مخالف و معاندت کرنے والے تھے، محادہ کا معنیٰ وہ دشمنی اور وہ مخالفت ہے جو حدود میں کی جائے۔(البحر المحیط)

شیخ نعمت اللہ علوان رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں يُحَادُّونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ سے مراد یہ ہے کہ وہ لوگ جو حد سے گزر جانے والے ہیں، افراط کرنے والے ہیں وہ اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت اور معاندت

کرتے ہیں، بایں طور کہ وہ ایسی حدود کی اختراع کرتے ہیں جو حدود اللہ اور رسول اللہ کی حدود کی مخالف ہوتی ہیں، بلکہ ان حدود کو وہ خود اپنی طرف سے جاری کرتے ہیں، لوگوں کو دکھلانے اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت و معاندت میں۔ (تفسیر الفواتح الالٰہیہ والمفاتح الغیبیہ)

مفسر قرآن علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر ارباب حل وعقد کی توجہ اس طرف دلاتے دکھائی دیتے ہیں کہ وہ سلطنت کے قوانین بنانے اور نافذ کرنے میں اس حد تک بااختیار ہیں کہ حدود اللہ پائمال نہ ہونے پائیں، فرماتے ہیں فوجوں کی تربیت، انہیں جنگی مشقیں کرانا، انہیں ہر قسم کا اسلحہ مہیا کرنا جس سے دشمن پر غلبہ پانے کے امکانات روشن ہوں۔

جنگ کے لیے منصوبہ بندی، میدان جنگ میں فوجوں کی نقل و حرکت کے ضابطے، ان تمام امور میں حکام وقت کو کلی اختیارات حاصل ہیں۔ مسلمانوں کے لیے جو بہتر اور مفید ہو اس کے لیے تدابیر اختیار کی جائیں۔ اسی طرح مناسب مقامات پر قلعوں کو تعمیر کرنا۔ شہروں کی حفاظت کے لیے تجاویز سوچنا بھی حکام کا کام ہے۔

وہ جرائم جن کی سزا شریعت میں مقرر نہیں ان کے لیے مناسب سزائیں مقرر کرنا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے۔ حکومت کو ان جرائم کے لیے ایسی موثر سزائیں مقرر کرنی چاہئیں جن سے جرائم کا سدباب ہو سکے، لیکن ان تعزیرات کو اتنا سخت کرنا بھی درست نہیں جو بسا اوقات قتل سے بھی زیادہ دردناک اور اذیت رساں ہوں۔ (روح المعانی)

اسی طرح کاروبار اور لین دین کے لیے ایسے قواعد وضوابط مرتب کرنا جن سے کسی شرعی حکم کی خلاف ورزی لازم نہ آتی ہو، درست ہے لیکن کوئی ایسا ضابطہ بنانا جس سے کسی شرعی حکم کی صراحتاً خلاف ورزی لازم آئے، ہرگز جائز نہیں جیسے سود کے جواز کا قول کرنا اور اس کے بغیر معاشی اور صنعتی ترقی کو محال سمجھنا یہ سب حرام ہے۔

بیت المال اور اراضی کے بارے میں جو احکام صحیح روایات سے حضور رحمت عالم ﷺ سے ثابت ہیں ان کی خلاف ورزی کسی صورت میں بھی جائز نہیں، لیکن جو احکام خلفاء کرام نے اپنے اجتہاد سے وضع کیے اگر زمانہ کے حالات کے پیش نظر ان کے بارے میں ایسے احکام وضع کیے جائیں جن میں لوگوں کے لیے آسانی اور سہولت ہو اور ان میں عوام کا فائدہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن خلفاء کے اجتہادی احکام کے بجائے ایسے جدید قوانین مرتب کرنا جن میں لوگوں کی مشقتوں میں اضافہ ہو جائے یہ کسی طرح جائز نہیں۔

وہ حدود جو اللہ تعالیٰ نے چوروں، بدکاروں اور رہزنوں کے بارے میں مقرر کی ہیں ان میں کسی قسم کا ردو بدل روا نہیں ہے۔ علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جو شخص اسلامی قوانین کو ناقص سمجھتا ہے اور ان کی تحقیر کرتا ہے اور جدید وضع کردہ قوانین کو ان سے بہتر اور زیادہ مفید کہتا ہے اس کے کفر میں شک کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں۔ انہی لوگوں کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ ان کو ذلیل ورسوا کر دیا جائے گا۔ انہیں منہ کے بل گرا دیا جائے گا جس طرح ان سے پہلے جو سرکش قومیں گزری ہیں ان کو ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا تھا۔ (تفسیر روح المعانی)

کُبِتُوا کا مطلب ہے وہ ذلیل کر دیے گئے، وہ رسوا کر دیے گئے، وہ روسیاہ کر دیے گئے، مفردات امام راغب میں ہے کہ کبت کا معنیٰ ہے کسی کو تذلیل اور تحقیر کے ساتھ دھکیلنا اور رد کرنا، لغت کی کتابوں میں اس کا معنیٰ یہ لکھا ہوا ہے کہ کسی کو پچھاڑنا، کسی کو رسوا کرنا، کسی کو توڑنا، دشمن کو غصے کے ساتھ دھکیلنا۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان کی روشنی میں اس سزا میں منافقین اور کافر سب ہی شامل ہیں، کافر اس لیے کہ ان کی اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ دشمنی ظاہر اور باطن میں ہے، کافر اندر اور باہر سے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کا مخالف ہے، جب کہ منافقین بظاہر تو اسلام اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بڑے

مخلص اور خیر خواہ دکھائی دیتے ہیں جب کہ اندر سے وہ دشمنی کرتے ہیں، مخالفت کرتے ہیں، اسلام اور رسول کریم ﷺ کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

جس طرح ان سے پہلے ماضی کے کفار اور معاندین تھے، انہوں نے رسولوں کے ساتھ دشمنی اور معاندت کی، جیسے حضرت نوح علیہ السلام کی قوم تھی، حضرت ہود علیہ السلام کی قوم تھی، حضرت صالح علیہ السلام کی قوم تھی اور ان کے علاوہ بہت سے دیگر پیغمبروں کی امتوں نے اللہ اور اللہ کے رسولوں کے ساتھ دشمنی اور بغض رکھا، ان کے احکامات کی مخالفت کی۔

علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہاں اَنْزَلْنَآ اٰيٰتٍۢ بَيِّنٰتٍ فرمایا ہے، یہ كُبِتُوا کی واؤ سے حال ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مخالفت و معاندت کے باعث ذلیل کیے گئے، حضرت سری رحمۃ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ان کمزور نافرمانوں اور گناہ گاروں پر بہت ہی تعجب ہوتا ہے جو ایک قوی اور مضبوط ذات کی مخالفت اور دشمنی کرتے ہیں، ان سے پوچھا گیا کہ حضرت! یہ کیسے؟ تو فرمانے لگے کہ اللہ تعالیٰ نے اس انسان کو کمزور پیدا کیا ہے۔

رسوا کیے گئے، درانحالیکہ میں نے واضح نشانیاں اتاری ہیں، ان لوگوں کے بارے میں جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی ان سے پہلے مخالفت اور معاندت کی تھی، جو کچھ ہم نے ان کے ساتھ کیا اس امت کے کافروں، معاندوں اور مخالفوں کے ساتھ بھی ایسا ہی کریں گے۔

اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو آیات کا انکار کرتے ہیں، ان کو حق تسلیم نہیں کرتے، یہ خیال رہے کہ جاحد اور تارک میں فرق ہے، ترک احکام سے انسان گنہ گار ضرور ہو جاتا ہے، لیکن کافر نہیں ہوتا، البتہ اگر احکام الٰہیہ کا انکار کرے اور ان کی حقانیت کو تسلیم نہ کرے تو یقیناً کافر ہے۔

الكبت: سرع الشيئ لوجهه، کسی چیز کو منہ کے بل گرا دینا۔ یہ ذلت و رسوائی کی انتہا ہے۔

ان واضح اور واشگاف آیات کا انکار کرنے والے کافروں کے لیے واضح فرمایا گیا کہ دنیا میں ذلت، تحقیر اور رسوائی ہے، جب کہ آخرت میں ان کے لیے ذلت آمیز عذاب ہے، ذلت آمیز عذاب سے

ابتدا میں انہیں پالا پڑے گا، یا ابتدا میں تو انہیں عَذَابٌ اَلِیمٌ یعنی دردناک عذاب سے دوچار کیا جائے گا، دوسرے درجے میں انہیں اہانت آمیز عذاب سے دوچار کیا جائے گا۔ (تفسیر روح البیان)

علامہ اسماعیل حقی رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت میں رسوائی، روسیاہی، ذلت اور تذلیل کا مصداق ان لوگوں کو بتایا ہے جو مظاہر اللہ اور مظاہر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دشمنی اور مخالفت کرتے ہیں، مظاہر اللہ سے مراد اولیاء اللہ ہیں، جو اللہ کے نام کی خاطر جمع ہوتے ہیں، اور مظاہر رسول سے مراد علماء کرام ہیں جو شرعی احکامات کے ساتھ کھڑے رہتے ہیں، جو شرعی احکامات کو پوری جرات وہمت کے ساتھ بیان کرتے اور غالب کرتے ہیں، دلائل وبراہین کے انبار لگادیتے ہیں، یہ کام ان کی ظاہری کرامت میں سے ہے، جب کہ علوم کی نشرواشاعت کرتے ہیں، اس لیے جو ان کی مخالفت اور معاندت کرے گا اسے ذلت آمیز عذاب سے دوچار کیا جائے گا۔ (روح البیان)

قیامت کے دن سب اٹھائے جائیں گے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ شَهِیْدٌ ﴿٦﴾ المجادلة

جواب ترجمہ: اس دن جب اللہ ان سب کو دوبارہ زندہ کرے گا، پھر انھیں بتائے گا کہ انھوں نے کیا کچھ کیا تھا۔ اللہ نے اسے گن گن کر محفوظ رکھا ہے، اور یہ اسے بھول گئے ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا گواہ ہے۔

یَوْمَ یَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِیْعًا: اس آیت میں اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کا ذکر فرمارہے ہیں کہ وہ دن جب اللہ تعالیٰ سب لوگوں کو (خواہ وہ پہلے گزر چکے ہوں یا بعد میں آئے ہوں) قبروں سے اٹھائے گا اور سب کو ایک ہی میدان میں جمع کرے گا۔ اس میں سب انسان شامل ہوں گے، کوئی بھی باقی نہیں رہے گا۔

فَیُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا ؕ: یعنی اللہ تعالیٰ انہیں ان کے تمام اعمال سے آگاہ کرے گا، چاہے وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، نیک ہوں یا بد، اس سے مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال کو ان کے سامنے بیان

کرے گا، ان پر حجت قائم کرے گا اور ان کے اعمال کو ظاہر کرے گا، تاکہ ان پر کوئی عذر باقی نہ رہے۔

اَحْصٰىهُ اللّٰهُ وَنَسُوْهُ: یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کے تمام اعمال کو شمار کر رکھا ہے، ان میں سے کوئی بھی عمل اس کے علم اور ریکارڈ سے باہر نہیں، اگرچہ یہ لوگ خود اپنے بہت سے اعمال کو بھول چکے ہوں گے، یا انہوں نے ان اعمال کو معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا ہو گا، لیکن اللہ تعالیٰ نے سب کچھ محفوظ کر رکھا ہے۔ جیسا کہ قرآن میں ہے **وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَا لِهٰذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا** (الکہف: ۴۹) اور نامۂ اعمال رکھ دیا جائے گا، پھر تم مجرموں کو دیکھو گے کہ اس (کے اندراجات) سے ڈر رہے ہوں گے اور کہیں گے ہائے ہماری بد بختی! اس کتاب کو کیا ہوا ہے کہ یہ نہ کوئی چھوٹی بات چھوڑتی ہے اور نہ بڑی، مگر اسے شمار کر رکھا ہے اور جو کچھ انہوں نے کیا ہو گا اسے اپنے سامنے حاضر پائیں گے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ: یعنی اللہ تعالیٰ ہر چیز پر گواہ ہے، اس سے کوئی چیز مخفی نہیں، وہ ہر عمل کو جانتا اور دیکھتا ہے، اس کا علم کامل اور محیط ہے۔ اس جملے میں اللہ تعالیٰ کی شہادت اور علم کی وسعت کو بیان کیا گیا ہے کہ وہ ہر چھوٹے بڑے عمل کو جانتا ہے اور اس پر گواہ ہے۔

اس آیت میں قیامت کے دن کی ہولناکی، اللہ تعالیٰ کے علم و احاطہ، اعمال کے مکمل ریکارڈ اور اس کی شہادت کو بیان کیا گیا ہے، انسان اپنے اعمال کو بھول سکتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ انہیں یاد رکھتا ہے اور قیامت کے دن سب کچھ سامنے لے آئے گا اور اس پر گواہ بھی خود اللہ تعالیٰ ہو گا، اس میں انسانوں کے لیے سخت تنبیہ اور وعید ہے کہ وہ اپنے اعمال کو معمولی نہ سمجھیں، کیونکہ اللہ کے ہاں سب کچھ محفوظ ہے۔

آج کل بڑے بڑے کیمرے موجود ہیں، انٹرنیٹ پر چیزیں محفوظ کرنے کے لیے انتظامات کیے گئے ہیں، کئی کئی سال پرانی چیزیں ایک بٹن دبانے کے ساتھ سامنے آجاتی ہیں، کئی سال پہلے منہ سے نکالی گئی بات وہ آج

ریکارڈ سے تلاش کر کے دکھائی اور سنائی جاتی ہے، جب انسانوں کی بنائی ہوئی چیزیں اتنی محفوظ ہیں تو اللہ کی اس سے بہتر حفاظت گاہیں ہیں، جہاں فرشتوں کے پہرے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا علم و کمال

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ مَا يَكُوْنُ مِنْ نَّجْوٰى ثَلٰثَةٍ اِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ اِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَآ اَدْنٰى مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْثَرَ اِلَّا هُوَ مَعَهُمْ اَيْنَ مَا كَانُوْا ثُمَّ يُنَبِّئُهُمْ بِمَا عَمِلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ {۷} المجادلة.

جواب ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ اسے جانتا ہے؟ کبھی تین آدمیوں میں کوئی سرگوشی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا وہ نہ ہو، اور نہ پانچ آدمیوں کی کوئی سرگوشی ایسی ہوتی ہے جس میں چھٹا وہ نہ ہو، اور چاہے سرگوشی کرنے والے اس سے کم ہوں یا زیادہ، وہ جہاں بھی ہوں، اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے۔ پھر وہ قیامت کے دن انہیں بتائے گا کہ انہوں نے کیا کچھ کیا تھا۔ بیشک اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے، وہ اپنے بندوں کے تمام امور سے آگاہ ہے، جب ان بندوں میں سے تین، چار یا پانچ لوگ باہم سرگوشیاں کرتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنے علم کے ساتھ ان کی معیت میں ہوتا ہے وہ جہاں کہیں بھی ہوں، اس پر ان کے کاموں میں سے کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں رہتی، پھر اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بروز محشر ان کے کاموں کے بارے میں خبردار کرے گا جو وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں، نیکوں کو نیک کام پر اجر ملے گا، جب کہ اہل شر کو ان کی شر انگیزیوں اور شرارتوں کی سزا ملے گی، وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ تم جہاں ہو جس حالت

میں ہو نہ تمہاری باتیں اللہ کے سننے سے رہ سکیں نہ تمہاری حالتیں اللہ کے دیکھنے سے پوشیدہ رہیں اس کے علم نے ساری دنیا کا احاطہ کر رکھا ہے اسے ہر زبان و مکان کی اطلاع ہر وقت ہے، وہ زمین و آسمان کی تمام تر کائنات سے باعلم ہے، تین شخص آپس میں مل کر نہایت پوشیدگی، رازداری کے ساتھ اپنی باتیں ظاہر کریں انہیں وہ سنتا ہے اور وہ اپنے آپ کو تین ہی نہ سمجھیں بلکہ اپنا چوتھا اللہ کو گنیں اور جو پانچ شخص تنہائی میں رازداریاں کر رہے ہیں وہ چھٹا اللہ کو جانیں پھر جو اس سے کم ہوں یا اس سے زیادہ ہوں، وہ بھی یقین رکھیں کہ وہ جہاں کہیں بھی ہیں ان کے ساتھ ان کا اللہ ہے یعنی ان کے حال و قال سے مطلع ہے ان کے کلام کو سن رہا ہے اور ان کی حالتوں کو دیکھ رہا ہے پھر ساتھ ہی ساتھ اس کے فرشتے بھی لکھتے جا رہے ہیں۔

جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرما رہے ہیں اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ (التوبہ:۷۸) کیا لوگ نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ ان کی پوشیدہ باتوں کو اور ان کی سرگوشیوں کو بخوبی جانتا ہے اور اللہ تعالیٰ تمام غیبوں پر اطلاع رکھنے والا ہے۔

قرآن کریم میں دوسرے مقام (الزخرف ۸۰) پر ارشاد ہے اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ، کیا ان کا یہ گمان ہے کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں اور خفیہ مشوروں کو سن نہیں رہے؟ برابر سن رہے ہیں اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس موجود ہیں جو لکھتے جا رہے ہیں۔ اکثر بزرگوں نے اس بات پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس آیت سے مراد معیت علمی ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا وجود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا علم ہر جگہ ہے، ہر تین کے مجمع میں چوتھا اس کا علم ہے۔

بیشک و شبہ اس بات پر ایمان کامل اور یقین راسخ رکھنا چاہئے کہ یہاں مراد ذات سے ساتھ ہونا نہیں بلکہ علم سے ہر جگہ موجود ہونا ہے، ہاں بیشک اس کا سننا دیکھنا بھی اسی طرح اس کے علم کے ساتھ ساتھ ہے، اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنی تمام مخلوق پر مطلع ہے ان کا کوئی کام اس سے پوشیدہ نہیں، پھر قیامت کے دن انہیں ان کے تمام اعمال پر تنبیہ کرے گا، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

منافقین کی سرگوشی اور یہود کی بے ہودہ گوئی

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى ثُمَّ يَعُوْدُوْنَ لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَيَتَنٰجَوْنَ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ {٨} المجادلة.

جواب ترجمہ: کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں سرگوشی کرنے سے منع کر دیا گیا تھا، پھر بھی وہ وہی کام کرتے ہیں جس سے انہیں منع کیا گیا تھا؟ اور وہ ایک دوسرے کے ساتھ ایسی سرگوشیاں کرتے ہیں جو گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی پر مشتمل ہوتی ہیں۔ اور (اے پیغمبر) جب وہ تمہارے پاس آتے ہیں تو تمہیں ایسے طریقے سے سلام کرتے ہیں جس سے اللہ نے تمہیں سلام نہیں کیا، اور اپنے دلوں میں کہتے ہیں کہ: ہم جو کچھ کہہ رہے ہیں اس پر اللہ ہمیں سزا کیوں نہیں دے دیتا؟ جہنم ہی ان (کی خبر لینے) کے لیے کافی ہے، وہ اسی میں جا پہنچیں گے، اور وہ پہنچنے کی بہت بری جگہ ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمارہے ہیں کہ کیا آپ نے ان یہودیوں کی طرف توجہ نہیں فرمائی جنہیں سرگوشیاں کرنے سے روکا گیا ہے، مگر اس کے باوجود یہ سرگوشیاں کرتے ہیں، کھسر پھسر کرتے ہیں جس سے اہل ایمان کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے، پھر یہ لوگ جن باتوں سے روکے گئے وہی کرنے لگتے ہیں، گناہوں، سرکشی اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت کی سرگوشیاں کرتے ہیں۔

اور جب یہ لوگ آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں تو آپ ﷺ کو اس طرح سلام کرتے ہیں جس طرح اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے سلام کرنے کا طریقہ مقرر نہیں فرمایا، یہ شرارت کرتے

ہوئے السلام علیکم کی بجائے السام علیک کہتے ہیں، سام کا معنٰی تو موت ہے، یعنی آپ ﷺ کے لیے موت کی بد دعا کرتے ہیں، پھر ان کی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کا عالم یہ ہے کہ ایک دوسرے کے ساتھ گپ شپ کرتے ہوئے یوں ہانکتے جاتے ہیں کہ جو کچھ ہم محمد کو کہتے ہیں اگر یہ اللہ کے سچے رسول ہیں تو پھر اس پر ہمیں اللہ تعالیٰ عذاب کیوں نہیں دیتا؟ ہمیں سزا کیوں نہیں ملتی؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کے لیے جہنم کافی ہے اس میں یہ داخل ہوں گے، یہ اس کی گرمی کو سوچ ہی سکتے ہیں، بہت ہی برا ان کا ٹھکانہ ہے۔

حضرت مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے تحت لکھتے ہیں یہودی مکار تو تھے ہی، طرح طرح کی شرارتیں بھی کرتے تھے اور خفیہ مشورہ بھی کرتے رہتے تھے، لفظ نجویٰ خفیہ بات چیت کے لئے بولا جاتا ہے، لفظ مناجاۃ بھی اسی سے لیا گیا ہے، مومن بندے آہستہ آہستہ (جسے اللہ تعالیٰ ہی سنے کوئی دوسرا نہ سنے) اپنے خالق ومالک جل مجدہ سے دعا کرتے ہیں کیونکہ وہ ہر ظاہر اور خفیہ بات کو سنتا ہے اسی لیے خفیہ دعاء کو مناجاۃ کہا جاتا ہے۔

یہودی اور منافقین اسلام کے اور مسلمانوں کے دشمن تو تھے ہی مسلمانوں کو تکلیف پہنچانے کے لیے بری بری حرکتیں کرتے تھے، ان کی ان حرکتوں میں یہ بات بھی تھی کہ راستوں میں کسی جگہ بیٹھ جاتے تھے جب کوئی مسلمان وہاں سے گزرتا تو گہری نظروں سے دیکھتے تھے اور آنکھوں سے اشارہ بازی کرتے تھے اور چپکے چپکے آپس میں باتیں کرتے تھے۔ منافقین بھی ان کے شریک حال تھے، مسلمانوں کو ان کی حرکتوں سے تکلیف ہوتی تھی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اس بات کو پیش کر دیا اور ان لوگوں کی شکایت کی، آپ نے ان لوگوں کو منع کر دیا کہ سرگوشی اور خفیہ بات چیت نہ کریں اس سے مسلمانوں کو تکلیف ہوتی ہے ان لوگوں نے ہدایت پر عمل نہ کیا ممانعت کے باوجود اپنی حرکتیں کرتے رہے اس پر آیت کریمہ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نُهُوْا عَنِ النَّجْوٰى نازل ہوئی جس

میں ان کی حرکت بد کا بھی تذکرہ فرمایا اور یہ بھی بتایا کہ یہ لوگ گناہ کے اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کے مشورے کرتے ہیں۔

یہودیوں کی شرارت: یہودیوں کا یہ بھی طریقہ تھا کہ جب حاضر خدمت ہوتے تو السلام علیک کی بجائے السام کہتے تھے زبان دبا کر لام کو کھا جاتے تھے، سام عربی میں موت کو کہتے ہیں موت کی بد دعاء کرتے تھے اور ظاہر یہ کرتے تھے کہ ہم نے سلام کیا، ان کی اس حرکت کو بیان کرنے کے لیے ارشاد فرمایا: وَاِذَا جَآءُوْكَ حَيَّوْكَ بِمَا لَمْ يُحَيِّكَ بِهِ اللّٰهُ اور وہ جب آپ کے پاس آتے ہیں تو ان الفاظ میں تحیہ کرتے ہیں یعنی سلام کی ظاہری صورت اختیار کرتے ہیں، جن الفاظ کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سلام نہیں بھیجا۔

ایک مرتبہ چند یہودی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور زبان دبا کر وہی السام علیک کہہ دیا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے محسوس فرمایا اور آڑے ہاتھوں لیا اور جواب میں فرمایا عَلَيْكُمُ السَّامُ وَاللَّعْنَةُ فرمایا (تم پر موت ہو اور لعنت ہو)۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اے عائشہ! ٹھہرو (نرمی اختیار کرو) کیونکہ اللہ تعالیٰ ہر معاملہ میں نرمی کو پسند فرماتا ہے، عرض کیا یا رسول اللہ آپ نے سنا نہیں انہوں نے کیا کہا؟ آپ نے فرمایا تو نے نہیں سنا میں نے کیا کہا؟ میں نے ان کے جواب میں علیکم کہہ دیا یعنی (ان کی بات ان پر لوٹا دی) انہیں موت کی بد دعاء دے دی۔ (صحیح بخاری)

وَيَقُوْلُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ لَوْ لَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ: یعنی یہودی برے الفاظ بھی زبان پر لاتے ہیں پھر اپنے دلوں میں یوں بھی کہتے ہیں کہ اللہ ہمیں ہماری باتوں پر عذاب کیوں نہیں دیتا، مقصد ان کا یہ تھا کہ اگر یہ اللہ کے نبی ہیں اور ہم ان کی شان میں بے ادبی کرتے ہیں تو اب تک اللہ کا عذاب آجانا چاہئے تھا جب اللہ تعالیٰ ہمیں نہیں دیتا تو معلوم ہوا کہ یہ اللہ کے نبی نہیں ہیں (العیاذ باللہ) اللہ تعالیٰ

نے ایسا کوئی اعلان نہیں فرمایا کہ نبی کے جھٹلانے کی اور گناہوں کی سزا اسی دنیا میں ضرور دیدی جائے گی اور جلد دے دی جائے گی۔ بہت سے کافروں کو دنیا و آخرت دونوں میں سزا ملتی ہے اور بعض کو صرف آخرت میں دی جاتی ہے یہ دلیل بنالینا کہ چونکہ ہمیں عذاب نہیں دیا جاتا اس لئے ہمارا عمل درست ہے جہالت اور حماقت کی بات ہے۔

حَسْبُهُمْ جَهَنَّمُ يَصْلَوْنَهَا فَبِئْسَ الْمَصِيْرُ: اس میں ان لوگوں کی جاہلانہ بات کا جواب دے دیا اور بتادیا کہ ان کو دوزخ میں جانا ہی جانا ہے وہ برا ٹھکانا ہے اگر دنیا میں عذاب نہ دیا گیا تو یوں نہ سمجھیں کہ عذاب سے محفوظ ہو گئے۔ (تفسیر انوار البیان)

آداب گفتگو

سوال گفتگو کے قرآنی آداب آیت ذیل کی روشنی میں بیان کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَنَاجَيْتُمْ فَلَا تَتَنَاجَوْا بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَمَعْصِيَتِ الرَّسُوْلِ وَتَنَاجَوْا بِالْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ {۹} المجادله

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم آپس میں ایک دوسرے سے سرگوشی کرو تو ایسی سرگوشی نہ کرو جو گناہ، زیادتی اور رسول کی نافرمانی پر مشتمل ہو، ہاں ایسی سرگوشی کرو جو نیک کاموں اور تقوی پر مشتمل ہو، اور اللہ سے ڈرتے رہو، جس کے پاس تم سب کو جمع کر کے لے جایا جائے گا۔

قرآن کریم نے لوگوں کو آداب گفتگو سکھائے ہیں، خصوصاً جن لوگوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو سچا جانا اور مانا ہے، جنہوں نے ان کی شریعت اور دین پر عمل کیا ہے، انہیں یہ بات سمجھائی اور بتائی گئی ہے کہ جب تم آپس میں گفتگو کرو تو اس میں اس بات کا خیال رہے کہ کوئی گناہ کی بات تمہارے منہ سے نہ نکلے۔

اسی طرح کوئی اس طرح کی شر انگیز گفتگو تمہارے منہ سے نہیں نکلنا چاہیے جس کی بدولت تم

میں کوئی شخص دوسرے پر چڑھائی کر ڈالے، اسی طرح تمہاری گفتگو میں کوئی ایسی بات نہیں ہونا چاہیے جو رسول کریم ﷺ کے کسی حکم کے خلاف ہو، قرآن بتاتا ہے کہ ایسی گفتگو کرو جس میں خیر ہی خیر ہو، جس میں اطاعت کی بات ہو، جس میں نیکی کی بات ہو۔

تمہاری گفتگو میں اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے احکامات کی پیروی کرنے کی ترغیب ہونا چاہیے، اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے نواہی سے بچنے کی ترغیب ہونا چاہیے، اس لیے کہ تمہاری تمام تر باتوں، تمہارے تمام تر اعمال، تمہارے تمام تر اقوال کا مرجع اللہ کی ذات ہے، اس نے تمہاری ساری باتیں جمع کروا رکھی ہیں، وہ ان پر تمہیں بدلہ بھی دے گا۔

شیخ ابوالحسن خازن رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اس آیت میں جن لوگوں کو خطاب کیا گیا ہے اس کے مصداق کے بارے میں دو قول ہیں، ایک قول یہ ہے کہ اس میں خطاب ایمان والوں کو ہے، اور یہ اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہودیوں اور منافقوں کی مذمت بیان کی ہے کہ وہ گناہ، سرکشی اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی سے متعلق سرگوشی نہ کیا کریں، تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو بھی منع کر دیا کہ وہ یہودیوں اور منافقوں کے راستے پر گامزن نہ ہوں اور جس طرح وہ کرتے ہیں یہ ایسا نہ کریں، فرمایا کہ گناہ کی سرگوشی نہ کرو، گناہ کی سرگوشی سے مراد وہ بات ہے جو بری ہو، سرکشی کی بات ہو، اس سے مراد وہ بات ہے جو انسان سے ظلم کروائے، رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کروائے۔

دوسرا مصداق اس آیت کے مخاطبین کا منافقین ہیں اور یہی صحیح ہے، پھر یہاں ایمان والوں سے مراد وہ لوگ ہوں گے جو صرف اپنی زبانوں سے ایمان لائے ہیں، یا جو اپنے خیال کے مطابق ایمان والے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ انہیں فرما رہے ہیں کہ تم گناہ، سرکشی اور رسول اللہ ﷺ کی نافرمانی کرنے سے متعلق سرگوشیاں نہ کرو، تم نیکی، تقویٰ، اطاعت رسول سے متعلق، گناہ کو ترک کرنے سے متعلق سرگوشیاں کیا کرو، اور اللہ تعالیٰ سے تم لوگ ڈرو کیونکہ تم اللہ ہی کی طرف جمع کیے جاؤ گے۔ (لباب التاویل فی معانی لتنزیل المعروف تفسیر الخازن)

سرگوشی شیطان کی طرف سے کا مطلب؟

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ یہاں اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ کا کیا مطلب ہے؟

اِنَّمَا النَّجْوٰی مِنَ الشَّیْطٰنِ لِیَحْزُنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَلَیْسَ بِضَآرِّهِمْ شَیْـًٔا اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَعَلَی اللّٰهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ{۱۰} المجادلة.

جواب ترجمہ: ایسی سرگوشی تو شیطان کی طرف سے ہوتی ہے تاکہ وہ ایمان والوں کو غم میں مبتلا کرے اور وہ اللہ کے حکم کے بغیر انہیں ذرا بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اور مومنوں کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

یہ مومنین مخلصین کو تسلی دی گئی ہے کہ منافقین کی یہ ساری سرگوشیاں شیطان کی تحریک اور اس کی وسوسہ اندازی سے وجود میں آئی ہیں اور شیطان زیادہ سے زیادہ بس یہی کر سکتا ہے کہ اس طرح کی باتوں سے اہل ایمان کے دلوں کو ذرا رنج و ملال پہنچا دے۔ اس سے زیادہ اس کے امکان میں کچھ نہیں ہے۔ وہ اللہ کے اذن کے بدون اہل ایمان کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتا تو اہل ایمان کو چاہیے کہ وہ شیطان کی ان وسوسہ اندازیوں کی کوئی پروانہ کریں بلکہ اپنے موقف پر ڈٹے رہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھیں کہ وہ ان کو ہر شریر کی شرارت سے محفوظ رکھے گا۔ (تدبر قرآن)

مفسر قرآن علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سرگوشی شیطان کی طرف سے ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان باتوں کو خوبصورت بناتا ہے، مراد یہ ہے وہ ان لوگوں کے لیے باتیں مزین کرتا ہے تاکہ وہ ایمان والے لوگوں کو پریشان کرے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کو تسلی دی گئی کہ وہ شیطان کی اس طرح کی باتوں کو خاطر میں نہ لائیں، اور نہ ہی پریشان ہوں اس لیے کہ اس طرح کی شیطانی باتیں انہیں کسی طرح کا نقصان نہیں دے سکتیں اور نہ

ہی شیطان اہل ایمان کو کچھ بھی نقصان پہنچا سکتا ہے، کیونکہ اللہ کے اذن اور مرضی کے بغیر کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا، اس لیے اہل ایمان کو اللہ کی ذات پر ہی توکل کرنا چاہیے۔

آداب مجلس اور علماء کرام کا مقام

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَكُمْ تَفَسَّحُوْا فِي الْمَجٰلِسِ فَافْسَحُوْا يَفْسَحِ اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاِذَا قِيْلَ انْشُزُوْا فَانْشُزُوْا يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ ۙ وَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ {۱۱} المجادلة.

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں دوسروں کے لیے گنجائش پیدا کرو، تو گنجائش پیدا کر دیا کرو، اللہ تمہارے لیے وسعت پیدا کرے گا اور جب کہا جائے کہ اٹھ جاؤ، تو اٹھ جاؤ، تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے اللہ ان کو درجوں میں بلند کرے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ اے ایمان والو! جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو سچا جانا ہے اور سچا تسلیم کیا ہے، اور ان کی شریعت پر عمل پیرا ہوئے ہو، جب تم سے مطالبہ کیا جائے کہ تم مجلس میں کشادگی پیدا کرو تو ایسا کر لیا کرو، یوں اللہ تعالیٰ تمہاری دنیا اور آخرت کو کشادہ فرمادیں گے۔

اور اے ایمان والو! جب تم سے یہ مطالبہ کیا جائے کہ تم لوگ کسی کام کے لیے مجلس سے اٹھ جاؤ جو تمہارے لیے بہتر ہے تو اٹھ جایا کرو، یوں اللہ تعالیٰ تم میں سے مومن مخلص لوگوں کے درجات کو بلند فرمادیں گے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ علم والے لوگوں کے درجات کو بلند فرمادیں گے، ثواب میں بھی اور رضامندی کے مراتب میں بھی، اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال اور کارناموں سے خوب آگاہ ہیں، ان میں

سے اس پر کوئی چیز مخفی اور پوشیدہ نہیں ہے، وہ ان اعمال پر تمہیں بدلہ دے گا۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں یہ آیت مجلس ذکر کے بارے میں اتری ہے مثلاً وعظ ہو رہا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کچھ نصیحت کی باتیں بیان فرمارہے ہیں لوگ بیٹھے سن رہے ہیں اب جو دوسرا کوئی آیا تو کوئی اپنی جگہ سے نہیں سرکتا تاکہ اسے بھی جگہ مل جائے۔ قرآن کریم نے حکم دیا کہ ایسا نہ کرو ادھر ادھر کھل جایا کرو تاکہ آنے والے کی جگہ ہو جائے۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں جمعہ کے دن یہ آیت اتری، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دن صفہ میں تھے یعنی مسجد کے ایک چھپر تلے جگہ تنگ تھی اور آپ کی عادت مبارکہ تھی کہ جو مہاجر اور انصاری بدر کی لڑائی میں آپ کے ساتھ تھے آپ ان کی بڑی عزت اور تکریم کیا کرتے تھے اس دن سے چند بدری صحابہ دیر سے آئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے آس پاس کھڑے ہوگئے، آپ سے عرض کیا اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ أَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللهِ وَبَرَكَاتُهُ آپ نے جواب دیا پھر اور اہل مجلس کو سلام کیا انہوں نے بھی جواب دیا اب یہ اسی امید پر کھڑے رہے کہ مجلس میں ذرا کشادگی دیکھیں تو بیٹھ جائیں لیکن کوئی شخص اپنی جگہ سے نہ ہلا جو ان کے لئے جگہ ہوتی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ دیکھا تو نہ رہا گیا نام لے لے کر بعض لوگوں کو ان کی جگہ سے کھڑا کیا اور ان بدری صحابیوں کو بیٹھنے کو فرمایا، جو لوگ کھڑے کرائے گئے تھے انہیں ذرا بھاری پڑا ادھر منافقین کے ہاتھ میں ایک مشغلہ لگ گیا، کہنے لگے لیجئے یہ عدل کرنے کے مدعی نبی ہیں کہ جو لوگ سب سے پہلے آئے اپنے نبی کے قریب جگہ لی اطمینان سے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے انہیں تو ان کی جگہ سے کھڑا کر دیا اور دیر سے آنے والوں کو ان کی جگہ دلوادی کس قدر ناانصافی ہے۔

ادھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لئے کہ ان کے دل میلے نہ ہوں دعا کی کہ رَحِمَ اللهُ رَجُلًا فَسَحَ لِأَخِيهِ اللہ اس پر رحم کرے جو اپنے مسلمان بھائی کے لئے مجلس میں جگہ کر دے۔

اس حدیث کو سنتے ہی صحابہ نے فوراً خود بخود اپنی جگہ سے ہٹنا اور آنے والوں کو جگہ دینا شروع کر دیا اور جمعہ ہی کے دن یہ آیت اتری (بن ابی حاتم)

حضرت ابن عمر سے روایت ہے کہ حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا لَا يُقِيمُ الرَّجُلُ الرَّجُلَ مِنْ مَجْلِسِهِ فَيَجْلِسَ فِيهِ، وَلَكِنْ تَفَسَّحُوا وتوسَّعوا، کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو اس کی جگہ سے ہٹا کر وہاں نہ بیٹھے بلکہ تمہیں چاہئے کہ ادھر ادھر سرک کر اس کیلئے جگہ بنا دو۔ (بخاری، مسلم، مسند احمد)

حضرت جابر بن عبد اللہ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا لَا يُقِيمَنَّ أحدُكم أَخَاهُ يَوْمَ الْجُمُعَةِ، وَلَكِنْ لِيَقُلْ: افْسَحُوا، تم میں سے کوئی شخص اپنے بھائی کو جمعہ کے دن اس کی جگہ سے ہر گز نہ اٹھائے بلکہ کہہ دے کہ گنجائش کرو۔ (مسند الشافعی)

امام تفسیر علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ کسی آنے والے کے لئے کھڑے ہو جانا جائز ہے یا نہیں ؟ بعض لوگ تو اجازت دیتے ہیں اور یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا قُومُوا إِلَى سَيِّدِكُمْ اپنے سردار کیلئے کھڑے ہو جاؤ۔

بعض علماء منع کرتے ہیں اور یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ مَنْ أَحَبَّ أَنْ يَتَمَثَّلَ لَهُ الرِّجَالُ قِيَامًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ، جو شخص یہ چاہے کہ لوگ اس کیلئے سیدھے کھڑے ہوں وہ جہنم میں اپنی جگہ بنالے۔

بعض بزرگ تفصیل بیان کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ سفر سے اگر کوئی آیا ہو تو حاکم کے لئے عہدہ حکمرانی کے سبب لوگوں کا کھڑے ہو جانا درست ہے کیونکہ حضور ﷺ نے جن کے لئے کھڑا ہونے کو فرمایا تھا یہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ تھے۔ بنو قریظہ کے آپ حاکم بنائے گئے تھے جب انہیں آتا ہوا دیکھا تو حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اپنے سردار کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور یہ (بطور تعظیم کے نہ تھا بلکہ) صرف اس لئے تھا کہ ان کے احکام کو بخوبی جاری کرائے۔ (تفسیر ابن کثیر)

ہاں اسے عادت بنالینا کہ مجلس میں جہاں کوئی بڑا آدمی آیا اور لوگ کھڑے ہوگئے یہ عجمیوں کا طریقہ ہے، سنن کی حدیث میں ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نزدیک رسول اللہ ﷺ سے زیادہ محبوب اور باعزت کوئی نہ تھا لیکن تاہم آپ کو دیکھ کر وہ کھڑے نہیں ہوا کرتے تھے، جانتے تھے کہ آپ اسے مکروہ سمجھتے ہیں۔

سنن کی اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ آتے ہی مجلس کے خاتمہ پر بیٹھ جایا کرتے تھے اور جہاں آپ تشریف فرما ہو جاتے وہی جگہ صدارت کی جگہ ہو جاتی اور صحابہ کرام اپنے اپنے مراتب کے مطابق مجلس میں بیٹھ جاتے۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کو آپ ﷺ اپنے دائیں جانب بٹھاتے تھے، جب کہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کو بائیں جانب بٹھاتے تھے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سامنے بٹھاتے تھے کیونکہ یہ دونوں بزرگ کاتب وحی تھے آپ ان سے فرماتے اور یہ وحی کو لکھ لیا کرتے تھے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ حضور ﷺ کا فرمان تھا کہ لِيَلِيَنِي منكم أولوا الْأَحْلَامِ والنُّهَى، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، مجھ سے قریب ہو کر عقل مند، صاحب فراست لوگ بیٹھیں پھر درجہ بدرجہ۔

اور یہ انتظام اس لئے تھا کہ حضور ﷺ کے مبارک ارشادات یہ حضرات سنیں اور بخوبی سمجھیں، یہی وجہ تھی کہ صفہ والی مجلس میں آپ نے اور لوگوں کو ان کی جگہ سے ہٹا کر وہ جگہ بدری صحابہ کو دلوائی، گو اس کے ساتھ اور وجوہات بھی تھیں مثلاً ان لوگوں کو خود چاہئے تھا کہ ان بزرگ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا خیال کرتے اور لحاظ و مروت برت کر خود ہٹ کر انہیں جگہ دیتے جب انہوں نے از خود ایسا نہیں کیا تو پھر حکماً ان سے ایسا کرایا گیا، اسی طرح پہلے کے لوگ حضور ﷺ کے بہت سے کلمات پوری طرح سن چکے تھے اب یہ حضرات آئے تھے تو آپ نے چاہا کہ یہ بھی بہ آرام بیٹھ کر میری حدیثیں سن

لیں اور دینی تعلیم حاصل کرلیں، اسی طرح امت کو اس بات کی تعلیم بھی دینی تھی کہ وہ اپنے بڑوں اور بزرگوں کو امام کے پاس بیٹھنے دیں اور انہیں اپنے سے مقدم رکھیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

آیت کریمہ کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ نے اہل علم کی شان بیان فرمائی ہے یَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ آمَنُوا مِنْكُمْ وَالَّذِیْنَ أُوتُوا الْعِلْمَ دَرَجَاتٍ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرٌ، تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور جن کو علم عطا کیا گیا ہے اللہ ان کو درجوں میں بلند کرے گا، اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ خیال مت کرو کہ جب تم میں سے کسی نے اپنے بھائی کی آمد پر جگہ میں گنجائش کر دی، یا باہر جانے کے لیے کسی سے کہا گیا تو وہ چلا گیا تو اس کے حق میں یہ ہتک اور توہین ہو گئی، ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اس کی بلندی اور مرتبہ کی بات ہے اللہ تعالیٰ کے ہاں، اللہ تعالیٰ اس کے اس عمل کو ضائع نہیں فرمائیں گے، بلکہ اس کو اس کے عوض دنیا اور آخرت میں جزا عطا فرمائیں گے، اس لیے کہ جس شخص نے دین اور اللہ کے معاملہ میں عاجزی اختیار کی، تواضع کی تو اللہ تعالیٰ اس کے مرتبہ اور مقام کو بلند کر دیتے ہیں اور اسے نیک شہرت عطا فرماتے ہیں، اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور اہل علم کے درجات کی بلندی کا ذکر فرمایا ہے۔

سرگوشی سے پہلے صدقے کا حکم

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً ذٰلِكَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَاَطْهَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ {۱۲} ءَاَشْفَقْتُمْ اَنْ تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقٰتٍ فَاِذْ لَمْ تَفْعَلُوْا وَتَابَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَاللّٰهُ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ {۱۳} المجادلة.

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! جب تم رسول سے تنہائی میں کوئی بات کرنا چاہو تو اپنی اس تنہائی کی بات سے پہلے کچھ صدقہ کر دیا کرو۔ یہ طریقہ تمہارے حق میں بہتر اور زیادہ ستھرا طریقہ ہے۔ ہاں اگر تمہارے پاس (صدقہ کرنے کے لیے) کچھ نہ ہو تو اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔ کیا تم اس بات سے ڈر گئے کہ اپنی تنہائی کی بات سے پہلے صدقات دیا کرو؟ اب جبکہ تم ایسا نہیں کر سکے، اور اللہ نے تمہیں معاف کر دیا تو تم نماز قائم کرتے رہو، اور زکوٰۃ دیتے رہو، اور اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرتے رہو اور جو کام بھی تم کرتے ہو اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔

شانِ نزول: اس آیت کریمہ کا شانِ نزول یہ بیان کیا گیا ہے کہ بعض مال دار لوگ حضرت نبی کریم ﷺ کی خدمت اقدس میں پیش ہوتے تو بڑی دیر تک آپ ﷺ کے ساتھ سرگوشی کرتے رہتے اور غریبوں فقیروں کو استفادہ کا موقع کم ملتا آپ کو ان لوگوں کا دیر تک بیٹھنا اور دیر تک سرگوشی کرنا ناگوار گزرتا اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

زید بن اسلم کی سند سے نقل کیا گیا کہ یہود و منافقین بلا ضرورت آپ ﷺ سے سرگوشیاں کرتے مسلمانوں کو اس خیال سے کہ شاید کسی نقصان دہ بات کی سرگوشی ہو، ناگوار گزرتا، اس پر ان کو منع فرمایا جس کا ذکر **نهوا عن النجوٰی** میں ہے مگر جب وہ باز نہ آئے تو یہ حکم نازل ہوا۔ **اِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُوْلَ** اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل باطل اس سرگوشی سے رک گئے کیونکہ جب مال کی وجہ سے ان کو صدقہ کرنا ناگوار تھا۔ (فتح البیان)

تفسیر تبیان القرآن میں ان آیات کے ذیل میں مفسر لکھتے ہیں نبی ﷺ سے سرگوشی کرنے یعنی خفیہ طریقہ سے آپ سے سوال کرنے پر جو کچھ صدقہ کرنے کا حکم دیا ہے، اس کی حسب ذیل حکمتیں ہیں: ① اس میں نبی ﷺ کی تعظیم اور تکریم کا اظہار ہے، کیونکہ مال خرچ کرنے میں مشقت ہوتی ہے اور جو چیز مشقت سے حاصل ہو، اس کی بہت قدر و منزلت ہوتی ہے، اس کے برخلاف جو چیز

آسانی سے حاصل ہو جائے اس کی کوئی خاص قدر نہیں ہوتی اور جب مسلمان مال خرچ کرنے کے بعد آپ سے سرگوشی کر سکیں گے تو اس سرگوشی کی بہت قدر و منزلت ہو گی۔

② اس میں فقراء کی مدد ہے کیونکہ وہ صدقہ فقراء کو دیا جائے گا۔

③ علامہ ابو الحسن علی بن محمد الماوردی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں ابن زید رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ منافقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے غیر ضروری، لایعنی اور عبث سوال کرتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم دیا، تاکہ وہ اس قسم کے سوالات نہ کریں۔

④ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، بعض مسلمان تنہائی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سرگوشی کرتے تھے، اس سے دوسرے مسلمانوں نے یہ گمان کیا کہ شاید وہ تنہائی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کرتے ہیں۔ اس سے ان کو رنج ہوا، تب اللہ تعالیٰ نے تنہائی میں سرگوشی کرنے سے پہلے ان کو صدقہ کرنے کا حکم دیا تاکہ وہ تنہائی میں سرگوشی نہ کریں۔

⑤ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ کثرت سوالات کرنے لگے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس سے مشقت ہوتی تھی کیونکہ آپ نے احکام کی تبلیغ کرنی ہوتی تھی، مصالح امت کے کام کرنے ہوتے تھے اور دیگر عبادات کرنی ہوتی تھیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے تخفیف کا ارادہ کیا اور جب اللہ تعالیٰ نے سوال کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم دیا تو بہت سے مسلمان سوالات کرنے سے رک گئے۔ (النکت والعیون ج ۵ ص ۴۹۳، دار الکتب العلمیہ، بیروت)

⑥ صدقہ دینے کے حکم سے یہ واضح ہو گیا کہ کون مال دنیا سے محبت کرتا ہے اور کس کو آخرت عزیز ہے۔

⑦ مقاتل بن سلیمان رحمۃ اللہ علیہ اور مقاتل بن حیان رحمۃ اللہ علیہ نے بیان کیا کہ دولت مند لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بہ کثرت سوالات کرتے تھے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں فقراء کو آپ سے سوال کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم مال داروں کی طویل صحبت اور ان کی بہت سرگوشیوں کو ناپسند کرتے تھے، پس جب اللہ تعالیٰ نے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم دیا تو مال دار مسلمان سوال کرنے سے رک گئے

اور فقراء کو نبی ﷺ سے گفتگو کرنے اور آپ کی ہم نشینی کا موقع مل گیا اور خوش حال مسلمانوں میں سے سوائے حضرت علی بن ابی طالب کے اور کسی نے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ نہیں دیا، انہوں نے ایک دینار صدقہ کیا اور نبی ﷺ سے دس سوالات کئے۔ (تفسیر مقاتل بن سلیمان ۳ ص ۳۳۴، الکشف والبیان ۹ ص ۲۶۱)

علامہ ابو اسحاق احمد بن ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: قرآن مجید میں ایک آیت ہے، جس پر مجھ سے پہلے کسی نے عمل نہیں کیا اور نہ میرے بعد اس پر کوئی عمل کرے گا اور وہ یہ آیت ہے یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ (المجادلہ: ۱۲) (الکشف والبیان ج ۹ ص ۲۶۱-۲۶۲ دار احیاء التراث العربی، بیروت)

نبی ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنا آیا واجب تھا یا مستحب؟ المجادلہ: ۱۳ میں فرمایا: کیا تم اپنی سرگوشی سے پہلے صدقہ کرنے سے گھبرا گئے، پس جب تم نے (صدقہ) نہ کیا اور اللہ نے تمہاری توبہ قبول فرمالی۔

بعض علماء نے کہا، اس آیت میں ﷺ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ دینے کا امر اور حکم دیا ہے اور امر وجوب کے لئے آتا ہے، اس کا معنیٰ یہ ہوا کہ یہ صدقہ کرنا واجب ہے اور دوسرے علماء نے کہا ہے کہ یہ صدقہ واجب نہیں ہے مستحب ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: یہ تمہارے لئے بہت اچھا اور نہایت پاکیزہ ہے اور اس قسم کے الفاظ نفلی کام کے لئے آتے ہیں، واجب کے لئے نہیں آتے اور تحقیق یہ ہے کہ صدقہ کرنا شروع میں واجب تھا، بعد میں اس کا وجوب منسوخ ہو گیا۔ کلبی نے کہا، یہ صرف دن کی ایک ساعت میں واجب رہا، پھر اس کا وجوب منسوخ ہو گیا اور مقاتل بن حیان نے کہا: دس دن تک یہ حکم واجب رہا، پھر اس کا وجوب منسوخ ہو گیا۔ (تفسیر کبیر)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وجہ سے امت کو تخفیف حاصل ہونا: علی بن علقمۃ الانماری بیان کرتے ہیں کہ حضرت علی بن ابی طالب نے فرمایا: جب یہ آیت نازل ہوئی یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا نَاجَیْتُمُ

الرَّسُوْلَ (المجادلہ: ۱۲) تو نبی ﷺ نے مجھ سے فرمایا: تمہارا کیا خیال ہے لوگ ایک دینار صدقہ کریں گے؟ میں نے کہا: وہ اس کی طاقت نہیں رکھتے، آپ نے فرمایا: نصف دینار؟ میں نے کہا: وہ اس کی بھی طاقت نہیں رکھتے، آپ نے پوچھا، پھر لوگ کس کی طاقت رکھتے ہیں؟ میں نے کہا، (کچھ) جو کی، آپ نے فرمایا: تم تو بہت زاہد ہو، پھر یہ آیت نازل ہوگئی: (المجادلہ: ۱۳) کیا تم اپنی سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے سے گھبرا گئے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: پس میرے سبب سے اللہ تعالیٰ نے اس امت سے تخفیف کر دی۔ (سنن ترمذی) اکابر صحابہ کا آپ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ نہ کرنا، آیا ان کے حق میں کسی طعن یا نقص کا موجب ہے؟ اکثر روایات میں مذکور ہے کہ صرف حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ سے سرگوشی کرنے سے پہلے ایک دینار صدقہ دیا تھا، اس کے بعد اس حکم پر عمل کرنے کی رخصت نازل ہوگئی اور اس حکم پر عمل کرنا منسوخ ہوگیا اور یہ بھی مروی ہے کہ اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس حکم پر عمل کرنے کا وقت پایا لیکن اس حکم پر عمل نہیں کیا اور اس سے اکابر صحابہ پر طعن ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اس حکم پر افاضل صحابہ نے اس لئے عمل نہیں کیا کہ فقراء مسلمین آپ سے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اس لئے اس حکم پر عمل کرنا ان کے لئے مشکل تھا اور جو مسلمان غنی تھے ان کے دلوں میں اس کی وجہ سے وحشت پیدا ہوتی تھی، اگر وہ صدقہ نہ کرتے اور دوسرے صدقہ دیتے تو ان پر طعن ہوتا، لہٰذا فقراء کے لئے اس حکم پر عمل کرنا مشکل تھا اور اغنیاء کے لئے اس حکم پر عمل سے توحش ہوتا تھا اور ہر مسلمان کے لئے آپ سے سرگوشی کرنا واجب نہ تھا اور سرگوشی نہ کرنے سے ان کا کوئی نقصان نہ تھا اور نہ ہی سرگوشی کرنا کوئی مستحب کام تھا۔

بلکہ جس طرح حضرت ابن عباس نے فرمایا: سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ کرنے کا حکم اسی لئے دیا تھا کہ مسلمان سرگوشی کرنا ترک کر دیں، کیونکہ نبی ﷺ کی اور بہت مصروفیات تھیں، آپ کا

صرف یہی کام نہیں تھا کہ آپ سرگوشیوں کا جواب دیتے رہیں، آپ نے احکام شرعیہ کی تبلیغ کرنی تھی، قرآن مجید کو لکھوانا اور یاد کرانا تھا، کفار سے جہاد کے لئے لشکروں کو بھیجنا تھا، مختلف عبادات کرنی تھیں اور مصالح امت پر غور و فکر کرنا تھا، اس لئے سرگوشی سے پہلے صدقہ کرنے کے حکم کا منشاء ہی یہ تھا کہ مسلمان آپ ﷺ سے سرگوشیاں کرنا ترک کر دیں اور اکابر صحابہ اس منشاء سے آگاہ تھے۔

اس لئے انہوں نے سرگوشی کرنے سے پہلے صدقہ نہیں دیا اور انہوں نے جو اس حکم پر عمل نہیں کیا تو اس سے ان پر کوئی طعن وارد نہیں ہوتا، نہ اس سے ان کی فضیلت میں کوئی کمی ہوتی ہے۔ (تفسیر تبیان القرآن)

اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے مخاطب ہیں جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی اور ان کی شریعت پر عمل پیرا ہوئے، کہ جب تم لوگ نبی کریم ﷺ سے ایسی گفتگو کرنے کا ارادہ کرو جو تمہارے اور نبی کریم ﷺ کے درمیان راز ہو تو تم اس کے لیے یہ طریقہ اختیار کرو کہ اس سے پہلے حاجت مندوں، ضرورت مندوں، فقیروں اور مسکینوں کی خدمت میں صدقہ پیش کیا کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے اور اس میں ثواب بھی ہے اور تمہارے دلوں کے گناہوں اور آثام کو دھونے کے لیے زیادہ پاکیزہ چیز ہے۔ بصورت دیگر اگر تم صدقہ دینے کے لیے کوئی چیز نہ پاؤ تو اس میں تم پر کوئی حرج اور گناہ والی بات بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ایمان والے بندوں کو معاف کرنے والا ہے، ان پر بہت رحیم اور مہربان ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ ان سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم لوگ رسول اللہ ﷺ سے سرگوشی کرنے سے قبل صدقہ کرنے سے ڈرتے ہو؟ اگر تم لوگ جس چیز کا حکم دیے گئے ہو تعمیل نہ کر سکو تو گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، اللہ تمہاری توبہ قبول فرمالیں گے اور تمہیں اللہ تعالیٰ نے اس میں چھوٹ دے رکھی ہے، رخصت دے رکھی ہے۔

ایک کام یہ لازم رکھو کہ نماز پر ثابت قدم رہو، اقامت صلاۃ پر ہمیشگی اختیار کرو، زکوٰۃ دیتے رہو، اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و فرمانبرداری کرتے رہو، ہر اس کام میں جس کا تمہیں حکم دیا

گیاہے، اس لیے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ تمہارے تمام اعمال سے بہت ہی زیادہ باخبر ہے، وہ تمہارے کاموں پر تمہیں صلہ دے گا۔

منافقین کے غضب دلانے والے احوال

سوال سورۃ المجادلہ کی درج ذیل آیات میں کن لوگوں کو عالم آشکار کیا گیاہے؟ کن لوگوں سے متعلق یہ آیات کچھ کہہ رہی ہیں؟ ان کی تفسیر کیجیے۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلَا مِنْهُمْ وَيَحْلِفُوْنَ عَلَى الْكَذِبِ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ {۱۴} اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ {۱۵} اِتَّخَذُوْٓا اَيْمَانَهُمْ جُنَّةً فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ {۱۶} لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ {۱۷} يَوْمَ يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا فَيَحْلِفُوْنَ لَهٗ كَمَا يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ عَلٰى شَيْءٍ ؕ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْكٰذِبُوْنَ {۱۸} اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ فَاَنْسٰىهُمْ ذِكْرَ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ؕ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ {۱۹} المجادلة.

جواب ترجمہ: کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن پر اللہ کا غضب ہوا نہ وہ تم میں سے ہیں نہ ان میں سے، اور وہ جانتے ہوئے جھوٹ پر قسم کھاتے ہیں، اللہ نے ان کے لیے سخت عذاب تیار کر رکھا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بہت برے ہیں وہ کام جو یہ کرتے رہے ہیں۔ انہوں نے اپنی قسموں کو ایک ڈھال بنالیا ہے۔ پھر وہ دوسروں کو اللہ کے راستے سے روکتے رہے ہیں۔ اس لیے ان کے لیے ایسا عذاب ہے جو ذلیل کر کے رکھ دے گا۔ ان کے مال اور ان کی اولاد اللہ کے مقابلے میں ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔ یہ دوزخ والے ہیں۔ یہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے۔

جس دن اللہ ان سب کو دوبارہ زندہ کرے گا تو اس کے سامنے بھی یہ اسی طرح قسمیں کھائیں گے جیسے تمہارے سامنے کھاتے ہیں، اور یہ سمجھیں گے کہ انہیں کوئی سہارا مل گیا ہے۔ یاد رکھو یہ لوگ

بالکل جھوٹے ہیں۔ ان پر شیطان نے پوری طرح قبضہ جما کر انہیں اللہ کی یاد سے غافل کر دیا ہے۔ یہ شیطان کا گروہ ہے۔ یاد رکھو شیطان کا گروہ ہی نامراد ہونے والا ہے۔

معالم التنزیل میں لکھا ہے کہ یہ آیات منافقین کے بارے میں نازل ہوئیں جنہوں نے ظاہراً اسلام کا دعویٰ کیا لیکن اندر سے یہودیوں سے دوستی جاری رکھی مومنین کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے کی وجہ سے جو ان کے راز معلوم ہو جایا کرتے تھے وہ یہودیوں تک پہنچا دیا کرتے تھے۔

اس کے بعد ایک قصہ یوں نقل کیا ہے کہ عبداللہ بن نبتل نامی ایک یہودی تھا وہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آکر بیٹھا کرتا تھا پھر آپ کی باتیں (جو عام کرنے کی نہ تھیں) یہودیوں کو پہنچا دیتا تھا ایک دن یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اپنے حجرہ میں تشریف رکھتے تھے آپ نے خود ہی فرمایا کہ ابھی ایک شخص آئے گا جس کا قلب جبار ہے اور وہ شیطان کی آنکھوں سے دیکھتا ہے اس شخص کی آنکھیں نیلی تھیں جب پہنچ گیا تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تو اور تیرے ساتھی مجھے برے الفاظ میں کیوں یاد کرتے ہیں ؟ وہ قسم کھا گیا کہ نہیں ایسی بات تو نہیں ہے اور اپنے ساتھی کو بھی لے کر آگیا وہ بھی اسی طرح جھوٹی قسمیں کھا گیا اس پر اللہ تعالیٰ شانہ نے یہ آیات نازل فرمائیں۔

ارشاد فرمایا اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا کیا آپ نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جو ان لوگوں سے دوستی رکھتے ہیں جن پر اللہ کا غصہ ہے (ان سے یہودی مراد ہیں) ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ یہ لوگ یہودیوں سے ان کا دوست بن کر ملتے ہیں اور تمہارے پاس آکر یہ بتاتے ہیں کہ ہم تم میں سے ہیں، اور یقینی قطعی بات یہ ہے کہ یہ لوگ نہ ان میں سے ہیں نہ تم میں سے (جو شخص مطلب کا یار ہوتا ہے وہ ظاہر میں ہر اس شخص اور اس جماعت کا ساتھی بن جاتا ہے جس سے مفاد وابستہ ہو، لیکن اخلاص کے ساتھ وہ کسی کا بھی دوست نہیں ہوتا)، منافق ہر فریق کے پاس جا کر یہ کہتا ہے کہ میں تمہارا ہوں لیکن حقیقت میں وہ کسی کا بھی نہیں ہوتا، اسی کو سورۃ النساء میں فرمایا ہے مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى

هٰۤؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰۤؤُلَآءِ نہ وہ ان کی طرف ہیں نہ ان کی طرف، جو اعمال کرتے ہیں وہ بھی دکھاوے کے لئے تاکہ ان کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھیں کہ یہ ہمارے ساتھ ہے حالانکہ وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں ہوتے۔ ان منافقوں کے بارے میں یہ بھی فرمایا کہ یہ لوگ جھوٹی قسم کھاتے ہیں اور یہ قسم بھی غلط فہمی کی وجہ سے نہیں ہوتی بلکہ یہ جانتے ہوئے جھوٹی قسم کھاتے ہیں کہ ہم جھوٹ بول رہے ہیں جھوٹی قسم کھا رہے ہیں۔ (تفسیر انوار البیان)

پھر فرمایا اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا (الآیات الثلث) اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے سخت عذاب تیار فرمایا ہے، یہ برے عمل کرتے تھے جھوٹی قسموں کو اپنے لئے ڈھال بنالیتے تھے اور اس طرح اللہ کی راہ سے روکتے تھے ان کے لئے عذاب شدید بھی ہے اور عذاب مہین بھی یعنی ”ذلیل کرنے والا عذاب“ یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے جو منافقانہ طرز اختیار کیا ہے اس میں ہمارے مالوں کی حفاظت بھی ہے اور ہماری اولاد کی بھی، ان کا یہ سمجھنا غلط ہے جب قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کا حکم ہو گا کہ انہیں دوزخ میں لے جاؤ تو وہاں عذاب سے چھڑانے کے لئے نہ کوئی مال نفع دے گا نہ اولاد کام آئے گی جن کی حفاظت کے لئے یہ مکر و فریب اختیار کرتے رہے ہیں اور اپنی آخرت خراب کرتے ہیں وہ لوگ اللہ کے عذاب سے چھڑانے کے لئے کچھ بھی نہیں کر سکتے ان کو دوزخ میں جانا ہی ہو گا اور اس میں ہمیشہ رہنا ہو گا۔ (تفسیر انوار البیان)

اس کے بعد ان لوگوں کی جھوٹی قسم کو بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے مسلمانو! اتنی ہی سی بات نہیں ہے کہ دنیا میں تمہارے سامنے یہ جھوٹی قسمیں کھا جاتے ہیں ان کی بدحالی کا تو یہ عالم ہے کہ قیامت کے دن جب اللہ تعالیٰ انہیں قبروں سے اٹھائے گا اور میدان حشر میں حاضر فرمائے گا اور وہاں ان سے ان کے کفر اور ان کی شرارتوں کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو وہاں بھی اللہ تعالیٰ کے حضور میں جھوٹی قسمیں کھا جائیں گے۔

أَلَآ إِنَّهُمْ هُمُ الْكَاذِبُونَ: خوب سمجھ لیا جائے کہ یہ لوگ جھوٹے ہی جھوٹے ہیں، جھوٹ بھی بولتے ہیں اور اسے کمال بھی سمجھتے ہیں اور یوں سمجھتے ہیں کہ دیکھو ہم کیسے اچھے رہے جھوٹ بولا تو کیا ہے اپنا کام تو نکال ہی لیا، دنیا کی مطلب پرستی کی طرف ان کو دھیان ہے آخرت کے عذاب کی طرف کچھ دھیان نہیں۔ (تفسیر انوار البیان)

اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطٰنُ: (شیطان نے ان پر غلبہ پالیا سو انہیں اللہ کی یاد بھلادی) اللہ کی یاد سے غافل ہیں تو آخرت کے مواخذہ اور محاسبہ سے بھی غافل ہیں بس ان کے سامنے دنیا ہی دنیا ہے چونکہ شیطان کا ان پر غلبہ ہے وہ ان پر برے اعمال کو اچھا کر کے پیش کرتا ہے اور کفر اور شرک اور معاصی میں ان کا فائدہ بتاتا ہے اس لیے یہ لوگ شیطان ہی کے ہو کر رہ گئے ہیں

اُولٰٓئِكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ: (ان کا گروہ شیطان کا گروہ ہے) یہ لوگ سمجھ رہے ہیں کہ ہم کامیاب ہیں ان کی یہ غلط فہمی قیامت کے دن دور ہو جائے گی جب خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَ اَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ کا مصداق بنیں گے نہ کچھ مال پاس ہو گا نہ اولاد فائدہ دے گی اور اپنی جانوں کو عذاب سے چھڑانے کی کوئی راہ نہ پائیں گے بربادی کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا، اسی کو فرمایا اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۱۹ (خبردار اس میں کوئی شک نہیں کہ شیطان کا گروہ برباد ہی برباد ہے)۔ (انوار البیان)

قرآن کریم منافقین کی سیاہ کاریوں سے متعلق گفتگو کرتے ہوئے نبی کریم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے کہہ رہا ہے کہ کیا آپ ﷺ نے ان منافقین کی طرف دھیان نہیں فرمایا، جنہوں نے یہودیوں کے ساتھ دوستیاں قائم کرلی ہیں، حالانکہ یہ منافقین حقیقت میں مسلمان ہیں اور نہ ہی یہودی، جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اپنے کو مسلمان جتاتے اور بتاتے ہیں، قسمیں کھا کھا کر آپ ﷺ کے بارے میں یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔

انہیں اپنی قسموں پر اعتبار نہیں ہے، قسمیں کھانے کے باوجود وہ اپنے کو جھوٹا خیال کرتے ہیں، ان منافقوں کے لیے تو ہم نے سخت دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے، ان کا ایک کام نفاق والا بہت برا

ہے، دوسرا جھوٹی قسمیں کھانا ان کا بہت برا کام ہے، انہوں نے اپنی جھوٹی قسموں کو ڈھال بنا رکھا ہے، تاکہ ان کے کفر کے سبب انہیں قتل نہ کیا جائے اور مسلمان ان کی گردنیں مارنے سے رکے رہیں اور ان کے مال ہتھیائے نہ جائیں۔

ان کی یہی باتیں ہیں جن کی وجہ سے انہوں نے اپنے آپ کو اور دوسروں کو اسلام قبول کرنے سے روکا ہوا ہے، اس لیے یہ ذلت آمیز عذاب سے دوچار ہوں گے، اس لیے کہ ایمان باللہ، ایمان بالرسول اور راہ حق کی طرف آنے میں ان کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ان کا استکبار اور غرور ہے۔

جن چیزوں پر یہ لوگ اتراتے، تکبر کرتے اور بڑے بنتے ہیں وہ یا تو ان کا مال ہے، یا ان کی اولاد ہے، یہ دونوں چیزیں ان کو اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا نہیں سکیں گی، یہ دوزخی ہیں اور اس میں داخل ہوں گے اور ہمیشہ وہاں رہیں گے، دوزخ سے نکلنے نہ پائیں گے، یہ جزا ہر اس شخص کے لیے عام ہے جو اپنے قول و فعل کے ذریعے اللہ کے دین سے لوگوں کو روکتا ہے۔

بروز محشر سب منافقین قبروں سے اٹھائے جائیں گے، اس وقت یہ زندہ ہوں گے، پھر یہ وہاں بھی قسمیں کھائیں گے کہ ہم تو ایمان والے تھے، جیسے وہ دنیا کی زندگانی میں جھوٹی قسمیں کھا کھا کر اہل ایمان کو دھوکہ دیتے تھے، وہاں ان کا یہ خیال ہو گا کہ جھوٹی قسمیں اللہ کے ہاں انہیں فائدہ دیں گی جس طرح دنیا میں جھوٹی قسمیں مسلمانوں کے ہاں انہیں فائدہ دے دیتی تھیں۔

یہ منافقین کذب اور دروغ گوئی کی ان انتہاؤں کو پہنچے ہوئے ہیں جہاں کوئی اور نہیں پہنچا ہوا، ان پر شیطان نے غلبہ پالیا ہے، یہ شیطانی شکنجے میں آچکے ہیں، یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اللہ کے احکامات کو پس پشت ڈال دیا ہے، اس کے احکامات کی اطاعت نہیں کرتے، یہ شیطانی لشکر کا حصہ بن چکے ہیں، شیطان کے پیروکار بن چکے ہیں، اور انہیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین رہنا چاہیے کہ شیطانی گروہ، شیطانی لشکر، شیطانی ٹولے اور جماعتیں دنیا اور آخرت دونوں جہاں میں کامیابی اور کامرانی سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں، دائمی خسران و خذلان ان کا مقدر بنے گا۔

اللہ اور رسولوں کا غلبہ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ یُحَآدُّوۡنَ اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗۤ اُولٰٓئِکَ فِی الۡاَذَلِّیۡنَ {۲۰} کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغۡلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیۡ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیۡزٌ {۲۱} المجادلہ

جواب ترجمہ: بیشک جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں، وہ ذلیل ترین لوگوں میں شامل ہیں۔ اللہ نے یہ بات لکھ دی ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب آئیں گے۔ یقین رکھو کہ اللہ بڑی قوت والا، بڑے اقتدار والا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے انجام کار کے بارے میں یہاں آگاہ فرمایا ہے جو اللہ اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عداوت و دشمنی رکھتے ہیں، ان کی مخالفت کرتے ہیں، اللہ اور رسول اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود کو پھلانگتے ہیں اور اللہ اور رسول اللہ کے ساتھ اس طرح معاملہ روا رکھتے ہیں جس طرح کسی زمین کے تنازع میں لڑنے والوں کا اپنے مخالف فریق سے معاملہ ہوتا ہے، پھر جب ایک فریق ان میں سے غالب آجاتا ہے تو وہ ایسی حد بندی کر دیتا ہے جسے پھلانگا نہیں جاسکتا، جسے دوسرا مخالف اور دوسرا فریق عبور نہیں کر سکتا۔ زمین کے تنازع میں کوئی ایک شخص کسی دوسرے فریق کو اس وقت تک نیچا نہیں دکھا سکتا ہے جب تک کہ اس فریق کے ہمراہ بہت زیادہ مددگار، معاونین، مساعدین اور پیروکار نہ ہوں، جب یہ سارے لوگ کسی ایک فریق کی پشت پر موجود ہوتے ہیں تو یہ فریق اپنے کو بہت زیادہ طاقت ور خیال کرتا ہے، وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس سے زیادہ کسی دوسرے میں کوئی قوت، طاقت اور بسالت نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ اسی غرور، اسی تکبر اور بڑائی کی نفی فرمارہے ہیں کہ اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی مخالفت اور معاندت کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ اذل یعنی بہت زیادہ ذلیل و رسوا کر دیں گے، اللہ کی مخلوق میں

اولین اور آخرین سب میں اسے ذلیل ترین قرار دے دیں گے، جب دو فریقوں میں سے کوئی ایک فریق دوسرے فریق سے طاقت ور ہوتا ہے تو ذلت اور تذلیل بھی اسی طاقت اور کمزوری کی بدولت ہوتی ہے۔

دو فریقوں میں سے ایک فریق جس قدر زیادہ عزت اور مرتبے والا ہو گا، اسی قدر دوسرا فریق ذلیل ہو گا، جب اللہ تعالیٰ عزت والا ہے، اس کی عزت غیر متناہی ہے، اسی طرح جب اللہ کے ساتھ لڑنے والا، اللہ کی مخالفت کرنے والا، رسول اللہ کی مخالفت کرنے والا فریق غیر متناہی ذلت کا شکار ہو گا۔

ان ذلیل ترین لوگوں کو قیدی بنایا جائے گا، انہیں دنیا میں قتل کر کے ان کے خون کی رنگینی سے دھرتی کو لالہ زار بنایا جائے گا اور آخرت میں دوزخ کا عذاب ان کا مقدر ہو گا، چاہے یہ اہل فارس ہوں، چاہے یہ اہل روم ہوں، یا ان سے بھی کوئی بڑی پاور اور طاقت کیوں نہ ہو، چاہے یہ کافر ملوک و سلاطین ہوں یا فاسق و گنہ گار بادشاہ۔

اللہ تعالیٰ نے یہاں فرمایا کہ لکھ لیا ہے کہ میں اور میرے رسول ہی غالب رہیں گے، یہ لکھت سے مراد لوح محفوظ میں لکھنا ہے، یہاں غلبہ کا ذکر کیا گیا ہے، غلبہ یا تو دلائل و براہین کے ساتھ ہوتا ہے، یا پھر سیف و سنان، اسلحہ اور شمشیروں سے ہوتا ہے، دلائل و براہین کے ساتھ غلبہ تو تمام انبیاء کرام اور رسولوں کے لیے ہو چکا ہے، اس لیے کہ وہ اس میدان کے فاتح رہے، وہ کامیاب و کامران رہے، ان کی دنیا اور آخرت دونوں ہی بہترین رہیں۔

جہاں تک معاملہ ہے شمشیر و سنان کے ساتھ غلبے کا تو یہ سب کے لیے ثابت نہیں ہوا، کیونکہ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جنہیں لڑائی کا حکم ہی نہیں تھا، علامہ زجاج فرماتے ہیں کہ انبیاء اور رسولوں کا غلبہ دو قسموں پر ہے، ان میں جن کو لڑائی کے ذریعے غلبے کے لیے مبعوث کیا گیا وہ لڑائی کے ساتھ ہی غالب ہوئے، جنہیں لڑائی کا حکم نہیں دیا گیا تھا وہ دلائل و براہین کے ساتھ غالب رہے، ہاں دلائل

کے ساتھ جب شمشیر وسناں بھی شامل ہو گئے تو یہ غلبہ زیادہ مضبوط ہو گیا۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل ایمان کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے مکہ، طائف، خیبر اور اس کے ارد گرد کے علاقے فتح کر دیے تو ہم امید رکھیں گے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں فارس وروم پر غلبہ عطا فرمائے، یہ بات جب رئیس المنافقین عبد اللہ بن ابی تک پہنچی تو اس نے کہا کہ کیا تم لوگ فارس وروم کو یہاں کی بستیوں کی طرح خیال کرتے ہو جن پر تم غالب ہو چکے ہو، اللہ کی قسم! ان کی تعداد بہت زیادہ ہے، ان کی گرفت تمہاری سوچ وفکر سے بہت سخت ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرمادیں۔

حضرت بقلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے روز ازل سے یہ بات طے کی ہوئی ہے کہ وہ اپنے ولیوں کی اپنے دشمنوں کے مقابلے میں مدد ونصرت کریں گے، ظاہری وباطنی شیاطین کے مقابلے میں اپنے ولیوں کی دستگیری فرمائیں گے، انہیں جن جھنڈوں سے نوازا جائے گا انہیں نصرۃ الولایت کا نام دیا گیا ہے، جب ان کے یہ جھنڈے ظاہر ہوں گے تو ہیبت حق کا نور ان کے چہروں سے چمکے گا، یوں دشمن اللہ کی تائید اور نصرت سے مغلوب ہو جائیں گے۔

حضرت ابو بکر بن طاہر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل حق کے لیے ہمیشہ غلبہ ہوتا ہے، حق کے جھنڈے دوسروں کے جھنڈوں سے نمایاں دکھائی دیتے ہیں، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی مخلوق میں نمایاں کرنا ہوتا ہے، حق والے لوگ زمین میں اللہ کی طرف سے میخیں اور کیل ہوتے ہیں، اللہ کے بندوں کے لیے جائے پناہ ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اہل حق سے شہروں کو آباد کرتے ہیں، جو شخص ان کے ساتھ برائی کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے منہ کے بل گرادیتے ہیں، اللہ تعالیٰ اس کی ظاہری عزت، ٹھاٹھ باٹھ کو خاک میں ملادیتے ہیں۔

یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کر سکتے ہیں، اس لیے کہ وہ قوی ذات ہے، اسے ہر طرح کی قوت حاصل ہے، قوی وہ ہوتا ہے جس کی ذات اور صفات میں کوئی کمزوری نہ ہو، اسی طرح اس کے افعال میں بھی

کوئی کمزوری نہ ہو، اسے نیند اور تھکاوٹ نہ آئے، اس میں کوئی کمی اور نقص نہ آئے۔

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ: یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی اس سنت کا اعلان فرمایا ہے جو ازل ہے اس نے لکھ رکھی ہے کہ جو کشمکش اللہ و رسول اور حزب الشیطان کے درمیان برپا ہو گی اس میں غلبہ اللہ اور اس کے رسولوں کو حاصل ہو گا، شیطان کی پارٹی ذلیل و خوار ہو گی۔

رسول جتنے بھی دنیا میں آئے وہ جس قوم کے اندر آئے اس کے لیے خدا کی عدالت بن کر آئے۔ اس کے بعد اس قوم کا لازماً فیصلہ ہو گیا، اگر قوم نے بحیثیت مجموعی رسول کی تکذیب کر دی تو اس کے اندر سے رسول اور اس پر ایمان لانے والے افراد کو الگ کر کے باقی قوم کو اللہ تعالیٰ نے اپنے کسی عذاب کے ذریعہ سے فنا کر دیا اور اگر ایمان لانے والوں کی تعداد معتد بہ ہوئی تو اتمام حجت کے بعد اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ وہ جہاد کے لیے تلوار اٹھائیں اور ان اعدائے حق سے مقابلہ کر کے ان کا زور توڑ دیں کہ زمین ان کے فتنہ سے پاک ہو جائے۔

قرآن نے رسولوں کی جو تاریخ پیش کی ہے ان میں سے اکثر کو پہلی صورت پیش آئی یعنی رسول اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد قوم پر اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کن عذاب آگیا۔ صرف آنحضرت ﷺ کے معاملے میں دوسری صورت پیش آئی کہ ہجرت کے بعد آپ کو جہاد کا حکم ہوا اور آپ کے اعداء نے آپ کے صحابہ کی تلوار سے شکست کھائی یہاں تک کہ ان کا بالکل قلع قمع ہو گیا۔ (تدبر قرآن)

اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ: یہ اس دعوے کی دلیل بیان ہوئی ہے کہ کیوں اللہ اور اس کے رسولوں کے لیے غلبہ لازمی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کوئی کمزور ہستی نہیں ہے بلکہ وہ قوی و عزیز ہے۔

جب اپنے بندوں کے پاس اپنا رسول بھیجتا ہے تو وہ رسول اللہ کا سفیر ہوتا ہے جو لوگوں کے پاس ان کے حقیقی بادشاہ کے احکام سے آگاہ کرنے کے لیے آتا ہے۔ اگر لوگ اپنے مالک حقیقی کے احکام کی بجا آوری کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ زمین میں ان کو اقتدار بخشتا اور ان کو اپنے افضال و عنایات سے نوازتا ہے اور اگر وہ خود اللہ سے مقابلہ کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں تو وہ باغی قرار پاتے

ہیں اور اتمام حجت کے بعد اللہ تعالیٰ ان باغیوں کے وجود سے اپنی زمین کو پاک کر دیتا ہے۔ (تدبر)

غیرت ایمانی سے سرشار مسلمان

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ اُولٰٓئِكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ {۲۲} المجادلة.

جواب ترجمہ: جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں، ان کو تم ایسا نہیں پاؤ گے کہ وہ ان سے دوستی رکھتے ہوں، جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی ہے، چاہے وہ ان کے باپ ہوں، یا ان کے بیٹے یا ان کے بھائی یا ان کے خاندان والے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں میں اللہ نے ایمان نقش کر دیا ہے، اور اپنی روح سے ان کی مدد کی ہے، اور انہیں وہ ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا ہے اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے ہیں۔ یہ اللہ کا گروہ ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ اہل ایمان ویقین میں ایسی سپرٹ اور ایسا جذبہ پیدا فرمادیتے ہیں کہ وہ کسی طور ان لوگوں کو اپنا دلی دوست، اپنا رازدان، اپنا خیر خواہ نہیں بنا سکتے جو اللہ اور رسول اللہ کے مخالف اور معاند ہوں۔ یہاں اللہ تعالیٰ توجہ دلا رہے ہیں کہ اے رسول! جو لوگ اللہ کو سچا جانتے اور مانتے ہیں، قیامت کے دن کو سچا جانتے ہیں اور ان چیزوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے مشروع قرار دی ہیں، یہ لوگ ان لوگوں کو دوست نہیں بنا سکتے جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ سے دشمنی روا رکھی ہو، اور ان کے احکامات کی مخالفت کرنے والوں کے ساتھ بھی وہ یارانہ نہیں رکھ سکتے۔

وہ لوگ غیرت ایمانی اور ایقانی کے اس مرتبے پر فائز ہیں کہ ان کے نزدیک اللہ اور رسول اللہ ﷺ کو اولین مقام حاصل ہے، ان کے مقابلے میں وہ اپنے آباؤاجداد، اپنے ابناء وبرادران، اپنے اقربا اور کنبہ قبیلہ کی پروا نہیں کرتے، ان لوگوں کی دوستی اور تعلق اللہ ہی کے ساتھ ہوتا ہے، اللہ ہی کے لیے وہ اپنے اعزہ واقربا سے دشمنی رکھتے ہیں، ان کی دوستی اللہ کے لیے ہوتی ہے اور دشمنی بھی اللہ کے لیے ہوتی ہے۔

اس قدر ایمانی ایقانی جذبات صادقہ کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایمان کی دولت سے مالا مال اور سرشار کیا ہوا ہے، ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست ہو چکا ہے، اللہ کی نصرت اور مدد نے ایمان ان کے دل میں مضبوط کر دیا ہے، اللہ نے انہیں ان کے دشمن کے مقابلے میں مستحکم کر دیا ہے۔

ان لوگوں کی کامرانی اور کامیابی ظاہر باہر ہے، دنیا میں ایمان کی دولت مل گئی، آخرت میں اللہ تعالیٰ انہیں جنت میں داخل کر دے گا، جس کے درختوں کے نیچے سے نہریں رواں دواں ہوں گی، ایک لمبے اور طویل عرصے تک یہ لوگ لطف اندوز ہوتے رہیں گے، یہ زمانہ کبھی ختم نہیں ہو گا، اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے راضی ہو جائے گا اور کبھی ان سے ناراض نہیں ہو گا۔

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی راضی ہو جائیں گے، اللہ نے انہیں جو نعمتیں عطا فرمائیں، جو بزرگی اور کرامت انہیں ملی، یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی ان عطاؤں اور نوازشوں پر بہت ہی خوش وخرم ہوں گے، انہی لوگوں کو خدائی لشکر کہا گیا ہے، انہی کو حزب اللہ کہا گیا ہے، انہی لوگوں کو اللہ کے ولی اور دوست کہا گیا ہے، یہی لوگ کامیاب، کامران اور بامراد ہوں گے، یہی لوگ ہیں جو دنیا کی سعادتیں سمیٹنے کے بعد آخرت کی سعادتیں سمیٹیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان لوگوں میں شامل فرمادے۔ آمین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی (کان اللہ لہ)

۲۵ ذیقعد ۱۴۳۹ھ بروز بدھ، شب سوا بارہ بجے

تعارف سورۃ الحشر

سوال سورۃ الحشر کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الحشر مدنی سورت ہے، اس کی آیات کی تعداد ۲۴ ہے، اسے "سورۃ بنی النضیر" بھی کہا جاتا ہے، کیونکہ اس میں یہودی قبیلہ بنی نضیر کے واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں: سورۃ الحشر کو سورۃ بنی النضیر کہو۔ اس سورت کا نزول غزوہ بنی نضیر کے بعد ہوا۔

وجہِ تسمیہ: **الحَشْر** عربی زبان میں جمع کرنے، اکٹھا کرنے، ہانک کر نکالنے کو کہتے ہیں، اس سورت کا نام الحشر اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس میں یہودی قبیلہ بنو نضیر کے اس واقعے کا بیان ہے جنہیں ان کی بدعہدی، سازش اور عہد شکنی کی وجہ سے مدینہ منورہ سے جمع (حشر) کر کے جلا وطن کر دیا گیا۔ واقعہ کا پس منظر کچھ یوں تھا، بنو نضیر مدینہ کے یہودی قبیلوں میں سے تھے، انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی، نبی کریم ﷺ کو شہید کرنے کی سازش کی، نتیجتاً اللہ کے حکم سے رسول اللہ ﷺ نے ان کا محاصرہ کیا، بالآخر وہ اپنے گھروں، قلعوں اور مال و متاع کو چھوڑ کر ذلت و رسوائی کے ساتھ مدینہ سے نکال دیے گئے، اسی اجتماعی جلاوطنی کو قرآن نے "حشر" سے تعبیر کیا۔

سورۃ الحشر کا آغاز اسی حقیقت کو واضح کرتا ہے، **هُوَ الَّذِي أَخْرَجَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مِنْ دِيَارِهِمْ لِأَوَّلِ الْحَشْرِ** (الحشر: ۲) وہی ہے جس نے اہلِ کتاب میں سے کافروں کو ان کے گھروں سے پہلے حشر کے لیے نکالا۔ تو یہ نام بنو نضیر کے اجتماعی انخلا اور جلاوطنی کی وجہ سے رکھا گیا۔ سورت کا یہ نام اللہ کی قدرت مسلمانوں کی نصرت اور بدعہد قوموں کے انجام کی عبرت ناک مثال پر دلالت کرتا ہے۔

شانِ نزول: بنی نضیر مدینہ کے یہودی قبیلہ تھے، رسول اللہ ﷺ نے ان سے صلح کی تھی کہ وہ نہ آپ ﷺ کے خلاف ہوں گے اور نہ آپ ﷺ کے ساتھ لڑیں گے، لیکن جب غزوہ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو بنی نضیر نے عہد شکنی کی، کفار کے ساتھ ساز باز کی اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں

کیں، رسول اللہ ﷺ نے ان کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا، منافقین نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کا ساتھ دیں گے، لیکن جب مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا تو منافقین نے ساتھ نہ دیا، آخر کار بنی نضیر کو مدینہ سے جلاوطن ہونا پڑا، اس واقعہ کی تفصیل اس سورت میں بیان ہوئی ہے۔

اہم مضامین :① اللہ کی تسبیح وعظمت: سورت کی ابتدا میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح اور اس کی صفات "عزیز" اور "حکیم" بیان کی گئی ہیں، تمام مخلوقات اللہ کی تسبیح کرتی ہیں۔

② بنی نضیر کا انجام: یہودی قبیلہ بنی نضیر کی عہد شکنی، ان کی سازشیں، مسلمانوں کا محاصرہ، اور ان کا جلاوطن ہونا تفصیل سے بیان کیا گیا ہے، ان کے انجام کو عبرت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

③ اللہ کی قدرت اور تدبیر: اللہ تعالیٰ نے بنی نضیر کے دلوں میں رعب ڈال دیا، ان کے مضبوط قلعے اور حصار انہیں اللہ کے عذاب سے نہ بچا سکے، اللہ کی قدرت اور تدبیر ہر چیز پر غالب ہے۔

④ مال فئی اور اس کے احکام: سورت میں مالِ فیء (وہ مال جو بغیر جنگ کے مسلمانوں کے ہاتھ آئے) کے احکام بیان کیے گئے ہیں کہ یہ مال کن لوگوں میں تقسیم کیا جائے گا، اور اس میں رسول اللہ ﷺ، مہاجرین، انصار اور دیگر مستحقین کا ذکر ہے۔ ⑤ منافقین کی حقیقت: منافقین کی سازشیں اور ان کی حقیقت بیان کی گئی ہے کہ وہ یہودیوں کو دھوکہ دیتے رہے، لیکن وقتِ ضرورت ان کا ساتھ نہ دیا۔

⑥ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفات: مہاجرین وانصار کی قربانی، ایثار اور ایمان کی تعریف کی گئی ہے۔ انصار نے مہاجرین کو اپنے مال و دولت میں شریک کیا اور ان پر ترجیح دی۔ ⑦ قرآنی عظمت اور نصیحت: سورت کے آخر میں قرآن کی عظمت بیان کی گئی ہے کہ اگر یہ قرآن کسی پہاڑ پر نازل ہوتا تو وہ خوفِ خدا سے ریزہ ریزہ ہو جاتا، اس میں اللہ کی صفات اور اس کی عظمت کا بیان ہے۔

المختصر: سورۃ الحشر میں اللہ کی تسبیح، بنی نضیر کے انجام، اللہ کی قدرت، مالِ فیء کے احکام، منافقین کی حقیقت، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی صفات اور قرآن کی عظمت جیسے اہم مضامین بیان کیے گئے ہیں، اس سورت میں مسلمانوں کو عبرت، نصیحت اور اللہ کی قدرت و تدبیر پر ایمان کی دعوت دی گئی ہے۔

سورۃ الحشر

مخلوق کی تسبیح خوانی

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ {۱} الحشر

جواب ترجمہ: اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں جو بھی آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں اور وہ عزیز ہے حکیم ہے۔

تسبیح اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اس کے افعال کو ہر عیب سے منزہ ٹھہرانے کا نام ہے یعنی اس کا اصل استعمال اللہ تعالیٰ کی تنزیہہ کے لیے ہوتا ہے، اس لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمین میں اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی مخلوقات ہیں چاہے وہ ہمارے نزدیک ذی روح ہوں یا جامد اور مردہ، سب اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور اس کے افعال کی پاکی بیان کرتی ہیں اور یہ کام مخلوقات نے ہر دور میں کیا ہے۔ ماضی میں بھی کیا ہے، حال میں بھی جاری ہے اور مستقبل میں بھی ہو گا، اسی لیے قرآن کریم نے کہیں اس کے لیے فعل ماضی استعمال کیا ہے اور کہیں فعل مضارع استعمال کیا ہے۔ (تفسیر روح القرآن)

دوسری بات اس آیت کریمہ میں یہ فرمائی گئی ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور اس کے افعال ہر طرح کی کمزوری، عیب اور نارسائی سے پاک ہیں، اسی طرح اس کے احکام بھی اپنی تنفیذ میں حتمی اور محکم ہیں، کوئی مخلوق اس کی نافرمانی کرنے پر قادر نہیں، البتہ جن مخلوقات کو اللہ تعالیٰ نے فی الجملہ اس کا اختیار دے رکھا ہے وہ بھی نافرمانی کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔

اس لیے اس کا علم بھی لامحدود ہے اور اس کی قدرت بھی بے پناہ ہے کیونکہ وہ عزیز اور غالب ہے جسے کسی مرحلے پر چیلنج نہیں کیا جاسکتا، البتہ اس کا اقتدارِ مطلق اور اس کی قدرت کاملہ چونکہ ہر

کمزوری اور ہر عیب سے پاک ہیں اس لیے وہ اپنے اظہار میں صرف قدرت کی نمود نہیں رکھتے بلکہ ان کا اظہار کامل علم اور کامل حکمت کے ساتھ ہوتا ہے۔

بلاشبہ اقتدار مقتدر کو اندھا کر دیتا ہے، غصہ آئے تو بے قابو ہو جاتا ہے، انتقام پر اتر آئے تو عدل کے تقاضوں کو بھول جاتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی قدرت باقی صفات کی طرح اپنے اندر بھی پاکیزگی کی شان رکھتی ہے، اس لیے جب بھی اس کا اظہار ہوتا ہے تو حکمت کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے، اسی لیے یہاں عزیز کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے حکیم کی صفت کا استعمال کیا گیا ہے۔ (روح القرآن)

یہود کی مدینہ سے جلاوطنی

سوال ان آیات کریمہ کی تفسیر کیجیے، نیز بتائیے کہ ان میں کن لوگوں کا تذکرہ ہے؟

هُوَ الَّذِیْٓ اَخْرَجَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مِنْ دِیَارِهِمْ لِاَوَّلِ الْحَشْرِ ؕ مَا ظَنَنْتُمْ اَنْ یَّخْرُجُوْا وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مَّانِعَتُهُمْ حُصُوْنُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَاَتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ حَیْثُ لَمْ یَحْتَسِبُوْا ۗ وَقَذَفَ فِیْ قُلُوْبِهِمُ الرُّعْبَ یُخْرِبُوْنَ بُیُوْتَهُمْ بِاَیْدِیْهِمْ وَاَیْدِی الْمُؤْمِنِیْنَ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ۝۲ وَلَوْلَآ اَنْ كَتَبَ اللّٰهُ عَلَیْهِمُ الْجَلَآءَ لَعَذَّبَهُمْ فِی الدُّنْیَا ؕ وَلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابُ النَّارِ ۝۳ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ یُّشَآقِّ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ شَدِیْدُ الْعِقَابِ ۝۴ مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّیْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَآىِٕمَةً عَلٰٓى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِیُخْزِیَ الْفٰسِقِیْنَ ۝۵ وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْهِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ یُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۶ الحشر.

جواب ترجمہ: وہی ہے جس نے اہل کتاب میں سے کافر لوگوں کو ان کے گھروں سے پہلے اجتماع کے موقع پر نکال دیا۔ (مسلمانو) تمہیں یہ خیال بھی نہیں تھا کہ وہ نکلیں گے، اور وہ بھی یہ سمجھے ہوئے

تھے کہ ان کے قلعے انہیں اللہ سے بچالیں گے۔ پھر اللہ ان کے پاس ایسی جگہ سے آیا جہاں ان کا گمان بھی نہیں تھا، اور اللہ نے ان کے دلوں میں رعب ڈال دیا کہ وہ اپنے گھروں کو خود اپنے ہاتھوں سے بھی اور مسلمانوں کے ہاتھ سے بھی اجاڑ رہے تھے۔ لہٰذا اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو۔ اور اگر اللہ نے پہلے سے نہ لکھ دیا ہوتا ان پر جلاوطن ہونا، تو انہیں سخت عذاب دیتا دنیوی زندگی میں اور آخرت میں ان کے لیے آگ کا عذاب ہے۔ یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی ٹھانی اور جو شخص اللہ سے دشمنی کرتا ہے، تو اللہ بڑا سخت عذاب دینے والا ہے۔ تم نے کھجور کے جو درخت کاٹے، یا انہیں اپنی جڑوں پر کھڑا رہنے دیا، تو یہ سب کچھ اللہ کے حکم سے تھا، اور اس لیے تھا تاکہ اللہ نافرمانوں کو رسوا کرے۔ اور اللہ نے اپنے رسول کو ان کا جو مال بھی فیئ کے طور پر دلوایا۔ اس کے لیے تم نے نہ اپنے گھوڑے دوڑائے، نہ اونٹ، لیکن اللہ اپنے پیغمبروں کو جس پر چاہتا ہے، تسلط عطا فرما دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے۔

ان آیات میں یہود بنی نضیر سے متعلق آگاہی دی گئی ہے، اہل تفسیر نے اپنے اپنے انداز میں ان آیات کی خوب تفسیر فرمائی ہے، مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ وہ عظیم ذات ہے جس نے اہل کتاب کے کافروں یعنی قبیلہ بنو نضیر کے یہودیوں کو ان کے گھروں سے نکالا۔

یہود بنی نضیر کا مختصر قصہ یہ ہے کہ مدینہ میں آکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان یہودیوں سے صلح کرلی تھی کہ نہ آپ ان سے لڑیں نہ یہ آپ سے لڑیں، لیکن ان لوگوں نے اس عہد کو توڑ دیا جن کی وجہ سے اللہ کا غضب ان پر نازل ہوا، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ان پر غالب کیا اور آپ نے انہیں یہاں سے نکال دیا، مسلمانوں کو کبھی اس کا خیال تک نہ تھا، خود یہ یہود بھی سمجھ رہے تھے کہ ان مضبوط قلعوں کے ہوتے ہوئے کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، لیکن جب اللہ کی پکڑ آئی یہ سب چیزیں یونہی رکھی کی رکھی رہ گئیں اور اچانک اس طرح گرفت میں آگئے کہ حیران رہ گئے اور آپ نے انہیں مدینہ سے نکلوا دیا، بعض تو شام کی زراعتی زمینوں میں چلے گئے جو حشر ونشر کی جگہ ہے اور بعض خیبر کی طرف جا نکلے،

ان سے کہہ دیا گیا تھا کہ اپنے اونٹوں پر لاد کر جو لے جا سکو اپنے ساتھ لے جاؤ، اس لئے انہوں نے اپنے گھروں کو توڑ پھوڑ کر جو چیزیں لے جاسکتے تھے اپنے ساتھ اٹھالیں، جو رہ گئیں وہ مسلمانوں کے ہاتھ لگیں۔

اس واقعہ کو بیان کر کے فرماتا ہے کہ اللہ کے اور اس کے رسول ﷺ کے مخالفین کا انجام دیکھو اور اس سے عبرت حاصل کرو کہ کس طرح ان پر عذاب الٰہی اچانک آپڑا اور دنیا میں بھی تباہ و برباد کئے گئے اور آخرت میں بھی ذلیل و رسوا ہو گئے اور دردناک عذاب میں جا پڑا۔ ابو داؤد میں ہے کہ ابن ابی اور اس کے مشرک ساتھیوں کو جو قبیلہ اوس و خزرج میں سے تھے کفار قریش نے خط لکھا یہ خط انہیں حضور ﷺ کے میدان بدر سے واپس لوٹنے سے پہلے مل گیا تھا اس میں تحریر تھا کہ إِنَّكُمْ آوَيْتُمْ صَاحِبَنَا، وَإِنَّا نُقْسِمُ بِاللهِ لَنُقَاتِلَنَّهُ، أَوْ لَتُخْرِجُنَّهُ، أَوْ لَنَسِيرَنَّ إِلَيْكُمْ بِأَجْمَعِنَا، حَتَّى نَقْتُلَ مُقَاتلتكم وَنَسْتَبِيحَ نِسَاءَ كُمْ، تم نے ہمارے ساتھی (حضور ﷺ) کو اپنے شہر میں ٹھہرایا ہوا ہے اور ہم نے اللہ کی قسم کھا رکھی ہے کہ ہم اس سے ضرور بہ ضرور لڑائی کریں گے یا پھر تم اسے نکال باہر کرو، یا پھر ہم تم پر اپنے لشکروں سے یکبارگی حملہ آور ہوں گے، اور تمہارے لڑنے والوں کو ہم تہ تیغ کر دیں گے اور تمہاری عورتوں لڑکیوں کو لونڈیاں بنالیں گے۔

عبداللہ بن ابی اور اس کے بت پرست ساتھیوں نے اس خط کو پا کر آپس میں مشورہ کیا اور خفیہ طور پر حضور ﷺ سے لڑائی کرنے کی تجویز بالاتفاق منظور کرلی، جب حضور ﷺ کو یہ خبریں معلوم ہوئیں تو آپ خود ان کے پاس گئے اور ان سے فرمایا کہ مجھے پتہ چلا ہے کہ لَقَدْ بَلَغَ وَعِيدُ قُرَيْشٍ مِنْكُمُ الْمَبَالِغَ، مَا كَانَتْ تَكِيدُ كُمْ بِأَكْثَرَ مِمَّا تُرِيدُ أَنْ تَكِيدُوا بِهِ أَنْفُسَكُمْ، تُرِيدُونَ أَنْ تُقَاتِلُوا أَبْنَاءَ كُمْ وَإِخْوَانَكُمْ ؟ قریشیوں کا خط کام کر گیا اور تم لوگ اپنی موت کے سامان اپنے ہاتھوں کرنے لگے ہو تم اپنی اولادوں اور اپنے بھائیوں کو اپنے ہاتھوں ذبح کرنا چاہتے ہو۔

حضور ﷺ کے اس ارشاد نے ان پر اثر کیا اور وہ لوگ اپنی اپنی جگہ چلے گئے لیکن قریش نے بدر سے فارغ ہو کر یہودیوں کو پھر سے ایک خط لکھا کہ إِنَّكُمْ أَهْلُ الْحَلْقَةِ وَالْحُصُونِ، وَإِنَّكُمْ لَتُقَاتِلُنَّ مَعَ صَاحِبِنَا أَوْ لَنَفْعَلَنَّ كَذَا وَ كَذَا، تم اہل حلقہ اور قلعوں کے والے لوگ ہو اور تم ضرور بہ ضرور ہمارے ساتھی (محمد) سے لڑو گے ورنہ ہم پھر ایسا ایسا کریں گے، مگر یہ پھر اکڑ میں آ گئے اور بنو نضیر نے صاف طور پر بد عہدی پر کمر باندھ لی اور حضور ﷺ کے پاس قاصد بھیجا کہ آپ تیس آدمی لے کر آیئے ہم میں سے بھی تیس ذی علم آدمی آتے ہیں، ہمارے تمہارے درمیان کی جگہ پر یہ ساٹھ آدمی ملیں اور آپس میں بات چیت ہو اگر یہ لوگ آپ کو سچا مان لیں اور ایمان لے آئیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ ہیں۔

اس بد عہدی کی وجہ سے دوسرے دن صبح رسول اللہ ﷺ نے اپنا لشکر لے جا کر ان کا محاصرہ کر لیا اور ان سے فرمایا کہ اب اگر تم نئے سرے سے امن وامان کا عہد وپیمان کرو تو خیر ورنہ تمہیں امن نہیں انہوں نے صاف انکار کر دیا اور لڑنے مرنے پر تیار ہو گئے، چنانچہ دن بھر لڑائی ہوتی رہی، دوسری صبح کو آپ بنو قریظہ کی طرف لشکر لے کر بڑھے اور بنو نضیر کو یونہی چھوڑا ان سے بھی یہی فرمایا کہ تم نئے سرے سے عہد وپیمان کرو انہوں نے منظور کر لیا اور معاہدہ ہو گیا۔

آپ وہاں سے فارغ ہو کر پھر بنو نضیر کے پاس آئے لڑائی شروع ہوئی، آخر یہ ہارے اور حضور ﷺ نے انہیں حکم دیا کہ تم مدینہ خالی کر دو جو اسباب لے جانا چاہو اور اونٹوں پر لاد کر لے جاؤ چنانچہ انہوں نے گھر بار کا اسباب یہاں تک کہ دروازے اور لکڑیاں بھی اونٹوں پر لادیں اور جلاوطن ہو گئے، ان کے کھجوروں کے درخت خاص رسول اللہ ﷺ کے ہو گئے اللہ تعالیٰ نے یہ آپ کو ہی دلوا دیئے، جیسے ارشاد ہے وَمَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْهُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَيْهِ مِنْ خَيْلٍ وَّلَا رِكَابٍ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُسَلِّطُ رُسُلَهٗ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ الحشر ٦)

میں ہے، لیکن آنحضرت ﷺ نے اکثر حصہ مہاجرین کو دے دیا وہاں انصاریوں میں سے صرف دو ہی حاجت مندوں کو حصہ دیا باقی سب مہاجرین میں تقسیم کر دیا۔ تقسیم کے بعد جو باقی رہ گیا تھا یہی وہ مال تھا جو رسول اللہ ﷺ کا صدقہ تھا اور جو بنو فاطمہ کے ہاتھ لگا۔

غزوہ بنو نضیر کا مختصر قصہ اور سبب یہ ہے کہ مشرکوں نے دھوکہ بازی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بیئر معونہ میں شہید کر دیا ان کی تعداد ستر تھی ان میں سے ایک حضرت عمرو بن امیہ ضمری بچ کر بھاگ نکلے مدینہ شریف کی طرف آئے، آتے آتے موقع پا کر انہوں نے قبیلہ بنو عامر کے دو شخصوں کو قتل کر دیا حالانکہ یہ قبیلہ رسول اللہ ﷺ سے معاہدہ کر چکا تھا اور آپ نے انہیں امن وامان دے رکھا تھا لیکن اس کی خبر حضرت عمرو کو نہ تھی۔ جب یہ مدینے پہنچے اور حضور ﷺ سے ذکر کیا تو آپ نے فرمایا لَقَدْ قَتَلْتَ رَجُلَيْنِ، لأَدِيَنَّهما تم نے انہیں قتل کر ڈالا اب مجھے ان کے وارثوں کو دیت یعنی جرمانہ قتل ادا کرنا پڑے گا۔

بنو نضیر اور بنو عامر میں بھی حِلف و عقد اور آپس میں مصالحت تھی اس لئے حضور ﷺ ان کی طرف چلے تاکہ کچھ یہ دیں کچھ آپ دیں اور بنو عامر کو راضی کر لیا جائے۔ قبیلہ بنو نضیر کی منازل مدینہ کے مشرق کی جانب کئی میل کے فاصلے پر تھیں، جب آپ یہاں پہنچے تو انہوں نے کہا ہاں حضور ﷺ ہم میں موجود ہیں ابھی ابھی جمع کر کے اپنے حصے کے مطابق آپ کی خدمت میں حاضر کرتے ہیں ادھر آپ سے ہٹ کر یہ لوگ آپس میں مشورہ کرنے لگے کہ اس سے بہتر موقع کب ہاتھ لگے گا۔ اس وقت آپ قبضے میں ہیں آؤ کام تمام کر ڈالو۔

چنانچہ یہ مشورہ ہوا کہ جس دیوار سے آپ لگے بیٹھے ہیں اس گھر پر کوئی چڑھ جائے اور وہاں سے بڑا سا پتھر آپ ﷺ پر پھینک دے کہ آپ ﷺ دب جائیں، عمرو بن مجاش بن کعب اس کام پر مقرر ہوا اس نے آپ ﷺ کی جان لینے کا بیڑا اٹھایا اور چھت پر چڑھ گیا، وہ چاہتا تھا کہ پتھر لڑھکا دے اتنے میں اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حضور ﷺ کے پاس بھیجا اور حکم دیا کہ آپ یہاں سے اٹھ کھڑے ہوں۔

چنانچہ آپ فوراً ہٹ گئے اور یہ بدباطن اپنے برے ارادے میں ناکام رہے۔ آپ کے ساتھ اس وقت چند صحابہ رضی اللہ عنہم تھے مثلاً حضرت ابو بکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت علی رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ آپ یہاں سے فوراً مدینہ شریف کی طرف چل پڑے، ادھر جو صحابہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ تھے اور مدینہ میں آپ کے منتظر تھے انہیں دیر لگنے کے باعث خیال ہوا اور وہ آپ کو ڈھونڈنے کے لئے نکل کھڑے ہوئے لیکن ایک شخص سے معلوم ہوا کہ آپ مدینہ شریف پہنچ گئے ہیں۔

چنانچہ یہ لوگ وہیں آئے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیا واقعہ ہے؟ آپ نے سارا قصہ کہہ سنایا اور حکم دیا کہ جہاد کی تیاری کرو مجاہدین نے کمریں باندھ لیں اور اللہ کی راہ میں نکل کھڑے ہوئے۔ یہودیوں نے لشکروں کو دیکھ کر اپنے قلعہ کے پھاٹک بند کر دیئے اور پناہ گزین ہو گئے۔

آپ نے محاصرہ کر لیا پھر حکم دیا کہ ان کے کھجور کے درخت جو آس پاس ہیں وہ کاٹ دیئے جائیں اور جلا دیئے جائیں، اب تو یہود چیخنے لگے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ آپ تو زمین میں فساد کرنے سے اوروں کو روکتے تھے اور فسادیوں کو برا کہتے تھے پھر یہ کیا ہونے لگا؟ پس ادھر تو درخت کٹنے کا غم، ادھر جو کمک آنے والی تھی اس کی طرف سے مایوسی ان دونوں چیزوں نے ان یہودیوں کی کمر توڑ دی۔

کمک کا واقعہ یہ ہے کہ بنو عوف بن خزرج کا قبیلہ جس میں عبد اللہ بن ابی بن سلول اور ودیعہ بن مالک، ابن ابو قوقل اور سوید اور داعس وغیرہ تھے ان لوگوں نے بنو نضیر کو کہلوا بھیجا تھا کہ تم مقابلے پر جمے رہو اور قلعہ خالی نہ کرو ہم تمہاری مدد پر ہیں تمہارا دشمن ہمارا دشمن ہے ہم تمہارے ساتھ مل کر اس سے لڑیں گے اور اگر تم نکلے تو ہم بھی نکلیں گے، لیکن اب تک ان کا یہ وعدہ پورا نہ ہوا اور انہوں نے یہودیوں کی کوئی مدد نہ کی، ادھر ان کے دل مرعوب ہو گئے تو انہوں نے درخواست کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہماری جان بخشی کیجئے ہم مدینہ چھوڑ جاتے ہیں لیکن ہم اپنا جو مال اونٹوں پر لاد کر لے جا سکیں وہ ہمیں دے دیا جائے آپ نے ان پر رحم کھا کر ان کی یہ درخواست منظور فرمالی اور یہ لوگ یہاں سے چلے گئے۔

جاتے وقت اپنے دروازوں تک کو اکھاڑ کر لے گئے گھروں کو گرا گئے اور شام اور خیبر میں جا کر آباد ہو گئے، ان کے باقی کے اہل خاص رسول اللہ ﷺ کے ہو گئے کہ آپ جس طرح چاہیں انہیں خرچ کریں۔ چنانچہ آپ نے مہاجرین اولین کو یہ مال تقسیم کر دیا، ہاں انصار میں سے صرف دو شخصوں کو یعنی سہل بن حنیف اور ابو دجانہ سماک بن خرشہ کو دیا اس لئے کہ یہ دونوں حضرات مساکین تھے، بنو نضیر میں سے صرف دو شخص مسلمان ہوئے جن کے مال انہی کے پاس رہے ایک تو یامین بن عمیر جو عمرو بن حجاش کے چچا کے لڑکے کا لڑکا تھا یہ عمرو وہ ہے جس نے حضور ﷺ پر پتھر پھینکنے کا بیڑا اٹھایا تھا، دوسرے ابو سعد بن وہب۔

ایک مرتبہ حضور ﷺ نے حضرت یامین سے فرمایا کہ اے یامین! **أَلَمْ تَرَ مَا لَقِيتُ مِنَ ابْنِ عَمِّكَ، وَمَا هُمْ بِهِ مِنْ شَأْنِي**، تیرے اس چچازاد بھائی نے دیکھ تو میرے ساتھ کس قدر برابر تاؤ برتا اور مجھے نقصان پہنچانے کی کس بے باکی سے کوشش کی؟ حضرت یامین نے ایک شخص کو کچھ دے کر عمرو کو قتل کرا دیا، ابن اسحاق فرماتے ہیں کہ سورۃ حشر اسی واقعہ بنو نضیر کے بارے میں اتری ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت حسن رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ جب حضور ﷺ نے بنو نضیر کو جلا وطن کیا تو فرمایا یہ اول حشر ہے اور ہم بھی اس کے پیچھے ہی پیچھے ہیں (ابن جریر) بنو نضیر کے ان قلعوں کا محاصرہ صرف چھ روز رہا تھا، محاصرین کو قلعہ کی مضبوطی یہودیوں کی زیادتی یکجہتی منافقین کی سازشیں اور خفیہ چالیں وغیرہ دیکھ کر ہرگز یہ یقین نہ تھا کہ اس قدر جلد یہ قلعہ خالی کر دیں گے۔

ادھر خود یہود بھی اپنے قلعہ کی مضبوطی پر نازاں تھے اور جانتے تھے کہ وہ ہر طرح محفوظ ہیں، لیکن امر اللہ ایسی جگہ سے آ گیا جو ان کے خیال میں بھی نہ تھی، یہی دستور اللہ کا ہے کہ مکار اپنی مکاری میں ہی رہتے ہیں اور بے خبر ان پر عذاب الٰہی آ جاتا ہے، ان کے دلوں میں رعب چھا گیا بھلا رعب

کیوں نہ چھا تا محاصرہ کرنے والے وہ تھے جنہیں اللہ کی طرف سے رعب دیا گیا تھا کہ دشمن مہینہ بھر کی راہ پر ہو اور وہیں اس کا دل دہلنے لگا تھا۔

حضرت مقاتل رحمہ اللہ فرماتے ہیں مسلمانوں نے بھی ان کے گھر توڑے اس طرح کہ جیسے جیسے آگے بڑھتے گئے ان کے جو جو مکانات وغیرہ قبضے میں آتے گئے میدان کشادہ کرنے کے لئے انہیں ڈھاتے گئے۔ اسی طرح خود یہود بھی اپنے مکانوں کو آگے سے تو محفوظ کرتے جاتے تھے اور پیچھے سے نقب لگا کر نکلنے کے راستے بناتے جاتے تھے، پھر فرماتا ہے، اے آنکھوں والو! عبرت حاصل کرو اور اس اللہ سے ڈرو جس کی لاٹھی میں آواز نہیں۔ (ابن کثیر) اگر ان یہودیوں کے مقدر میں جلاوطنی نہ ہوتی تو انہیں اس سے بھی سخت عذاب دیا جاتا، یہ قتل ہوتے اور قید کر لئے جاتے وغیرہ وغیرہ، پھر آخرت کے بدترین عذاب بھی ان کے لئے تیار ہیں۔

بنو نضیر کی یہ لڑائی جنگ بدر کے چھ ماہ بعد ہوئی، مال جو اونٹوں پر لد جائیں انہیں لے جانے کی اجازت تھی مگر ہتھیار لے جانے کی اجازت نہ تھی، یہ اس قبیلے کے لوگ تھے جنہیں اس سے پہلے کبھی جلاوطنی ہوئی ہی نہ تھی بقول حضرت عروہ بن زبیر شروع سورت سے فاسقین تک آیتیں اسی واقعہ کے بیان میں نازل ہوئی ہیں۔ جلاء کے معنی قتل وفنا کے بھی کئے گئے ہیں۔

حضور ﷺ نے انہیں جلاوطنی کے وقت تین تین میں ایک ایک اونٹ اور ایک ایک مشک دی تھی، اس فیصلہ کے بعد بھی حضور ﷺ نے محمد بن مسلمہ کو ان کے پاس بھیجا تھا اور انہیں اجازت دی تھی کہ تین دن میں اپنا سامان ٹھیک کر کے چلے آئیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

اس دنیوی عذاب کے ساتھ ہی اخروی عذاب کا بھی بیان ہو رہا ہے کہ وہاں بھی ان کے لئے حتمی اور لازمی طور پر جہنم کی آگ ہے۔ ان کی اس درگت کی اصلی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا اور اس کے رسول ﷺ کا خلاف کیا اور ایک اعتبار سے تمام نبیوں کو جھٹلایا اس لئے کہ ہر نبی نے آپ کی

بابت پیش گوئی کی تھی، یہ لوگ آپ کو پوری طرح جانتے تھے بلکہ اولاد کو ان کا باپ جس قدر پہچانتا ہے اس سے بھی زیادہ یہ لوگ نبی آخری الزماں کو جانتے تھے لیکن تاہم سرکشی اور حسد کی وجہ سے مانے نہیں، بلکہ مقابلے پر تل گئے۔

مَا قَطَعْتُمْ مِنْ لِينَةٍ: لینہ کہتے ہیں اچھی کھجوروں کے درختوں کو عجوہ اور برنی جو کھجور کی قسمیں ہیں بقول بعض وہ لینہ میں داخل نہیں اور بعض کہتے ہیں صرف عجوہ نہیں اور بعض کہتے ہیں ہر قسم کی کھجوریں اس میں داخل ہیں جن میں بویرہ بھی داخل ہے۔

یہودیوں نے جو بطور طعنہ کے کہا تھا کہ کھجوروں کے درخت کٹوا کر اپنے قول کے خلاف فعل کر کے زمین میں فساد کیوں پھیلاتے ہیں؟ یہ اس کا جواب ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ حکم رب سے اور اجازت اللہ سے دشمنان اللہ کو ذلیل و ناکام کرنے اور انہیں پست و بدنصیب کرنے کے لئے ہو رہا ہے جو درخت باقی رکھے جائیں وہ اجازت سے اور جو کاٹے جاتے ہیں وہ بھی مصلحت کے ساتھ۔

یہ بھی مروی ہے کہ بعض مہاجرین نے بعض کو ان درختوں کے کاٹنے سے منع کیا تھا کہ آخر کار تو یہ مسلمانوں کو بطور مال غنیمت ملنے والے ہیں پھر انہیں کیوں کاٹا جائے؟ جس پر یہ آیت اتری کہ روکنے والے بھی حق بجانب ہیں اور کاٹنے والے بھی برحق ہیں ان کی نیت مسلمانوں کے نفع کی ہے اور ان کی نیت کافروں کو غیظ و غضب میں لانے اور انہیں ان کی شرارت کا مزہ چکھانے کی ہے۔

اور یہ بھی ارادہ ہے کہ اس سے جل کر وہ غصے میں پھر کر میدان میں آئیں تو پھر دو دو ہاتھ ہو جائیں اور اعداء دین کو کیفر کردار تک پہنچا دیا جائے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ فعل کر تو لیا پھر ڈرے کہ ایسا نہ ہو کاٹنے میں یا باقی چھوڑنے میں اللہ کی طرف سے کوئی مواخذہ ہو تو انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا اور یہ آیت نازل ہوئی۔ یعنی دونوں باتوں پر اجر ہے کاٹنے پر بھی اور چھوڑنے پر بھی، بعض روایتوں میں ہے کٹوائے بھی تھے اور جلوائے بھی تھے۔

بنو قریظہ کے یہودیوں پر اس وقت حضور ﷺ نے احسان کیا اور ان کو مدینہ شریف میں ہی رہنے دیا لیکن بالآخر جب یہ بھی مقابلے پر آئے اور منہ کی کھائی تو ان کے لڑنے والے مرد تو قتل کئے گئے اور عورتیں، بچے اور مال مسلمانوں میں تقسیم کر دیئے گئے ہاں جو لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور ایمان لائے وہ بچ رہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

مال فئے کے حقدار کون؟

سوال اللہ تعالیٰ نے جو مال فئے اپنی رسول ﷺ کو عطا فرمایا اس میں کن کن لوگوں کا حق جڑا ہوا ہوتا تھا؟ ان آیات کی روشنی میں بیان فرمائیں۔

مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ وَ لِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ۭ وَمَآ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ ۤ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ {۷} لِلْفُقَرَآءِ الْمُهٰجِرِيْنَ الَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا وَّيَنْصُرُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ {۸} وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مِنْ قَبْلِهِمْ يُحِبُّوْنَ مَنْ هَاجَرَ اِلَيْهِمْ وَلَا يَجِدُوْنَ فِيْ صُدُوْرِهِمْ حَاجَةً مِّمَّآ اُوْتُوْا وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓي اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۭ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ {۹} وَالَّذِيْنَ جَاۗءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَآ اِنَّكَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ {۱۰} الحشر

جواب ترجمہ: اللہ اپنے رسول کو (دوسری) بستیوں سے جو مال بھی فئے کے طور پر دلوا دے، تو وہ اللہ کا حق ہے اور اس کے رسول کا، اور قرابت داروں کا، اور یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا، تاکہ وہ مال صرف انہی کے درمیان گردش کرتا نہ رہ جائے جو تم میں دولت مند لوگ ہیں۔ اور رسول تمہیں

جو کچھ دیں، وہ لے لو، اور جس چیز سے منع کریں اس سے رک جاؤ، اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بیشک اللہ سخت سزا دینے والا ہے۔

(نیز یہ مال فئے) ان حاجت مند مہاجرین کا حق ہے جنہیں اپنے گھروں اور اپنے مالوں سے بے دخل کیا گیا ہے۔ وہ اللہ کی طرف سے فضل اور اس کی خوشنودی کے طلب گار ہیں، اور اللہ اور اس کے رسول کی مدد کرتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو راست باز ہیں۔ (اور یہ مال فئے) ان لوگوں کا حق ہے جو پہلے ہی سے اس جگہ (یعنی مدینہ میں) ایمان کے ساتھ مقیم ہیں۔ جو کوئی ان کے پاس ہجرت کر کے آتا ہے یہ اس سے محبت کرتے ہیں، اور جو کچھ ان (مہاجرین) کو دیا جاتا ہے، یہ اپنے سینوں میں اس کی کوئی خواہش بھی محسوس نہیں کرتے، اور ان کو اپنے آپ پر ترجیح دیتے ہیں، چاہے ان پر تنگ دستی کی حالت گزر رہی ہو۔ اور جو لوگ اپنی طبیعت کے بخل سے محفوظ ہو جائیں، وہی ہیں جو فلاح پانے والے ہیں۔ اور (یہ مال فئے) ان لوگوں کا بھی حق ہے جو ان (مہاجرین اور انصار) کے بعد آئے۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ: اے ہمارے پروردگار! ہماری بھی مغفرت فرمایئے، اور ہمارے ان بھائیوں کی بھی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں، اور ہمارے دلوں میں ایمان لانے والوں کے لیے کوئی بغض نہ رکھیے۔ اے ہمارے پروردگار! آپ بہت شفیق، بہت مہربان ہیں۔

قرآن کریم میں مال غنیمت کا ذکر بھی کیا گیا ہے اور مال فئے کا ذکر بھی کیا گیا ہے، مال فئے کے لیے یہاں افاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لفظ افاء فئی سے مشتق ہے جس کے معنی لوٹنے کے ہیں، اس لئے دوپہر کے بعد جو چیزوں کا سایہ مشرق کی طرف لوٹتا ہے اس کو بھی فئی کہا جاتا ہے، اموال غنیمت جو کفار سے حاصل ہوتے ہیں ان سب کی اصل حقیقت یہ ہے کہ ان کے باغی ہو جانے کی وجہ سے ان کے اموال بحق سرکار ضبط ہو جاتے ہیں اور ان کی ملکیت سے نکل کر پھر مالک حقیقی حق تعالیٰ کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔

اس لئے ان کے حاصل ہونے کو افا کے لفظ سے تعبیر کیا گیا، اس کا تقاضا یہ تھا کہ کفار سے حاصل ہونے والے تمام قسم کے اموال کو فئی ہی کہا جاتا، مگر جو مال جہاد و قتال کے ذریعہ حاصل ہوا اس میں انسانی عمل اور جدوجہد کو بھی ایک قسم کا دخل ہے، اس لئے اس کو تو لفظ غنیمت سے تعبیر فرمایا گیا۔ (معارف القرآن)

مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید رحمۃ اللہ علیہ نے معالم العرفان میں مال فئے کے حصوں کی تفصیل بیان فرمائی ہے، جو کہ ذیل میں پیش خدمت ہے، مال فے کے حصص ① اللہ کا حصہ: ارشاد ہوتا ہے مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى، جو مال اللہ نے لوٹایا ہے اپنے رسول پر بستیوں والوں سے۔ یہ مال بنی نضیر سے ان کی جلاوطنی کے بعد بلا جنگ حاصل ہوا تھا۔ اس کی تقسیم کے متعلق اللہ نے ارشاد فرمایا ہے فللہ پس یہ اللہ کے لئے ہے یعنی سب سے پہلے حصہ اللہ تعالیٰ کا ہے اب یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تو احکم الحاکمین اور مستغنی ہے، وہ خود ساری مخلوق کا خالق اور مالک ہے، اسے ان زمینوں اور باغات وغیرہ کی کیا ضرورت ہے؟ اس کے جواب میں مفسرین فرماتے ہیں کہ اللہ کا نام تو محض تبرک کے لئے لیا گیا ہے وگرنہ نہ اسے اس مال کی ضرورت ہے اور نہ اسے ادا کیا جائے گا۔

اللہ کا نام لینے سے اس بات کا اظہار بھی مقصود ہے کہ کوئی یہ شبہ نہ کرے۔ کہ بغیر جنگ کے حاصل ہونے والا مال مسلمانوں کے لئے جائز بھی ہے یا نہیں۔ بلکہ یہ اسی طرح جائز ہے۔ جس طرح جنگ کی صورت میں حاصل ہونے والا مال غنیمت جائز ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ تجارت، زراعت یا محنت مزدوری کے ذریعے اپنے بندوں کو مال دلاتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے یہ مال بھی دلایا ہے اس کا استعمال پیغمبر علیہ السلام اور اہل ایمان کے لئے بالکل جائز ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اس مال میں سے اللہ کا حصہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ یہ حصہ اللہ کے گھر بیت اللہ شریف یا دیگر مساجد پر خرچ کیا جائے البتہ بعض فرماتے ہیں کہ اللہ کو ایسے حصے کی کوئی

ضرورت نہیں بلکہ محض تبرک کے لئے اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہے۔

② رسول کا حصہ: دوسرے حصے کے متعلق فرمایا وللرسول، یہ اللہ کے رسول کے لئے ہے فے کے ایک حصے پر اللہ کے رسول کا حق ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ مال غنیمت کے خمس یا مال فے کے اس حصے میں سے ازواج مطہرات کو خرچہ دیتے تھے۔ خیبر کی زمین اور فدک کے باغ سے بھی آپ کو حصہ ملتا تھا اور یہ حصص آپ اپنے گھریلو اخراجات کے طور پر استعمال کرتے تھے۔ اس حصہ میں آپ غریبوں اور محتاجوں کا حق بھی ادا کرتے تھے، اور جو پھر بھی بچ جاتا اسے عام مسلمانوں کے مشترکہ مفادات مثلاً سامان ضرب و حرب یا مجاہدین کی خوراک وغیرہ پر خرچ کرتے۔

③ قرابتداروں کا حصہ: فرمایا ولذی القربی، یہ حصہ حضور ﷺ کے قرابتداروں کے لئے مخصوص تھا۔ اس حصہ کے حقداران بنو عبد المطلب اور بنو ہاشم کے پانچ خاندان یعنی آل عباس آل علی، آل جعفر، آل عقیل اور آل حارث بنتے ہیں اور یہ ان پر خرچ کیا جاتا تھا۔ ان خاندانوں کے حصہ رسدی کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ ہر اچھے اور برے وقت میں حضور ﷺ کے ممد و معاون ہوتے تھے۔ حتیٰ کہ ان میں جو لوگ ایمان نہیں لائے تھے، وہ بھی آپ کی مدد کرتے تھے۔ مثلاً جب کفار مکہ نے حضور ﷺ کا سوشل بائیکاٹ کیا تو اس میں بنی عبد المطلب اور بنی ہاشم دونوں خاندان شامل تھے۔ خود ابو طالب آپ کے خاندان کے ساتھ تین سال تک شعب ابی طالب میں محصور رہا۔ تو یہ حصہ مقرر کرنے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ یہ خاندان آپ کی مدد کرتے ہیں۔

اور دوسری وجہ یہ تھی کہ حضور ﷺ کے خاندان پر صدقات وزکوٰۃ حرام تھی حضور ﷺ کا فرمان ہے اِنَّ الصَّدَقَةَ لَا تَحِلُّ لِمُحَمَّدٍ وَّ لَا لِاٰلِ مُحَمَّدٍ، یعنی زکوٰۃ وصدقات محمد اور آل محمد پر حلال نہیں ہیں، اور آل محمد میں یہی پانچ خاندان آتے ہیں۔ چنانچہ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اللہ نے ان کا حصہ مال فے میں مقرر فرمادیا۔ البتہ جب حضور ﷺ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تو اس حصہ

کی ایک وجہ یعنی حضور ﷺ کی اعانت والا معاملہ تو ختم ہو گیا۔ باقی رہ گئی دوسری وجہ کہ آپ کے خاندان پر زکوٰۃ وصدقات حرام ہیں تو اس کی علت احتیاج ہے یعنی زکوٰۃ وصدقات کا مال اسی صورت میں روا ہے جب کہ کوئی شخص محتاج ہو۔

چنانچہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں آل محمد میں سے صرف ان لوگوں کو مال فے سے حصہ ملتا تھا جو محتاج تھے اور جو آسودہ حال تھے ان کا حصہ ختم ہو گیا تھا۔ اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت ابوداؤد شریف میں موجود ہے کہ جب انہیں مال فے میں سے ان کے حصہ کی پیش کش کی گئی تو انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا، کہ اب ہم محتاج نہیں رہے لہٰذا یہ مال مستحقین کو دیا جائے۔

اسی بنا پر مال فے میں آل محمد کا یہ حق موجود ہے مگر ان لوگوں کے لئے جو محتاج ہوں، لہٰذا خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اگر ان کو اس مال میں سے حصہ نہیں دیا تو انہوں نے کوئی غلط کام نہیں کیا۔ کیونکہ اب آل محمد محتاج نہیں رہے تھے۔ البتہ امام ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تقسیم مال میں آل محمد کے محتاج کو دوسرے محتاجوں پر ترجیح دیجائے۔ (۴ تا ۶) یتیم، مسکین اور مسافر: پھر فرمایا اس مال میں ان لوگوں کا بھی ایک ایک حصہ ہے یعنی والیتمی والمسکین وابن السبیل یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کا۔

یتیم وہ نابالغ بچہ ہوتا ہے جس کا باپ فوت ہو جائے۔ اور بعض اوقات اس کی گزر اوقات کا کوئی ذریعہ بھی نہیں ہوتا۔ ایسے بے سہارا بچوں کے لئے بھی حصہ ہے۔ اسی طرح مسکین وہ شخص ہوتا ہے جس کی بنیادی ضروریات کے لئے بھی کافی مال موجود نہ ہو یتیموں اور مسکینوں کے لئے زکوٰۃ اور صدقات لینا بھی جائز ہے۔ اسی طرح اس مال میں اس مسافر کا بھی حصہ ہے جس کو دوران سفر کوئی حادثہ پیش آجائے، زادراہ چوری ہو جائے، یا ختم ہو جائے یا وہ کسی دیگر جائز ذریعہ سے محتاج ہو جائے۔

ایسا شخص بھی مال فے کا حقدار بن جاتا ہے، اللہ نے مال فے کے یہ چھ مصارف بیان فرمادیے ہیں۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن للشیخ السواتی رحمہ اللہ) فئی اس مال کو کہتے ہیں جو کوئی دشمن ایسی حالت میں چھوڑ جائے کہ مسلمانوں کو اس سے باقاعدہ لڑائی کرنی نہ پڑی ہو، بنو نضیر کے یہودیوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا مال و دولت ساتھ لے جانے کی اجازت دی تھی، اس لئے وہ جو کچھ ساتھ لے جاسکتے تھے لے گئے؛ لیکن ان کی جو زمینیں تھیں ظاہر ہے کہ وہ ساتھ نہیں لے جاسکتے تھے، اس لئے وہ چھوڑ کر گئے یہ زمینیں مال فئی کے طور پر مسلمانوں کے قبضے میں آئیں، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اپنی یہ نعمت یاد دلا رہے ہیں کہ یہ مال فئی اللہ تعالیٰ نے اس طرح عطا فرمادیا کہ مسلمانوں کو باقاعدہ لڑائی کی محنت بھی اٹھانی نہیں پڑی، آیت میں گھوڑوں اور اونٹوں کو دوڑانے سے مراد لڑائی کی کاروائی ہے۔ (آسان ترجمہ)

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں مال کو تقسیم کرنے کی حکمت بھی بیان فرمائی تاکہ مال صرف دولت مندوں کے پاس ہی نہ گھومتا رہ جائے، اس موقع پر حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے تقسیم مال کا یہ حکم اس لئے دیا ہے کی **لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ** تاکہ یہ دولت تمہارے آسودہ حال لوگوں تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اس کی گردش معاشرے کے انتہائی نچلے طبقے تک ہونی چاہیے **دُوْلَۃً** کے لفظ سے یہ اصول بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ اسلامی نظام معیشت میں کسی خاص طبقہ میں ارتکاز دولت ہر گز پسندیدہ نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اسلام (CAncentratiAn Af wealth) (دولت کا ارتکاز یا دولت کا چند ہاتھوں میں سمٹ جانا) کو کبھی پسند نہیں کرتا۔ وجہ ظاہر ہے کہ جب دولت کا دوران صرف ایک طبقہ تک محدود ہو جاتا ہے اور باقی طبقات محروم ہو جاتے ہیں تو پھر اس کے نتیجے میں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہو جاتے ہیں۔ جب کسی ملک میں اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر وہاں کمیونزم اور سوشلزم کی راہ ہموار ہو جاتی ہے۔ اگرچہ سرمایہ دارانہ نظام بھی ملعون ہے مگر سوشلزم اس سے بھی قبیح ہے۔

مطلق العنان ملوکیت بھی اسی قبیل سے ہے کسی ملک کا بادشاہ یا ڈکٹیٹر اپنے آپ کو غیر مسئول سمجھتا ہے اور ان کے ہاں آمد وخرچ کا حساب کوئی نہیں پوچھ سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ اسلام میں شخصی ملکیت کی اجازت ہے۔ مگر یہ ملکیت عارضی اور بطور امانت ہوتی ہے۔ اللہ جس کو دولت دیتا ہے اس کو آمد وخرچ کے قوانین کا بھی پابند بناتا ہے۔ (معالم العرفان)

حضرت صوفی صاحب رحمہ اللہ ارتکاز دولت کی ممانعت کے زیر عنوان فرماتے ہیں کہ جس مالک الملک نے انسانوں کو ارتکاز زر کی اجازت نہیں دی اس نے اپنے براہ راست قبضہ قدرت کی چیزوں کو اس طرح تقسیم کر دیا ہے کہ کوئی ادنیٰ واعلیٰ ان سے محروم نہیں رہتا۔ مثلاً ہوا، فضا، سورج، چاند، ستارے، بارش، دریا، سمندر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جن کو اس نے مخلوق میں سے کسی کے قبضے میں نہیں دیا، تمام انسان، جانور، پرندے اور کیڑے مکوڑے ان چیزوں سے براہ راست مستفید ہوتے ہیں۔

سانس لینے کے لئے ہوا کی ہر جاندار کو ضرورت ہے سورج، چاند اور ستاروں کی روشنی سب کی ضرورت ہے، پانی بھی تمام جانداروں کی بنیادی ضرورت ہے لہٰذا اللہ نے یہ چیزیں ہر ایک کے لئے فری مہیا کی ہیں اسی طرح دولت بھی چند ہاتھوں میں محدود ہو کر نہیں رہنی چاہیے۔ جب تک دولت کا دوران (CirculatiAn) صحیح طریقے سے ہوتا رہے گا تو دنیا میں توازن قائم رہے گا۔ ورنہ یا تو نظام سرمایہ داری آجائے گا۔ یا پھر رد عمل کے طور پر سوشلزم آئے گا۔ حالانکہ یہ دونوں نظام ملعون ہیں۔ (معالم العرفان)

حضرت صوفی صاحب رحمہ اللہ شخصی ملکیت کے احترام کے زیر عنوان فرماتے ہیں کہ ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام ہر شخص کو دولت کمانے اور خرچ کرنے کی کھلی چھٹی دیتا ہے جس سے ارتکاز زر پیدا ہوتا ہے تو دوسری طرف سوشلزم شخصی ملکیت کا بالکل ہی انکار کر دیتا ہے۔ اسلام کا نظام معیشت ان دونوں کے درمیان اعتدال کے ساتھ چلتا ہے۔ اسلام کسی شخص کی ذاتی ملکیت کا

اسی طرح احترام کرتا ہے جس طرح کسی کی جان کا احترام کرتا ہے۔ اسلام اگر قاتل کا سر قلم کر دیتا ہے تو مال چوری کرنے والے کا بھی ہاتھ کاٹ پھینکتا ہے۔ لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيْبِ نَفْسِهِ، کسی مسلمان کا مال دوسرے کے لئے حلال نہیں ہے جب تک مالک اپنی مرضی سے کسی کو نہ دے۔

غرضیکہ مالکی شخصی ملکیت بھی انسانی جان کی طرح عزیز ہے، البتہ اسلام نے اکتساب زر پر ضروری پابندی عائد کی ہے تاکہ نہ کوئی مضر پیشہ اختیار کیا جائے اور نہ چوری، ڈکیتی، رشوت، قمار بازی، ذخیرہ اندوزی اور اسمگلنگ کے ذریعے مال حاصل کیا جائے، مخرب اخلاق کاروبار جیسے فوٹو گرافی، فلم سازی، موسیقی، سٹہ بازی کی بھی اجازت نہیں دی گئی، مطلب یہ کہ صرف حلال ذرائع سے ہی دولت کمانے کی اجازت ہے۔

اگر اسلام نے جائز ذرائع سے دولت کمانے کی اجازت دی ہے تو ساتھ ساتھ ایسے مال کے حقوق ادا کرنے کا بھی پابند بنایا ہے۔ اگر مال نصاب کو پہنچ گیا ہے تو اس کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ دو، صدقہ فطر ادا کرو، قربانی دو، حج اور عمرہ کے لئے خرچ کرو، غربا و مساکین کو صدقہ خیرات دو۔ اگر یہ حقوق ادا کیے جائیں تو ارتکاز زر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

مال خرچ کرنے سے دو فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک طرف مستحقین کی حاجت براری ہوتی ہے تو دوسری طرف خرچ کرنے والے سے بخل کا مادہ دور ہو کر اس میں اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں۔

اللہ نے تقسیم مال کی ایک اور صورت بھی لازمی قرار دی ہے اور وہ ہے وراثت کی تقسیم، مالدار آدمی کے مرنے کے بعد جائیداد میں سے پہلے قریبی رشتہ داروں کو حصہ ملتا ہے اور اگر وہ موجود نہ ہوں تو دور کے رشتہ دار حصہ دار بن جاتے ہیں۔ اسلام نے یہ تمام طریقے ارتکاز دولت کو روکنے کے لئے رکھے ہیں۔ الغرض! اسلام کا نظام معیشت ہی بہترین نظام ہے جو ارتکاز کو روک کر مال کو زیادہ سے زیادہ پھیلنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ (معالم العرفان)

الحشر کی آیت ۸ مہاجرین کا ذکر ہے، مہاجرین سے مراد وہ لوگ ہیں، جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی محبت اور آپ کی نصرت کے لئے مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی، قتادہ رحمہ اللہ نے کہا یہ وہ مہاجرین ہیں جنہوں نے اپنے گھروں، اپنے مالوں اور اپنے عزیزوں، رشتہ داروں اور اپنی اولاد کو اور اپنے وطن کو رسول اللہ ﷺ کی خاطر چھوڑ دیا، حتیٰ کہ ان میں سے ایک شخص بھوک کی شدت سے اپنے پیٹ پر پتھر باندھ لیتا تھا تاکہ اس کی کمر سیدھی رہے۔

اور ان میں سے کسی شخص کے لئے سردی سے بچاؤ کے لئے گرم کپڑے نہیں ہوتے تھے۔ اور فرمایا: ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا گیا، کفار نے ان کو ان کے گھروں سے نکال دیا اور ان کو ان کا وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور یہ ایک سو نفر تھے۔ (الجامع لاحکام القرآن جز ۱۸ ص ۲۰) الحشر: ۹ میں فرمایا: اور (یہ اموال) ان لوگوں کے لئے ہیں جو دار ہجرت میں اور ایمان میں ان سے پہلے جگہ بنا چکے ہیں۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ جن لوگوں نے مہاجرین کے مدینہ میں آنے سے مدینہ کو اپنا وطن بنایا اور مدینہ میں اپنا گھر بنایا وہ انصار ہیں، اور یہ جو فرمایا ہے: وہ مہاجرین سے پہلے ایمان میں جگہ بنا چکے ہیں اس کا یہ معنی نہیں ہے کہ وہ مہاجرین سے پہلے ایمان لا چکے ہیں کیونکہ انصار، مہاجرین کے بعد ایمان لائے تھے، بلکہ اس کا معنی یہ ہے کہ وہ مہاجرین کے آنے سے پہلے مدینہ میں ایمان کے گھر بنا چکے تھے یعنی ایمان والوں کے لئے گھر بنا چکے تھے یا اس کا معنی یہ ہے کہ انہوں نے مدینہ کے گھروں کو لازم کر لیا تھا اور ایمان کو لازم کر لیا تھا۔ (تبیان القرآن)

مفسر قرآن علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ وَالَّذِيْنَ تَبَوَّؤُ الدَّارَ وَالْاِيْمَانَ مہاجرین پر عطف ہے اور ان سے حضرات انصار مدینہ مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ فئی کے جو اموال ہیں انصار بھی اس کے مستحق ہیں کہ ان پر خرچ کیا جائے۔ انصار کی تعریف کرتے ہوئے اولاً یوں فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے مدینہ منورہ کو پہلے ہی سے اپنا ٹھکانا بنالیا تھا، یہ

حضرات رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے برس ہابرس پہلے ہی مدینہ منورہ میں یمن سے آکر آباد ہوگئے تھے۔ جو بعد میں دار الایمان بن گیا پھر جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی اور حج کے موقع پر منیٰ میں آپ سے ملاقات ہوگئی تو ایمان بھی قبول کرلیا۔ وہاں تو چند آدمیوں نے قبول کیا تھا پھر سارے مدینہ والوں نے ایمان قبول کرلیا اور ایمان کو بھی ایسے چپکے کہ گویا وہ ان کا گھر ہے (جس سے کبھی بھی جدا ہونا نہیں ہے)۔

دوسری صفت یہ بیان فرمائی کہ جو حضرات ان کے پاس ہجرت کر کے آتے ہیں ان سے محبت کرتے ہیں ان کے دلوں میں یہ بات نہیں آتی کہ دوسرے علاقہ کے لوگ ہمارے یہاں آنے سے ان کی وجہ سے ہماری معیشت پر اثر پڑے گا، یہی نہیں کہ ان کے آنے سے دلگیر نہیں ہوتے بلکہ سچے دل سے ان سے محبت کرتے ہیں۔

تیسری تعریف یوں فرمائی کہ ہجرت کر کے آنے والوں کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس کی وجہ سے اپنے سینوں میں کوئی حاجت یعنی حسد اور جلن کی کیفیت محسوس نہیں کرتے یعنی وہ اس کا کچھ اثر نہیں لیتے کہ مہاجرین کو دیا گیا اور ہمیں نہیں دیا گیا۔ اور چوتھی تعریف یوں فرمائی کہ حضرات انصار اپنی جانوں پر ترجیح دیتے ہیں اگرچہ انہیں خود حاجت ہو۔ (تفسیر انوار البیان) حضرات مہاجرین وانصار کی باہمی محبت: حدیث شریف کی کتابوں میں حضرات انصار کے حب المہاجرین اور ایثار و قربانی کے متعدد واقعات لکھے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ نے بیان کیا کہ انصار نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ ہمارے اور ان مہاجرین کے درمیان ہمارے کھجوروں کے باغوں کو تقسیم فرما دیجئے، آپ نے فرمایا نہیں (میں ایسا نہیں کرتا) اس پر انصار نے مہاجرین سے کہا اچھا آپ لوگ پیداوار کی محنت میں مدد کریں اور ہم آپ لوگوں کو پھلوں میں شریک کرلیں گے۔ اس پر مہاجرین نے کہا یہ ہمیں منظور ہے۔

حضرت ابو ہریرہ نے بیان کیا کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا یارسول اللہ! میں تکلیف میں ہوں (بھوک سے دوچار ہوں) آپ نے (اس کے کھانے کے لئے) اپنی ازواج مطہرات سے کچھ طلب فرمایا آپ کے گھروں سے جواب آیا کہ ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حاضرین سے فرمایا کہ ایسا کون شخص ہے جو اس شخص کی مہمانی کرے؟ یہ سن کر ایک انصاری صحابی نے کہا کہ میں ان کو ساتھ لے جاتا ہوں چنانچہ انہیں ساتھ لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ دیکھو یہ رسول اللہ ﷺ کا مہمان ہے اس کا اکرام کرنا ہے۔

بیوی نے کہا کہ ہمارے پاس تو بجز بچوں کی خوراک کے کچھ بھی نہیں ہے۔ شوہر نے کہا کھانا تیار کرو اور بچوں کو سلا دو چنانچہ اس نے کھانا پکایا اور بچوں کو سلا دیا پھر جب کھانے بیٹھے تو عورت اس انداز سے اٹھی کہ گویا چراغ کی بتی درست کرتی ہے لیکن درست کرنے کی بجائے اس نے چراغ بجھا دیا مہمان کھاتا رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ یہ دونوں بھی میرے ساتھ کھا رہے ہیں حالانکہ انہوں نے اس کے ساتھ کھانا نہیں کھایا اور رات بھر بھوکے رہے، صبح کو جب رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضری ہوئی تو یہ میزبان صحابی حاضر ہوئے آپ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کو تمہارا عمل پسند آیا کہ تم بھوکے رہے اور مہمان کو کھلا دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ شانہ نے آیت کریمہ وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ نازل فرمائی۔ (صحیح بخاری صفحہ ۵۳۶: ج ۱، بحوالہ انوار البیان)

اشکال: یہاں جو یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ بچے مہمان کی بہ نسبت زیادہ مستحق تھے پھر مہمان کو ان کی خوراک کیوں کھلائی؟

جواب بچے اس وقت رات کا کھانا کھا چکے تھے اب خوراک کی ضرورت صبح ناشتہ کے لئے تھی اگر وہ اصلی بھوکے ہوتے تو سلانے سے بھی نہ سوتے۔

اشکال: دوسرا اشکال یہ ہے کہ چراغ جلا کر تین آدمی جو ساتھ بیٹھے اس میں بے پردگی ہوئی؟

جواب یہ واقعہ پردہ کے احکام نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔

فائدہ: یہ صحابی کون تھے جو مہمان کو ساتھ لے گئے تھے؟ اس کے بارے میں بعض علماء نے حضرت ابو طلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا اور بعض حضرات نے حضرت عبد اللہ بن رواحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا نام بتایا ہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ یہ دعوت کرنے والے صحابی قیس بن ثابت رضی اللہ عنہ تھے۔ (انوار البیان)

جو بخل سے بچ گیا وہ کامیاب ہے: آیت کے آخر میں فرمایا (وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۹) اور جو شخص اپنے نفس کی کنجوسی سے بچادیا گیا سو یہ وہ لوگ ہیں جو کامیاب ہونے والے ہیں۔ اس میں کنجوسی کی مذمت کی گئی ہے اور نفس کی کنجوسی سے بچنے کو کامیاب ہونے والوں کی ایک امتیازی شان بتائی ہے۔ کنجوسی کی اضافت جو نفس کی طرف کی ہے اس میں ایک نکتہ یہ ہے کہ بعض مرتبہ دل تو خرچ کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے لیکن نفس کو مال خرچ کرنے پر آمادہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ (انوار البیان) مفسر قرطبی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ بعض اہل لغت کا قول ہے کہ شح بخل سے زیادہ بڑھ کر ہے۔ پھر صحاح (لغت کی کتاب) سے نقل کیا ہے کہ شح اس بخل کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ حرص بھی ہو۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ ظلم سے بچو کیونکہ قیامت کے دن ظلم اندھیریاں بن کر سامنے آئے گا اور شح (کنجوسی) سے بچو کیونکہ کنجوسی نے تم سے پہلے لوگوں کو ہلاک کر دیا اس نے انہیں آپس میں خون ریزی کرنے پر اور حرام چیزوں کو حلال کرنے پر آمادہ کر دیا۔ (رواہ مسلم) انسان کے مزاج میں کنجوسی ہے جسے سورۃ نساء میں وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ سے تعبیر فرمایا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بدترین چیز جو انسان کے اندر ہے وہ کنجوسی ہے جو گھبراہٹ میں ڈال دے اور بزدلی ہے جو جان کو نکال دے۔ اور ایک حدیث میں ہے کہ کنجوسی اور ایمان کبھی کسی بندے کے دل میں جمع نہیں ہو سکتے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ دو چیزیں بندے میں جمع نہیں ہو سکتیں ایک بخل اور دوسری بد خلقی (رواہ الترمذی)

انسان کا مزاج ہے کہ مال لینے کو تو تیار ہو جاتا ہے دینے کو تیار نہیں ہوتا اسی لئے زندگی میں اللہ کی رضا کے لئے مال خرچ کرنے کا زیادہ ثواب ہے۔ نفس خرچ کرنے کو نہیں چاہتا لیکن پھر بھی نفس کے تقاضوں کو دبا کر مومن آدمی اللہ تعالیٰ کی رضا کے لئے خرچ کرتا چلا جاتا ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ ثواب کے اعتبار سے کون سا صدقہ بڑا ہے؟ آپ نے فرمایا وہ صدقہ سب سے بڑا ہے کہ تو اس حال میں صدقہ کرے کہ تو تندرست ہو نفس میں کنجوسی ہو تنگدستی کا خوف ہو، مالدار بننے کی امید لگا رکھی ہو پھر فرمایا کہ تو خرچ کرنے میں دیر نہ لگا یہاں تک کہ جب روح حلق تک پہنچ جائے تو کہنے لگے گا فلاں کو اتنا دینا اور فلاں کو اتنا دینا (اب کہنے سے کیا ہوتا ہے) اب تو فلاں کا ہو ہی چکا (دم نکلتے ہی دوسروں کا ہے)۔ (رواہ البخاری صفحہ ۱۹۱: ج ۱)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص اپنی زندگی میں ایک درہم صدقہ کرے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ موت کے وقت سو درہم کا صدقہ کرے۔ (رواہ ابوداؤد) بہت سے لوگ دنیاوی ضرورتوں، گناہوں اور ریاکاریوں میں تو دل کھول کر خرچ کرتے ہیں، بے تحاشا فضول خرچ میں مال اڑا دیتے ہیں لیکن مال سے متعلق فرائض وواجبات ادا نہیں کرتے زکوٰۃ کی ادائیگی کو روکے رکھتے ہیں حج فرض ہو جاتا ہے تو اس کے لئے ہمت نہیں کرتے اور اگر ہمت کر بھی لی تو اسے دنیاداری یعنی ریاکاری کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ (انوار البیان)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ زمانہ جلدی جلدی گزرنے لگے گا عمل کم ہو جائے گا اور (دلوں میں) کنجوسی ڈال دی جائے گی اور فتنے ظاہر ہوں گے اور قتل زیادہ ہوں گے۔ (رواہ البخاری) نیز حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے یہ بھی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تین چیزیں نجات دینے والی ہیں۔

① تنہائی میں اور لوگوں کے سامنے تقویٰ کے تقاضوں پر چلنا۔

② رضامندی میں اور ناراضگی میں حق بات کہنا۔

③ مالداری اور تنگدستی میں میانہ روی اختیار کرنا۔

اور ہلاک کرنے والی تین چیزیں یہ ہیں، ① خواہشوں کا اتباع کیا جانا۔

② کنجوسی (کے جذبات) کی فرمانبرداری کرنا۔

③ انسان کو اپنے نفس پر گھمنڈ کرنا۔ (مشکوٰۃ) کنجوسی بری بلا ہے نفس پر قابو پائے اللہ تعالیٰ کی رضا میں مال خرچ کرے اور گناہوں میں خرچ کرنے سے بچے اور فضول خرچی سے بھی بچے یہ کامیابی کا راستہ ہے جسے وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ میں بیان فرمایا ہے۔

وَالَّذِيْنَ جَآءُوْ مِنْۢ بَعْدِهِمْ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا: یہ مال فئے کے مستحقین کی تیسری قسم ہے یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد آنے والے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نقش قدم پر چلنے والے اس میں تابعین اور تبع تابعین اور قیامت تک آنے والے اہل ایمان و تقویٰ سب آگئے، لیکن شرط یہی ہے کہ وہ انصار و مہاجرین رضی اللہ عنہم کو مومن مانتے ہوں اور ان کے حق میں دعائے مغفرت کرنے والے ہوں نہ کہ ان کے ایمان میں شک کرنے والے اور ان پر سب و شتم کرنے والے اور ان کے خلاف اپنے دلوں میں بغض و عناد رکھنے والے، امام مالک رحمہ اللہ نے اس آیت سے استنباط کرتے ہوئے یہی بات فرمائی أَنَّ الرَّافِضِيَّ الَّذِي يَسُبُّ الصَّحَابَةَ لَيْسَ لَهُ فِي مَالِ الْفَيْءِ نَصِيبٌ لِعَدَمِ اتِّصَافِهِ بِمَا مَدَحَ اللّٰهُ بِهٖ هٰؤُلَاءِ فِي قَوْلِهِمْ (ابن کثیر) رافضی کو جو صحابہ رضی اللہ عنہم پر سب و شتم کرتے ہیں مال فئے سے حصہ نہیں ملے گا، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مدح کی ہے اور رافضی ان کی مذمت کرتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عمران رضی اللہ عنہ آیات کو تلاوت کرکے فرمایا کرتے خدا کی قسم جو شخص مہاجرین رضوان اللہ علیہم اجمعین کی طرف سے کدورت رکھتا ہو ان لوگوں میں سے نہیں ہو سکتا جن کو اس آیت میں بیان کیا گیا

اور حق تعالیٰ شانہ نے مدح فرمائی۔ ازالۃ الخفاء)

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیتیں مہاجرین و انصار کی مدح پر مشتمل ہیں اور ان لوگوں کی بھی تعریف پر مشتمل ہیں جو انصار و مہاجرین کے بعد آئیں گے اور یہ بعد میں آنیوالے سابقین اولین کے لئے دعاء مغفرت کریں گے اور اللہ تعالیٰ سے یہ بھی دعا کریں گے کہ اے اللہ! ہمارے دلوں کو مہاجرین و انصار رضوان اللہ علیہم اجمعین کے کینہ سے بالکل پاک وصاف رکھ۔ (منہاج السنہ ا)

نیز ان آیات میں یہ مضمون بھی ہے کہ مال فئی کی مستحق یہ تین جماعتیں ہیں (ان کے سوا اور کسی کا اس میں استحقاق نہیں) اور اس میں کوئی شک نہیں کہ رافضی ان تینوں قسموں سے خارج ہیں اس لئے کہ وہ مہاجرین و انصار کے لئے دعاء مغفرت نہیں بلکہ ان کے دلوں میں تو مہاجرین و انصار کا کینہ بھرا ہوا ہے۔ تو ان آیات میں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی فضیلت و مدح ہے اور اسی طرح اہلسنت کی مدح ہے جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے محبت رکھتے ہیں اور یہ آخری قید رافضیوں کے خارج کرنے کے لئے ہے۔ اور یہ آیت رافضیوں کے مذہب کو بالکل چاک کر دیتی ہے۔ اور ان کے اس عیب و خبث کی پردہ دری کر رہی ہے جو ان کے سینوں میں بھرا ہوا ہے۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے سب مسلمانوں کو اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے استغفار اور دعاء کرنے کا حکم دیا حالانکہ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا کہ ان کے آپس میں جنگ و جدال کے فتنے بھی پیدا ہوں گے (اس لئے کسی مسلمان کو مشاجرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی وجہ سے ان میں سے کسی سے بدگمان ہونا جائز نہیں)۔

حضرت صدیقہ عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ میں نے تمہارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ یہ امت اس وقت تک ہلاک نہیں ہوگی جب تک اس کے پچھلے لوگ اگلوں پر لعنت و ملامت نہ کریں گے۔ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما نے فرمایا کہ جب تم کسی کو دیکھو کہ کسی صحابی کو برا کہتا ہے تو اس سے کہو کہ جو تم میں سے زیادہ برا ہے اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت، یہ ظاہر ہے کہ زیادہ برے صحابہ تو ہو نہیں

سکتے یہی ہو گا جو ان کی برائی کر رہا ہے خلاصہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو برا کہنا سبب لعنت ہے۔ عوام بن ہوشب نے فرمایا کہ میں نے اس امت کے پہلے لوگوں کو اس بات پر مستقیم اور مضبوط پایا ہے کہ وہ لوگوں کو یہ تلقین کرتے تھے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل اور محاسن بیان کیا کرو تاکہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا ہو، اور وہ مشاجرات اور اختلافات جو ان کے درمیان پیش آئے ہیں ان کا ذکر نہ کیا کرو جس سے ان کی جرأت بڑھے (اور وہ بے ادب ہو جائیں) (قرطبی) بعد کے مومنین کا طرز عمل یعنی سابقین کے لیے دعاء مغفرت کرتے ہیں اور کسی مسلمان بھائی کی طرف سے دل میں بیر اور بغض نہیں رکھتے۔

حضرت شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ یہ آیت سب مسلمانوں کے واسطے ہے جو اگلوں کا حق مانیں اور انہی کے پیچھے چلیں اور ان سے بیر نہ رکھیں، امام مالک رحمہ اللہ نے یہیں سے فرمایا کہ جو شخص صحابہ رضی اللہ عنہم سے بغض رکھے اور ان کی بدگوئی کرے اس کے لیے مال فئے میں کچھ حصہ نہیں۔

پہلوں کا پچھلوں پر حق: لِاِخْوَانِنَا یعنی ہمارے دینی بھائیوں کے لئے جو ہم سے پہلے ایمان لائے۔ پہلوں کا پچھلوں پر بڑا حق ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے جن کو ہدایت ملی اور ایمان کی توفیق ہوئی ان ہی کے ذریعہ سے پیچھے آنے والے ہدایت یاب ہوئے۔

غِلًّا: کینہ، حسد بغض، اس آیت سے ثابت ہو رہا ہے کہ اگر کسی کے دل میں کسی صحابی رضی اللہ عنہ کے بارے میں کسی طرح کا بغض ہو تو اس کا شمار ان لوگوں میں نہیں ہو گا جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

منافقین کا پیغام یہودیوں کے نام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ نَافَقُوْا يَقُوْلُوْنَ لِاِخْوَانِهِمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَئِنْ اُخْرِجْتُمْ لَنَخْرُجَنَّ مَعَكُمْ وَلَا نُطِيْعُ فِيْكُمْ اَحَدًا اَبَدًا ۙ وَّاِنْ قُوْتِلْتُمْ لَنَنْصُرَنَّكُمْ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۱﴾ لَئِنْ اُخْرِجُوْا لَا يَخْرُجُوْنَ مَعَهُمْ وَلَئِنْ قُوْتِلُوْا لَا يَنْصُرُوْنَهُمْ

وَلَئِنْ نَّصَرُوْهُمْ لَيُوَلُّنَّ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ {۱۲} لَاَنْتُمْ اَشَدُّ رَهْبَةً فِيْ صُدُوْرِهِمْ مِّنَ اللّٰهِ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ {۱۳} الحشر

جواب ترجمہ: کیا آپ نے منافقوں کو نہیں دیکھا جو اپنے کافر بھائیوں سے کہہ رہے تھے جو اہل کتاب میں سے ہیں کہ یقین جانو اگر تم نکالے گئے تو ضرور ضرور ہم بھی تمہارے ساتھ نکل جائینگے اور ہم تمہارے بارے میں کبھی بھی کسی کی بات نہ مانیں گے اور اگر تم سے جنگ کی گئی تو ہم ضرور ضرور تمہاری مدد کرینگے اور اللہ گواہی دیتا ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ یہ یقینی بات ہے کہ اگر وہ نکالے گئے تو یہ ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے اور یقینی بات ہے اگر ان سے جنگ کی گئی تو یہ ان کی مدد نہیں کرینگے اور اگر ان کی مدد کریں گے تو پشت پھیر کر چلے جائینگے پھر ان کی مدد نہیں کی جائیگی۔ یہ بات بھی یقینی ہے کہ ان کے سینوں میں تمہارا ڈر اللہ کے خوف سے بھی زیادہ ہے یہ اس وجہ سے کہ بیشک وہ ایسے لوگ ہیں جو سمجھتے نہیں ہیں۔

رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی نے یہود بن نضیر کو یہ خفیہ پیغام بھیجا تھا اور تاکید سے کہلوایا کہ ہر گز نہ گھبرانا اور اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھنا، اگر مسلمانوں نے تم کو نکالنا چاہا تو ہم بھی احتجاجاً تمہارے ساتھ نکل کھڑے ہوں گے اور اگر جہاد و قتال کی نوبت آئی تو ہم تمہاری پوری پوری مدد کریں گے یہ ہمارا ایسا قطعی اور یقینی فیصلہ ہے کہ اس کے خلاف ہم کسی کی بات ماننے کے واسطے ہر گز تیار نہ ہوں گے

ان کے اس طرح کے باطل دعوؤں پر قرآن کریم نے رد کرتے ہوئے فرمایا اور خدا گواہی دے رہا ہے کہ بیشک یہ منافق جھوٹے ہیں محض مسلمانوں کے خلاف اکسانے اور ورغلانے کے لیے یہ باتیں بنا رہے ہیں، آگاہ ہو جانا چاہیے اگر وہ اہل کتاب نکالے گئے تو یہ ہر گز ان کے ساتھ نہیں نکلیں گے۔ اور اگر ان سے قتال کیا گیا تو یہ کبھی بھی ان کی مدد نہ کریں گے اور اگر کچھ تھوڑی بہت

دکھاوے کے طور پر مدد بھی کی تو پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے پھر کہیں سے بھی ان کی مدد نہیں کی جائے گی۔

کسی اور کی کیا مدد کرتے اس طرح پیٹھ پھیر کر بھاگنے کے بعد تو یہ خود بھی ایسے بے یار و مدد گار ہو جائیں گے کہ ان کی بھی کوئی مدد نہ کر سکے گا، چہ جائیکہ یہ دوسروں کی مدد کریں، ان کی اس منافقانہ روش سے معلوم ہوتا ہے کہ البتہ تمہارا ڈر زیادہ ہے ان کے دلوں میں بہ نسبت اللہ کے، یہ اس وجہ سے کہ یہ ایک ایسی قوم ہے کہ سمجھ نہیں رکھتے، کیونکہ اللہ کی عظمت وہیبت اور قدرت وکبریائی کی کوئی حد نہیں۔

اس سے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا ڈر نہیں ورنہ تو نفاق کیوں اختیار کرتے اس کے بالمقابل مسلمانوں کی قوت و شجاعت سے ڈر رہے ہیں اور ان سے مرعوب وخوف زدہ ہو کر نفاق اختیار کیا اور کھلم کھلا کفر کے اعلان کی جرات نہیں، تو ان کے اس طرز عمل نے ثابت کیا کہ مسلمانوں کا ڈر ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کے ڈر سے زیادہ ہے۔ (معارف القرآن للکاندھلویؒ)

یہود اور کفار کی بزدلی

سوال اللہ تعالیٰ نے یہودیوں کی مسلمانوں کے خلاف جنگ کا کیا نقشہ کھینچا ہے؟ ان کی اجتماعیت کی کیا تصویر پیش فرمائی گئی ہے؟ اس آیت کی روشنی میں تفسیر فرمایئے۔

لَا يُقَاتِلُوْنَكُمْ جَمِيْعًا اِلَّا فِيْ قُرًى مُّحَصَّنَةٍ اَوْ مِنْ وَّرَآءِ جُدُرٍ بَاْسُهُمْ بَيْنَهُمْ شَدِيْدٌ تَحْسَبُهُمْ جَمِيْعًا وَّقُلُوْبُهُمْ شَتّٰى ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ {۱۴} الحشر

جواب ترجمہ: یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر بھی تم سے جنگ نہیں کریں گے، مگر ایسی بستیوں میں جو قلعوں میں محفوظ ہوں، یا پھر دیواروں کے پیچھے چھپ کر۔ ان کی آپس کی مخالفتیں بہت سخت ہیں۔ تم انہیں اکٹھا سمجھتے ہو، حالانکہ ان کے دل پھٹے ہوئے ہیں۔ یہ اس لیے کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں عقل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہود اور باقی کفار کا یوں نقشہ کھینچا ہے کہ وہ یکجان ہو کر تمہارے خلاف لڑنے کی ہمت نہیں رکھتے، اگر انہیں لڑنا پڑے تو قلعہ بند ہو کر لڑیں گے یا پھر مضبوط دیواروں کے پیچھے، یا خندقیں کھود کر ان میں محفوظ ہو کر، یا دیواروں کی اوٹ میں رہ کر وہ وار کر سکتے ہیں، یہ لوگ ایک دوسرے خلاف سخت دشمنی رکھتے ہیں، آپ انہیں یکجان و دو قالب خیال کرتے ہیں حالانکہ صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے، ان کے دل متفرق اور پھٹے ہوئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بے عقل لوگ ہیں، اللہ تعالیٰ کے احکامات کو سمجھتے نہیں ہیں اور نہ ہی اس کی آیات میں غور و حوض کرتے ہیں۔

یہود اور منافقین سب مل کر بھی مسلمانوں سے جنگ کرنے کی طاقت نہیں رکھتے، ماسوا اس کے کہ وہ قلعہ میں بند ہو کر لڑیں، یا دیواروں کی پیچھے مورچہ بنا کر لڑیں۔ یہ جب آپس میں جنگ کرتے ہیں تو ایک دوسرے سے ان کا مقابلہ بہت سخت ہوتا ہے، لیکن اللہ اور رسول کے خلاف جب یہ مسلمانوں سے جنگ کریں تو ان کا بڑے سے بڑا بہادر بھی بزدل ہو جاتا ہے، اس وجہ سے یہ مسلمانوں سے جنگ کرنے سے احتراز کرتے ہیں، تم بہ ظاہر دیکھتے ہو کہ یہ ایک دوسرے سے بہت الفت اور محبت رکھتے ہیں، لیکن ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف سخت نفرت اور عداوت ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ یہ اپنی عقلوں سے کام نہیں لیتے۔ (تبیان القرآن)

یہ منافقین کی دوسری کمزوری کا بیان ہے۔ پہلی کمزوری یہ تھی کہ وہ بزدل تھے، خدا سے ڈرنے کے بجائے انسانوں سے ڈرتے تھے اور اہل ایمان کی طرح کوئی بلند تر نصب العین ان کے سامنے نہ تھا جس کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا جذبہ ان کے اندر پیدا ہوتا۔ اور دوسری کمزوری یہ تھی کہ منافقت کے سوا کوئی قدر مشترک ان کے درمیان نہ تھی جو ان کو ملا کر ایک مضبوط جتھا بنا دیتی۔ ان کو جس چیز نے جمع کیا تھا وہ صرف یہ تھی کہ اپنے شہر میں باہر کے آئے ہوئے محمد ﷺ کی پیشوائی و فرمانروائی چلتے دیکھ کر ان سب کے دل جل رہے تھے، اور اپنے ہی ہم وطن انصاریوں کو مہاجرین کی پذیرائی کرتے دیکھ کر ان کے سینوں پر سانپ لوٹتے تھے۔

اس حسد کی بنا پر وہ چاہتے تھے کہ سب مل جل کر اور آس پاس کے دشمنان اسلام سے ساز باز کر کے اس بیرونی اثر و اقتدار کو کسی طرح ختم کر دیں۔ لیکن اس منفی مقصد کے سوا کوئی مثبت چیز ان کو ملانے والی نہ تھی۔ ان میں سے ہر ایک سردار کا جتھا الگ تھا۔ ہر ایک اپنی چودھراہٹ چاہتا تھا۔ کوئی کسی کا مخلص دوست نہ تھا۔ بلکہ ہر ایک کے دل میں دوسرے کے لیے اتنا بغض و حسد تھا کہ جسے وہ اپنا مشترک دشمن سمجھتے تھے اس کے مقابلے میں بھی وہ نہ آپس کی دشمنیاں بھول سکتے تھے، نہ ایک دوسرے کی جڑ کاٹنے سے باز رہ سکتے تھے۔ (تفہیم القرآن)

اس طرح اللہ تعالیٰ نے غزوہ بنی نضیر سے پہلے ہی منافقین کی اندرونی حالت کا تجزیہ کر کے مسلمانوں کو بتادیا کہ ان کی طرف سے فی الحقیقت کوئی خطرہ نہیں ہے، لہٰذا تمہیں یہ خبریں سن سن کر گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں کہ جب تم بنی نضیر کا محاصرہ کرنے کے لیے نکلو گے تو یہ منافق سردار دو ہزار کا لشکر لے کر پیچھے سے تم پر حملہ کر دیں گے اور ساتھ ساتھ بنی قریظہ اور بنی غطفان کو بھی تم پر چڑھالائیں گے۔ یہ سب محض لاف زنیاں ہیں جن کی ہوا آزمائش کی پہلی ساعت آتے ہی نکل جائے گی۔

صاحب روح القرآن فرماتے ہیں کہ ان منافقین کی بزدلی کا عالم یہ ہے کہ آپ سے لڑنے اور میدان میں نکل کر آپ کے مقابلے کی ہمت نہیں کر سکیں گے۔ البتہ ان کے دلوں میں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول اور مسلمانوں کے بارے میں چونکہ شدید بغض پایا جاتا ہے اور ان کی دلی خواہش ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کو نقصان پہنچائیں۔

اس لیے اگر انھیں قلعہ بند بستیاں مل جائیں یا کوئی ایسی مضبوط اوٹ راستے میں حائل ہو جس سے وہ اپنی حفاظت کر سکیں تو پھر وہ آپ پر وار کرنے سے کبھی دریغ نہیں کریں گے۔ میدان میں نکل کر اور خطرے کو انگیخت کر کے اپنی جان پر کھیل جانا یہ ان لوگوں کا کام نہیں جن کے سامنے کوئی بلند نصب العین نہ ہو۔

وہ صرف زندگی کے لیے زندہ ہیں اور زندگی کی ضرورتیں اور خواہشات ان کے مقاصد ہوں۔ ایسے لوگ صرف اپنی ذات کے پجاری ہوتے ہیں اور اول و آخر ان کی ذات ہی ان کا مرجع رہتی ہے۔ تو ایسے لوگوں سے یہ امید رکھنا کہ وہ کبھی جان کی بازی بھی لگا سکتے ہیں یہ ناممکن ہے۔ البتہ ان کی ذات کو گزند نہ پہنچے تو پھر وہ نفرتوں کے اظہار میں کسی سے پیچھے نہیں۔

اور دوسری عجیب بات ان میں یہ ہے کہ اسلام دشمنی میں وہ سب یکجا اور یک زبان ہیں۔ اس معاملے میں ان کا اتحاد دیکھ کر گمان ہونے لگتا ہے کہ شاید ان میں وحدت فکر بھی پائی جاتی ہے، لیکن حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ مخالفتِ اسلام کے منفی مقصد کے سوا ان کے دلوں کے اندر اتحاد کا کوئی جذبہ نہیں۔ وہ دیکھنے کو ایک دوسرے کے ساتھ ہیں لیکن دل ایک دوسرے سے بیگانہ اور ایک دوسرے سے زخمی ہیں۔ اور آخر میں فرمایا گیا کہ ان کا یہ حال اس لیے ہے کہ وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔ یعنی ان کی عقلوں پر ان کے تعصبات چھائے ہوئے ہیں۔

اسلام اور مسلمانوں کیخلاف ان کا بغض و عناد انھیں عقل سے کام لینے نہیں دیتا۔ ان ہی تعصبات اور بغض و عناد نے ان کی فکری قوتوں کو مسموم کر کے رکھ دیا ہے۔ جس طرح رنگدار عینک سے آدمی کو ہر چیز رنگین دکھائی دیتی ہے اسی طرح ان کی عقل ہر معاملے میں ان کی غلط رہنمائی کرتی ہے اور وہ صحیح عقل کو استعمال کرنے پر قادر نہیں ہیں۔ (تفسیر روح القرآن)

دشمنان رسول صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی سزا

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ وہ کون سا گروہ تھا جسے اللہ تعالیٰ نے یہود بنی نضیر سے پہلے اپنا عذاب چکھایا تھا؟

كَمَثَلِ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَرِيْبًا ذَاقُوْا وَبَالَ اَمْرِهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ {۱۵} الحشر

جواب ترجمہ: ان کی حالت ان لوگوں کی سی ہے جو ان سے کچھ ہی پہلے اپنے کرتوت کا مزہ چکھ چکے

ہیں۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی عداوت و دشمنی کے باعث، رسول اللہ ﷺ کو ایذا دینے کی جن لوگوں کو بنو نضیر سے پہلے سزا دی گئی وہ قریش مکہ تھے، وہ یہود بنو قینقاع تھے، دنیا میں ان کے چھکے چھڑائے گئے اور آخرت میں انہیں دردناک عذاب دیا جائے گا۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کہا کہ مراد بنو قینقاع ہیں۔ حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہود بنو نضیر ہیں، بنو قریظہ سے قبل اللہ تعالیٰ نے ان پر قدرت عطا فرمائی۔ مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ غزوہ بدر کے موقع پر قریش کے کفار مراد ہیں۔ ایک قول یہ کیا گیا: یہ ہر اس قوم کے بارے میں ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ تک بنو نضیر سے قبل اس کے کفر کی وجہ سے انتقام لیا۔ وبال کا معنی ان کے کفر کی جزا ہے۔ جس نے کہا: وہ بنو قریظہ ہیں تو اس نے وبال امر ھم کی تعبیر ان کے بارے میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے حکم پر اپنے قلعوں سے نیچے آنا ہے۔ حضرت ضحاک فرماتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کے جنگجو افراد کو قتل کرنے اور ان کے بچوں کو قیدی بنا لینے کا حکم دیا۔ (تفسیر قرطبی)

جس نے کہا کہ اس سے مراد بنو نضیر ہیں اس نے کہا: وبال سے مراد ان کی جلاوطنی ہے، بنو نضیر اور بنو قریظہ کے واقعہ کے درمیان دو سال کا عرصہ حائل تھا۔ غزوہ بدر کا واقعہ غزوہ بنو نضیر سے چھ ماہ پہلے ہوا تھا، اسی وجہ سے فرمایا: قریباً ایک قوم کا کہنا ہے کہ بنو نضیر کا واقعہ غزوہ احد کے بعد ہوا تھا۔ آخرت میں ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (تفسیر قرطبی)

شیطان کیسے ورغلاتا اور جان چھڑاتا ہے؟

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ فَلَمَّا كَفَرَ قَالَ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكَ اِنِّيْٓ اَخَافُ اللّٰهَ

رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ{۱۶}فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ خَالِدَيْنِ فِيْهَا ؕ وَذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الظّٰلِمِيْنَ {۱۷} الحشر

جواب ترجمہ: ان کی مثال شیطان کی سی ہے کہ وہ انسان سے کہتا ہے کہ: کافر ہو جا۔ پھر جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو کہتا ہے کہ: میں تجھ سے بری ہوں، میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ چنانچہ ان دونوں کا انجام یہ ہے کہ وہ دونوں دوزخ میں ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے، اور یہی ظلم کرنے والوں کی سزا ہے۔

مفسر قرآن ابوالبرکات محمود نسفی رحمۃ اللہ علیہ تفسیر مدارک میں لکھتے ہیں شیطان کی مثال ایسی ہے کہ انسان سے کہتا ہے کافر ہو جا۔ جب وہ کافر ہو جاتا ہے تو اس سے کہتا ہے میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں منافقین کی یہودیوں کو لڑائی پر ابھارنے اور ان سے نصرت کا وعدہ کرنے پھر ان کے چھوڑنے اور مخالفت کرنے کی مثال شیطان جیسی ہے کہ جب وہ اپنے فریب سے انسان کو گمراہ کر لیتا ہے۔ تو آخر میں اس سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔

ایک قول یہ ہے اس سے مراد شیطان کا قریش کو گمراہ کر کے میدان بدر میں لا کھڑا کرنا ہے۔ اور یہ کہہ کر ابھارنا، لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَاِنِّيْ جَارٌ لَّكُمْ سے لے کر اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّنْكُمْ تک (الانفال: ۴۱) یہ دوسری مثال ان منافقین کی ہے جنہوں نے بنو نضیر کو جلاوطنی کا حکم نہ ماننے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ پر جنگ کرنے کے لئے ابھارا اور ان کی مدد کرنے کا وعدہ کیا، مگر جب مسلمانوں نے ان کا محاصرہ کیا تو کوئی منافق امداد کو نہ پہنچا ان کی مثال قرآن کریم نے شیطان کے ایک واقعہ سے دی ہے کہ شیطان نے انسان کو کفر پر آمادہ کیا اور اس سے طرح طرح کے وعدے کئے، مگر جب وہ کفر میں مبتلا ہو گیا تو سب سے مکر گیا۔ (معارف القرآن)

شیطان کس طرح انسانوں کو ذلیل کرتا ہے، انہیں اپنے دامِ اِغوا میں پھنساتے اور ہمیشہ کے لیے رسوا کرتا ہے، اس کے بہت سے واقعات روایات میں منقول ہیں، مفسر قرآن علامہ جلال الدین

سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر در منثور میں بہت سے واقعات مختلف الفاظ کے ساتھ نقل فرمائے ہیں، ان کے علاوہ امام بغوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنی تفسیر میں نقل فرمائے ہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے آیت كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ کے بارے میں روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک راہب اللہ تعالیٰ کی اچھی طرح عبادت کرتا تھا۔ ہر علاقے کے لوگ اس کے پاس آتے تھے اور اس سے فقہ کے بارے میں پوچھتے تھے اور وہ عالم تھا۔ تین بھائی تھے جن کی ایک بہن تھی۔ جو حسین ترین لوگوں میں سے بہت حسین اور خوبصورت تھی۔

ان لوگوں نے سفر کرنے کا ارادہ کیا، ان پر یہ بات بھاری تھی کہ بہن کو اکیلا چھوڑ دیں ضائع ہونے کے لیے، چنانچہ وہ راہب کے پاس آئے اور اس سے کہا ہم سفر کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اور ہم تجھ سے بڑھ کر کسی کو اعتماد والا اور حفاظت والا اپنے دلوں میں نہیں پاتے، اگر تیری رائے ہو تو ہم اپنی بہن کو تیرے حوالے کر دیں کیونکہ وہ شدید درد میں مبتلا ہے۔ اگر وہ مر جائے تو اس کا مکمل انتظام کرنا اگر وہ زندہ رہے تو اس کی اصلاح کرنا یہاں تک کہ ہم لوٹ آئیں راہب نے کہا ان شاء اللہ میں تمہارے لیے کافی ہوں (غمزدہ ہونے کی ضرورت نہیں) اس نے اس کی دوا کی تو وہ اچھی ہو گئی اور اس کا حسن لوٹ آیا، ایک دن اس کے پاس گیا تو اس کو بناؤ سنگھار کیا ہوا پایا۔

اس کے ساتھ شیطان برابر لگا رہا، یہاں تک کہ اس نے اس کے ساتھ منہ کالا کیا اور وہ عورت حاملہ ہو گئی، پھر اس کو شیطان نے ندامت دلائی اور اس کو اس کے قتل پر آمادہ کیا اور کہا اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو تو رسوا ہو جائے گا، اس لیے اپنے معاملہ کو پہچان اور تیرے لیے کوئی عذر نہیں ہے۔

شیطان برابر اس کے پیچھے لگا رہا یہاں تک کہ اس نے اس کو قتل کر دیا۔ جب اس کے بھائی آئے اس سے پوچھا کہ تو نے بہن کے ساتھ کیا کیا اس نے کہا وہ مر گئی اور میں نے اس کو دفن کر دیا۔ انہوں نے کہا تو نے اچھا کیا، پھر انہیں خواب نظر آنے لگے اور ان کو یہ بتایا جانے لگا کہ راہب نے اس کو قتل

کر دیا ہے اور اس طرح وہ درخت کے نیچے دفن ہے۔ چنانچہ وہ درخت کی طرف گئے اور اس کو پالیا کہ اسے قتل کیا گیا تھا۔ وہ اس راہب کی طرف گئے اور اس کو پکڑ لیا۔

شیطان نے کہا میں ہی وہ ہوں جس نے تجھے زنا کی رغبت اور کشش پیدا کی، پھر تجھے اس کے قتل پر آمادہ کیا اب کیا تیرے لیے ممکن ہے کہ تو میری پیروی کرے اور میں تجھے نجات دلا دوں۔ اس نے کہا ہاں پھر شیطان نے کہا مجھے ایک سجدہ کرلے اس نے سجدہ کرلیا پھر وہ قتل کر دیا گیا، یہی بات اللہ تعالیٰ نے یہاں بتائی کہ شیطان انسان کو کہتا ہے تو کفر کر، جب وہ کفر کرلیتا ہے تو شیطان برات کا اعلان کر دیتا ہے۔ (در منثور)

ابن جریر رحمہ اللہ نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے اس آیت کے بارے میں روایت کیا کہ ایک عورت بکریاں چرایا کرتی تھی، اس کے چار بھائی تھے، وہ رات کو راہب کی عبادت گاہ میں پناہ لیتی تھی، راہب نیچے اترتا اور اس سے زنا کرتا تھا، اس کے پاس شیطان آیا اور کہا اس کو قتل کر دے اور پھر اس کو دفن کر دے تو ایسا آدمی ہے جس کی بات سنی جاتی ہے اور تصدیق کی جاتی ہے تو اس نے عورت کو قتل کر کے دفن کر دیا۔

شیطان خواب کی حالت میں اس کے بھائیوں کے پاس آیا اور ان سے کہا کہ راہب نے تمہاری بہن کے ساتھ بدکاری کی ہے جب اس کو حمل ہوا تو اس کو قتل کر کے اس طرح فلاں جگہ پر دفن کر دیا۔ جب انہوں نے صبح کی تو ایک آدمی نے ان میں سے کہا۔ میں نے گزشتہ رات اس طرح اور اس طرح دیکھا ہے دوسرے نے کہا اللہ کی قسم میں نے بھی اسی طرح دیکھا ہے تیسرے نے کہا اللہ کی قسم میں نے بھی اسی طرح دیکھا ہے۔

سب نے کہا اللہ کی قسم! یہ نہیں ہے مگر کسی چیز کی وجہ سے ہے پس تم چلو اور اپنے حاکم کو راہب کے خلاف تیار کرو چنانچہ وہ اس راہب کے پاس دوڑتے ہوئے آئے اور اس کو نیچے اتارا۔ پھر راہب کو پکڑنے گئے اسی دوران شیطان راہب سے ملا اور کہا کہ میں نے تجھے اس بدکاری میں واقع کیا اور

میرے علاوہ کوئی تجھے ہر گز نجات نہیں دلا سکتا تو مجھے ایک سجدہ کرلے اور میں تجھ کو نجات دلا دوں گا۔ جس میں میں نے تجھے واقع کیا ہے اس نے اس کے لیے سجدہ کرلیا جب وہ اس کو لے کر اپنے حاکم کے پاس پہنچے تو شیطان اس سے الگ ہو گیا اور راہب کو پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل میں ایک راہب تھا، شیطان نے ایک لڑکی کو پکڑ کر اس کا گلا گھونٹ دیا اور اس کے گھر والوں کے دلوں میں یہ بات ڈال دی کہ اس کا علاج راہب کے پاس ہے وہ اس کو راہب کے پاس لے آئے اس نے اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

وہ مسلسل اصرار کرتے رہے یہاں تک کہ اس نے اس لڑکی کے علاج کو قبول کر لیا، وہ لڑکی اس کے پاس تھی کہ شیطان اس کے پاس آیا اور اس نے اس کے دل میں لڑکی کے بارے میں وسوسہ ڈالا اور اس کے لیے اس لڑکی کو خوب بنا سنوار کر پیش کیا۔

وہ برابر اس کے ساتھ لگا رہا یہاں تک کہ اس نے اس کے ساتھ بدکاری کی، جب اس کو حمل ٹھہر گیا تو شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا اور کہا کہ اس کے گھر والے تیرے پاس آئیں گے تو تو رسوا ہو گا لہٰذا تو اس کو قتل کر دے، اگر وہ تیرے پاس آئیں تو تو کہہ دینا کہ وہ مر گئی، تو اس نے اس کو قتل کر کے دفن کر دیا اس کے گھر والوں کے پاس شیطان آیا اور ان کے دلوں میں وسوسے ڈالے اور ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ اس نے اس کو حاملہ کیا پھر اس کو قتل کر دیا۔

اس کے گھر والے اس کے پاس آئے اور اس سے پوچھا اس نے کہا وہ مر گئی، انہوں نے اس کو پکڑ لیا، پھر شیطان راہب کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے لڑکی کے گھر والوں کے دلوں میں یہ بات ڈالی ہے اور میں نے ہی تجھ کو اس برے کام میں واقع کیا ہے تو میرا کہنا مان لے نجات پا جائے گا۔ مجھے دو سجدے کرلے اس نے دونوں سجدے کر لیے اور یہ وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے فرمایا آیت کمثل الشیطان اذ قال للانسان الکفر۔ (مکاید الاخلاق لابن ابی الدنیا، شعب الایمان، تفسیر در منثور)

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کے بارے میں روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک راہب تھا جو طویل عرصہ تک عبادت کرتا رہا، یہاں تک کہ اس کے پاس مجنون اور پاگل لوگ لائے جاتے تھے ان پر وہ پڑھتا اور ان کا علاج کرتا تھا، یہاں تک کہ وہ صحت یاب ہو کر واپس لوٹ جاتے، ایک عورت کو اس کو جھونپڑی میں لایا گیا، اس کو جنون تھا۔

اس کے بھائی ابھی اس کے پاس آئے تاکہ وہ اسے کوئی تعویذ دے، اس کے ساتھ شیطان برابر لگا رہتا اور اسے لڑکی کے بارے میں آمادہ کرتا رہتا، یہاں تک کہ وہ اس پر واقع ہو گیا اور وہ عورت حاملہ ہو گئی، جب اس کا پیٹ بڑھ گیا، پھر شیطان لگاتار اس کے پاس آتا رہا اور اس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اس کو قتل کر دے۔

یہاں تک کہ اس نے اس کو قتل کر دیا اور اس کو ایک جگہ میں دفن کر دیا، شیطان ایک آدمی کی صورت میں اس کے بعض بھائیوں کے پاس آیا اور اس کو یہ خبر دی، اس آدمی نے اپنے بھائیوں کو یہ کہنا شروع کر دیا۔ کہ اللہ کی قسم! کہ میرے پاس ایک آنے والا آیا اور اس نے مجھے اس طرح خبر دی ہے یہاں تک کہ ان کے ایک نے دوسرے کو یہ خبر پہنچادی اور انہوں نے اپنا معاملہ حاکم کے پاس پیش کر دیا تو حاکم لوگوں کے ساتھ چل پڑا یہاں تک کہ راہب کو نیچے اتار دیا اس نے واقعہ کا اقرار اور اعتراف بھی کر لیا۔

حاکم نے حکم دیا کہ اس کو پھانسی پر لٹکا دیا جائے، اس کے پاس پھر شیطان آیا اور وہ اپنی پھانسی کی لکڑی پر تھا اور اس سے کہا میں نے تجھے اس پر اکسایا اور اس کام میں میں نے تجھے ڈالا، کیا تو اب میرا کہنا مانے گا، جو میں تجھ کو حکم کروں گا اور میں تجھ کو نجات دلا دوں گا، اس نے کہا ہاں! شیطان نے کہا میرے لیے ایک سجدہ کر، اس نے اس کو سجدہ کیا اور کافر ہو گیا۔ پھر وہ اسی وقت قتل کر دیا گیا۔ (اعتدال القلوب للخرائطی، ابن منذر، تفسیر در منثور للسیوطی رحمہ اللہ)

حضرت طاؤس رحمہ اللہ سے روایت ہے کہ بنی اسرائیل میں سے ایک آدمی عابد تھا، وہ بسا اوقات مجنون اور پاگل لوگوں کا علاج کیا کرتا تھا، ایک خوبصورت عورت کو جنون ہو گیا اس کو اس کے پاس لا کر چھوڑ دیا گیا اس کو وہ عورت بھلی لگی تو اس پر واقع ہو گیا وہ حاملہ ہو گئی تو اس کے پاس شیطان آیا اور کہنے لگا اگر اس برے کام کو جان لیا گیا تو تیری رسوائی ہو گی اس کو قتل کر کے اپنے گھر میں دفن کر دے۔

اس نے اس کو قتل کر دیا، اس کے گھر والے مدت کے بعد آئے اور اس عورت کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ مر گئی ہے، انہوں نے اسے کوئی تہمت نہ دی کیونکہ اس کی سلامتی اور اس کی رضا انہیں میں تھی، شیطان ان کے پاس آیا اور کہا کہ وہ نہیں مری لیکن راہب نے اس کے ساتھ زنا کیا وہ حاملہ ہو گئی تو اس کو قتل کر کے اپنے گھر میں فلاں فلاں جگہ اس کو دفن کر دیا۔ اس کے گھر والے آئے اور کہا ہم تجھ کو الزام نہیں دیتے مگر تو ہم کو بتا کہ اس کو کہاں دفن کیا ہے؟ اور تیرے ساتھ کون تھا؟ انہوں نے اس کے گھر میں تلاش کیا تو اس جگہ کو پالیا جہاں اس نے دفن کیا تھا، اس کو پکڑ لیا گیا اور قید میں ڈال دیا گیا۔

اس کے پاس شیطان آیا اور کہا اگر تو چاہتا ہے کہ میں تم کو اس مصیبت سے نکالوں جس میں تو پڑا ہوا ہے تو اللہ کے ساتھ کفر کر اس نے شیطان کا کہا مانا اور کفر کا ارتکاب کر لیا، انہوں نے پھر اس کو پکڑ کر قتل کر دیا اس وقت شیطان اس سے بری ہو گیا۔ طاؤس نے کہا میں تو صرف یہی جانتا ہوں کہ یہ آیت اس بارے میں نازل ہوئی كَمَثَلِ الشَّيْطٰنِ اِذْ قَالَ لِلْاِنْسَانِ اكْفُرْ (عبد الرزاق، در منثور)

محی السنہ امام بغوی رحمہ اللہ نے اس آیت کے ذیل میں ایک واقعہ لکھا ہے ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بیان کیا کہ زمانہ فترت (حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے لے کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک کا وہ زمانہ جس میں وحی نہیں آئی) میں ایک راہب (تارک الدنیا، درویش) تھا جس کو برصیصا کہا جاتا تھا ستر سال تک یہ راہب اپنے عبادت خانہ میں اللہ کی عبادت کرتا رہا کبھی ایک لمحہ کے لئے اللہ کی نافرمانی نہیں کی، اس کو ورغلانے

میں ابلیس اپنی ساری تدبیریں کر کے عاجز آ گیا مگر اس کو نہیں بہکا سکا آخر ایک دن اس نے تمام خبیث شیطانوں کو جمع کیا اور کہنے لگا۔ مجھے کوئی بھی اب تک ایسا نہ ملا جو برصیصا کے معاملہ میں میرا کام پورا کر دیتا۔

حاضرین میں ایک شیطان ابیض (گورا شیطان) بھی تھا۔ یہ شیطان وہی تھا جو وَهُوَ صَاحِبُ الْأَنْبِيَاءِ وَهُوَ الَّذِي تَصَدَّى لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَجَاءَهُ فِي صُورَةِ جِبْرَئِيلَ لِيُوَسْوِسَ إِلَيْهِ عَلَى وَجْهِ الْوَحْيِ فَدَفَعَهُ جِبْرَئِيلُ إِلَى أَقْصَى أَرْضِ الْهِنْدِ، انبیاء کے ساتھ لگا رہتا تھا اور جبریل کی شکل میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے بھی آیا تا کہ بطریق وحی حضور ﷺ کے دل میں وسوسہ پیدا کر سکے جبریل علیہ السلام نے اس کو دھکے دے کر ہندوستان کے آخری کنارے تک بھگا دیا تھا۔

اسی گورے شیطان نے ابلیس سے کہا میں آپ کا کام پورا کر دوں گا۔ چنانچہ وہ اس مجلس سے چلا اور راہبوں کا ایسا لباس پہنا اور سر کے درمیان سے بال مونڈ کر برصیصا کے عبادت خانہ تک جا پہنچا اور (نیچے سے) برصیصا کو آواز دی برصیصا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ برصیصا دس دن میں صرف ایک دن نماز سے فارغ اور دس ہی دن میں صرف ایک دن روزہ ناغہ کرتا تھا۔

گورے شیطان نے جب دیکھا کہ برصیصا نے اسے کوئی جواب نہیں دیا تو برصیصا کی خانقاہ کے نیچے ہی عبادت میں مشغول ہو گیا۔ عبادت سے مقرر وقت پر فارغ ہو کر جب برصیصا نے اپنے عبادت خانے سے جھانک کر دیکھا تو گورے شیطان کو بہترین راہبانہ ہئیت میں نماز میں کھڑا ہوا پایا، یہ صورت دیکھ کر اس کو جواب نہ دینے پر اپنے دل میں پشیمانی ہوئی اور کہنے لگا آپ نے مجھے پکارا تھا مگر میں آپ کی طرف متوجہ نہیں ہوا آپ کا مجھ سے کیا کام ہے؟

گورے شیطان نے کہا میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں تا کہ آپ کے ساتھ مل کر عبادت کروں اور آپ کے علم و عمل سے بہرہ اندوز ہوں اور ہم دونوں عبادت میں لگ جائیں، آپ میرے لئے دعا کریں اور میں آپ کے لئے دعا کروں۔

راہب نے کہا میں تمہاری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا فَإِنْ كُنْتَ مُؤْمِنًا فَإِنَّ اللّٰهَ سَيَجْعَلُ لَكَ فِيمَا أَدْعُو لِلْمُؤْمِنِينَ نَصِيبًا إِنِ اسْتَجَابَ لِي، اگر تم مؤمن ہو تو میں عام مومنوں کے لئے جو دعا کرتا ہوں اگر وہ دعا خدا قبول فرمالے گا تو تم کو بھی اس میں شامل کر دے گا۔ یہ کہہ کر برصیصا پھر نماز کی طرف متوجہ ہو گیا اور گورے شیطان کو چھوڑ دیا پھر گورا شیطان بھی نماز میں مشغول ہو گیا، برصیصا نے چالیس روز تک اس کی طرف کوئی توجہ نہیں کی (نماز میں مشغول رہا) چالیس روز کے بعد جب نماز سے فارغ ہوا تو گورے شیطان کو نماز میں کھڑا پایا، آخر شیطان کی اتنی کوشش دیکھ کر برصیصا نے پوچھا تمہارا کیا مطلب ہے؟

گورے شیطان نے کہا میرا مقصد یہ ہے کہ آپ مجھے اجازت دیدیں میں بھی اوپر آپ کے پاس آجاؤں، برصیصا نے اجازت دیدی، گورا شیطان اوپر برصیصا کے پاس خانقاہ میں آگیا اور اس کے ساتھ ایک سال تک عبادت میں مشغول رہا، چلہ ختم ہونے سے پہلے روزہ کا افطار نہیں کرتا تھا۔ اور نہ چالیس روز پورے ہونے سے پہلے نماز ختم کرتا تھا اور اکثر اسی (۸۰) دن بھی یونہی گزر جاتے تھے۔

برصیصا نے جب (عبادت میں) اس کی یہ مشقت دیکھی تو خود اپنی ذات اس کو حقیر معلوم ہونے لگی اور شیطان کی حالت پر اس کو تعجب ہوا، سال پورا ہو گیا تو گورے شیطان نے برصیصا سے کہا اب میں جارہا ہوں کیوں کہ آپ کے علاوہ میرا ایک اور ساتھی ہے (میں اس کے پاس جاؤں گا) میرا خیال تو یہ تھا کہ آپ اس سے زیادہ عبادت گزار ہوں گے لیکن آپ کے متعلق جو کچھ میں نے سنا تھا آپ کی حالت اس سے غیر پائی، یہ بات سن کر برصیصا کو (اپنی کم محنت ہونے کی) شدید تکلیف ہوئی اور چونکہ شیطان گورے کی شدید ریاضیت دیکھ چکا تھا۔ اس لئے اس کی جدائی راہب پر گراں گزری۔

رخصت ہوتے وقت گورے شیطان نے برصیصا سے کہا إِنَّ عِنْدِي دَعَوَاتٍ أُعَلِّمُكَهَا تَدْعُو بِهِنَّ فَهُنَّ خَيْرٌ مِمَّا أَنْتَ فِيهِ يَشْفِي اللّٰهُ بِهَا السَّقِيمَ وَيُعَافِي بِهَا الْمُبْتَلَى

وَالْمَجْنُوْنَ، مجھے کچھ دعائیں آتی ہیں میں آپ کو وہ سکھاتا ہوں، جس مشغلہ میں آپ ہیں وہ دعائیں اس سے بہتر ہیں آپ ان کو پڑھ کر اللہ سے دعا کریں گے تو اللہ بیمار کو شفا عطا کرے گا، دکھی کو سکھی کر دے گا اور آسیب زدہ کو ٹھیک کر دے گا۔

برصیصا نے کہا مجھے یہ مرتبہ پسند نہیں میرے لئے اپنا ہی مشغلہ (بہت کافی) ہے مجھے ڈر ہے کہ جب لوگ اس کی خبر پائیں گے تو میری عبادت میں خلل انداز ہو جائیں گے۔ گورا شیطان برابر اصرار کرتا رہا، آخر راہب کو وہ دعائیں سکھا دیں، اس کے بعد چلا گیا اور ابلیس سے جا کر کہا واللہ میں نے اس شخص کو تباہ کر دیا ہے۔ پھر گورا شیطان یہاں سے واپس چلا گیا، راستہ میں ایک آدمی ملا اس شیطان نے اس کا گلا گھونٹ دیا اور طبیب کی ہیئت میں اس شخص کے گھر والوں سے جا کر کہا تمہارے ساتھی کو آسیب (یا جنون کا دورہ) ہے، کیا میں اس کا علاج کر دوں؟ لوگوں نے کہا ہاں۔

جا کر مریض کو دیکھا اور بولا اس پر چڑیل (جنات کی عورت) کا اثر ہے میں اس پر قابو نہیں پا سکتا البتہ تم کو ایک ایسے آدمی کا پتہ بتاتا ہوں جو اللہ سے دعا کرے اس کو اچھا کر سکتا ہے، غرض اس نے برصیصا کا پتہ بتا دیا اور کہا تم اس کے پاس جاؤ، اس کے پاس اسم اعظم ہے وہ اسم اعظم سے دعا کرتا ہے تو اللہ قبول کر لیتا ہے۔ لوگ برصیصا کے پاس گئے اور اس سے دعا کرنے کی درخواست کی، اس نے انہی الفاظ سے دعا کر دی، جو گورے شیطان نے اس کو سکھائے تھے۔ مریض پر جس شیطان کا تسلط تھا وہ شیطان بھاگ گیا۔

گورے شیطان نے بہت سے لوگوں سے ایسی ہی حرکت کی اور برصیصا کا پتہ بتاتا رہا اور لوگ اچھے ہوتے رہے۔ ایک بار گورا شیطان بنی اسرائیل کی شہزادی پر اثر انداز ہوا، اس لڑکی کے تین بھائی تھے اور باپ بادشاہ تھا، بادشاہ مر گیا اور اپنے بھائی کو اپنا جانشین بنا گیا، لڑکوں کا چچا بادشاہ ہو گیا تو گورا شیطان شہزادی کی طرف متوجہ ہوا اس کو سخت اذیت دی اور گلا گھونٹ دیا، پھر اس کے بھائیوں کے پاس طبیب کی شکل میں آیا اور بولا کیا تم چاہتے ہو کہ میں اس کا علاج کر دوں؟

ان لوگوں نے کہاہاں کہنے لگا ایک بڑا خبیث اس کے درپے آزار ہے اور مجھ میں اس کو دور کرنے کی طاقت نہیں، البتہ ایک شخص کا میں پتہ بتاتا ہوں جس پر تم اعتماد رکھتے ہو، لڑکی کو اس کے پاس لے جاؤ، جب اس پر وہ خبیث آئے گا اور وہ شخص اس کے لئے دعا کرے گا تو لڑکی اچھی ہو جائے گی۔ تم کو یہ بات معلوم ہو جائے گی۔ اور لڑکی کو بعافیت واپس لے آؤ گے۔

لوگوں نے کہاوہ کون شخص ہے؟ گورے شیطان نے کہابرصیصا زاہد۔ شہزادوں نے کہاوہ ہماری بات کیسے مانیں گے؟ ان کا مقام تو بہت بلند ہے۔ شیطان نے کہااس کی خانقاہ کے برابر ایک اور عبادت خانہ تعمیر کرو، اتنا اونچا کہ وہاں سے اس کی خانقاہ کے اندر جھانک سکو، پھر وہاں سے اپنا مقصد اس سے کہو، اگر مان لے تو خیر نہ مانے تو اپنے تعمیر کردہ عبادت خانہ میں لڑکی کو چھوڑ آؤ اور برصیصا سے کہہ دو یہ (تمہاری نگرانی میں ہماری امانت ہے) بغرض ثواب اس کی نگرانی رکھنا۔

الحاصل شہزادے برصیصا کی طرف گئے اور اسے درخواست کی لیکن اس نے انکار کر دیا، شیطان کے مشورے کے مطابق شہزادوں نے راہب کی خانقاہ کے برابر ایک عبادت خانہ تعمیر کرادیا اور لڑکی کو اس میں رکھ دیا اور (راہب سے) کہا یہ ہماری امانت ہے بغرض ثواب اس کی نگرانی رکھنا یہ کہہ کر واپس آ گئے۔ جب (مقررہ ایام گزرنے کے بعد) برصیصا نے نماز ختم کی تو ایک حسین لڑکی پر نظر پڑی اور ایسی نظر پڑی کہ وہ لڑکی اس کے دل میں گھر کر گئی اور اس پر بڑی مصیبت آگئی اس کے بعد شیطان نے آکر اس لڑکی کا گلا گھونٹ دیا، برصیصا نے اس کے لئے گورے شیطان کی بتائی ہوئی دعائیں کیں، شیطان اتر گیا۔

برصیصا نماز میں مشغول ہو گیا، شیطان نے آکر پھر اس کا گلا گھونٹ دیا، اس مرتبہ بے ہوشی میں وہ اپنا ستر بھی کھولنے لگی، گورے شیطان نے آکر برصیصا سے کہااب تو اس سے بدکاری کر لے اور پھر توبہ کر لینا، اللہ گناہ معاف کرنے والا ہے معاف کر دے گا اور تیرا مقصد پورا ہو جائے گا۔ گورے شیطان کے مسلسل اصرار پر بالآخر برصیصا نے اس لڑکی سے بدکاری کی اور اس کے بعد مسلسل لڑکی

کے ساتھ بدکاری کرتا رہا، آخر لڑکی حاملہ ہوگئی اور اس کا حمل دکھائی دینے لگا، تو شیطان اس کے پاس آیا اور کہنے لگا، ارے برصیصا! تو رسوا ہو گیا۔

شیطان نے اس سے کہا کہ اب مناسب ہے کہ تو لڑکی کو قتل کر دے پھر توبہ کر لینا اگر وہ لوگ پوچھیں تو کہنا اس کا جن اس کو لے گیا۔ مجھ میں بچانے کی قدرت نہیں تھی۔ برصیصا نے لڑکی کو قتل کر دیا پھر (رات کو) لیجا کر پہاڑی کے کنارے دفن کر دیا، دفن کرتے وقت شیطان نے آکر لڑکی کی چادر کا ایک کونہ پکڑ لیا، اس طرح چادر کا ایک گوشہ قبر کی مٹی سے باہر رہ گیا۔ برصیصا اپنی خانقاہ میں لوٹ آیا اور نماز میں مشغول ہو گیا۔ لڑکی کے بھائی اپنی بہن کی خبر گیری کے لئے آئے اور دریافت حال کے لئے آتے رہتے تھے۔ انہوں نے آکر دریافت کیا برصیصا ہماری بہن کہاں ہے؟ برصیصا نے جواب دیا شیطان آکر اس کو اڑا لے گیا اور مجھ میں بچانے کی قدرت نہیں تھی۔

ان لوگوں نے برصیصا کی بات پر یقین کر لیا سب لوٹ آئے شام ہوئی تو بھائی غم زدہ تو تھے ہی، سوتے میں شیطان نے بڑے بھائی سے خواب میں کہا کہ برصیصا نے تمہاری بہن کے ساتھ یہ حرکتیں کیں، پھر اس کو فلاں جگہ دفن کر دیا، اس بھائی نے اپنے دل میں کہا یہ خواب ہے۔

اور شیطانی خیال ہے برصیصا تو بہت بزرگ آدمی ہے وہ ایسا نہیں کر سکتا تین رات برابر شیطان اس کو یہی خواب دکھاتا رہا لیکن اس نے کوئی پرواہ نہیں کی آخر شیطان خواب میں منجھلے بھائی کے پاس گیا اور اس سے بھی یہی بات کہی مگر اس نے بھی وہی خیال کیا جو بڑے بھائی نے کیا تھا اور کسی سے کچھ بیان نہیں کیا آخر میں تیسرے بھائی کے پاس خواب میں جا کر شیطان نے یہی بات کہی۔

اس نے اپنے دونوں بھائیوں سے یہ خواب بیان کر دیا منجھلے اور بڑے نے بھی اپنے خواب ظاہر کر دیئے پھر تینوں برصیصا کے پاس گئے اور کہا برصیصا ہماری بہن کہاں ہے؟ برصیصا نے کہا میں تو تم کو پہلے ہی بتا چکا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم مجھے تہمت زدہ کرنا چاہتے ہو، یہ بات سن کر شہزادوں کو اس سے شرم آئی اور کہنے لگے ہم آپ پر تہمت نہیں دھرتے یہ کہہ کر لوٹ آئے، شیطان نے پھر خواب

میں آکر ان سے کہا ارے تمہاری بہن تو فلاں مقام پر دفن ہے اور اس کی چادر کا ایک گوشہ قبر کی مٹی سے اوپر رکھا ہوا ہے۔

ان لوگوں نے جا کر دیکھا تو جیسا خواب میں دیکھا تھا ویسا ہی پایا، پھر تو مزدوروں اور غلاموں کو لے کر کسیوں اور کدالوں سے ان لوگوں نے برصیصا کا عبادت خانہ ڈھا دیا اور اس کو عبادت خانہ سے اتار کر مشکیں کس کر بادشاہ کے پاس لے گئے۔ ادھر گورے شیطان نے برصیصا سے کہا (تو انکار نہ کرنا) اگر تو نے انکار کیا تو تجھ پر دو جرم عائد ہو جائیں گے قتل کا اور پھر انکار قتل کا۔ برصیصا نے اقرار کر لیا تو بادشاہ نے اس کو قتل کرنے کیلئے سولی پر چڑھانے کا حکم دیدیا۔

سولی پر چڑھاتے وقت وہی گورا شیطان آیا اور برصیصا سے کہا کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ برصیصا نے کہا نہیں، بولا میں وہی ہوں جس نے تجھے دعائیں سکھائی تمہیں اور تیری دعائیں قبول ہوئیں، امانت میں خیانت کرتے تجھے خدا سے ڈر نہیں لگا، تیرا دعویٰ تھا کہ میں تمام بنی اسرائیل سے بڑھ کر عبادت گزار ہوں، مگر تجھے شرم نہیں آئی، اسی طرح برابر شرم دلاتا رہا، پھر آخر میں کہنے لگا کیا جو کچھ تو نے کیا وہی کافی نہ تھا کہ تو نے اقرار جرم کر لیا اور خود اپنے کو بھی رسوا کیا اور اپنے جیسے دوسرے (عبادت گزار) لوگوں کو بھی رسوا کیا اگر تو اس حالت میں مر گیا تو تیری مثل دوسرے (عابد زاہد) لوگ کبھی فلاح یاب نہیں ہوں گے۔ ہر ایک عابد کو لوگ مکار دھوکہ باز کہیں گے۔

برصیصا نے پوچھا تو اب میں کیا کروں؟ کہنے لگا میری ایک بات مان لے اگر وہ بات مان لے گا میں لوگوں کی نظر بندی کر دوں گا تو میں تجھے موجودہ حالت سے بچا کر لے جاؤں گا، برصیصا نے پوچھا وہ کیا بات ہے؟ کہنے لگا بس مجھے سجدہ کر لے برصیصا نے کہا میں ایسا کرتا ہوں شیطان نے کہا برصیصا میرا مقصد پورا ہوا میں یہی چاہتا تھا تیرا انجام یہی ہے کہ تو کافر ہو گیا اب میرا تجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔ (بغوی)

فَكَانَ عَاقِبَتَهُمَآ اَنَّهُمَا فِي النَّارِ: پس ان دونوں کا انجام یہ ہوا۔ یعنی داعی جو کہ شیطان ہے اور مدعو جو کہ انسان ہے جبکہ وہ شیطان کی اطاعت کرے۔ دونوں جہنم میں ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں

گے جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا قول (انما یدعوا حزبہ لیکونوا من اصحاب السعیر۔ فاطر ٦) ہو تو اپنے گروہ کو اس لیے دعوت دیتا ہے تاکہ وہ جہنم والوں میں شامل ہو جائیں اور یہی ہے بدلہ ظالموں کا، جنہوں نے ظلم اور کفر میں اشتراک کیا، اگرچہ ان کے لیے عذاب کی شدت مختلف ہو گی۔

شیطان کا اپنے تمام دوستوں کے ساتھ یہی رویہ ہے وہ ان کو دعوت دیتا ہے اور فریب سے انہیں ایسے امور کے قریب لے آتا ہے جو ان کو نقصان پہنچاتے ہیں جب وہ جال میں پھنس جاتا ہے اور ہلاکت کے اسباب انہیں گھیر لیتے ہیں تو ان سے بری الذمہ ہو کر ان سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔

ہر قسم کی ملامت ہے اس شخص پر جو اس کی اطاعت کرتا ہے حالانکہ اللہ نے اس سے بچنے کے لیے اس سے ڈرایا ہے اور اس کے اغراض و مقاصد سے خبردار کیا ہے لہذا اس کی اطاعت کرنے والا واضح طور پر اللہ تعالیٰ کا نافرمان ہے اس کے پاس کوئی عذر نہیں۔ (تفسیر سعدی)

کامیاب اور ناکام لوگ

سوال ان آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَلْتَنظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ {١٨} وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ {١٩} لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۚ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَائِزُونَ {٢٠} الحشر

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اس نے کل کے لیے کیا آگے بھیجا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو۔ یقین رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے۔ اور تم ان جیسے نہ ہو جانا جو اللہ کو بھول بیٹھے تھے، تو اللہ نے انہیں خود اپنے آپ سے غافل کر دیا۔ وہی لوگ ہیں جو نافرمان ہیں۔ جنت والے اور دوزخ والے برابر نہیں ہو سکتے۔ جنت والے ہی وہ ہیں جو کامیاب ہیں۔

حضرت منذر بن جریر اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ ہم دن چڑھے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر تھے کہ

فَجَاءَهُ قَوْمٌ حُفَاةً عُرَاةً مُجْتَابِي النِّمَارِ أَوِ العَبَاءِ مُتَقَلِّدِي السُّيُوفِ عَامَّتُهُمْ مِنْ مُضَرَ، بَلْ كُلُّهُمْ مِنْ مُضَرَ، فَتَغَيَّرَ وَجْهُ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لما رَأَى بِهِمْ مِنَ الْفَاقَةِ، قَالَ: فَدَخَلَ ثُمَّ خَرَجَ،

کچھ لوگ آئے جو ننگے بدن اور کھلے پیر تھے، صرف چادروں یا عباؤں سے بدن چھپائے ہوئے تلواریں گردنوں میں حمائل کئے ہوئے تھے، یہ تمام لوگ قبیلہ مضر میں سے تھے، ان کی اس فقر و فاقہ کی حالت نے رسول اللہ ﷺ کے چہرے کی رنگت کو متغیر کر دیا، آپ گھر میں گئے پھر باہر آئے۔

پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کہنے کا حکم دیا، اذان ہوئی، پھر اقامت ہوئی، آپ ﷺ نے نماز پڑھائی پھر خطبہ شروع کیا، آپ ﷺ نے سورۃ النساء کی آیت اول

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ، کی تلاوت کی پھر سورۃ حشر کی آیت وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَا قَدَّمَتْ لِغَدٍ،

پڑھی اور لوگوں کو خیرات دینے کی رغبت دلائی، جس پر کسی نے اپنے دینار سے صدقہ دیا، کسی نے اپنے درہم سے صدقہ دیا، کسی نے اپنے کپڑے لتے کا صدقہ دیا، کسی نے اپنی گندم کا صدقہ دیا، کسی نے اپنی کھجور کا صدقہ دیا، یہاں تک کہ کھجور کی گھٹلیاں تک صدقہ کیں۔

آپ برابر تقریر کئے جارہے تھے یہاں تک کہ ایک انصاری ایک تھیلی نقدی کی بھری ہوئی لایا جو بہت وزنی تھی جسے بمشکل اٹھا سکتے تھے، پھر تو لوگوں نے لگاتار جو کچھ پایا لانا شروع کر دیا یہاں تک کہ ہر چیز کے ڈھیر لگ گئے۔

راوی کہتے ہیں کہ اس منظر کے بعد حَتَّى رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَهَلَّلُ وَجْهُهُ كَأَنَّهُ مُذْهَبَةٌ، میں نے دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ کا چہرہ انور چمک اٹھا جیسے سونا چمکتا ہے۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا مَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً حَسَنَةً، فَلَهُ أَجْرُهَا وَأَجْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا بَعْدِهِ، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أُجُورِهِمْ شَيْءٌ، وَمَنْ سَنَّ فِي الْإِسْلَامِ سُنَّةً سَيِّئَةً، كَانَ عَلَيْهِ

وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا، مِنْ غَيْرِ أَنْ يَنْقُصَ مِنْ أَوْزَارِهِمْ شَيْءٌ، جو بھی کسی اسلامی کار خیر کو شروع کرے اسے اپنا بھی اور اس کے بعد جو بھی اس کام کو کریں سب کا بدلہ ملتا ہے لیکن بعد والوں کے اجر گھٹا کر نہیں، اسی طرح جو اسلام میں کسی برے اور خلاف شروع طریقے کو جاری کرے اس پر اس کا اپنا گناہ بھی ہوتا ہے اور پھر جتنے لوگ اس پر کاربند ہوں سب کو جتنا گناہ ملے گا اتنا ہی اسے بھی ملتا ہے مگر ان کے گناہ گھٹتے نہیں (مسلم)

یہاں آیت کریمہ کی ابتدا میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، یہ حکم ہر اس چیز کو شامل ہے جسے کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور ہر اس چیز کو شامل ہے جس کے کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وقت سے پہلے اپنا حساب آپ لیا کرو دیکھتے رہو کہ قیامت کے دن جب اللہ کے سامنے پیش ہو گے تب کام آنے والے نیک اعمال کا کتنا کچھ ذخیرہ تمہارے پاس ہے۔ پھر تاکیداً ارشاد ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہا کرو اور جان رکھو کہ تمہارے تمام اعمال و احوال سے اللہ تعالیٰ پورا باخبر ہے نہ کوئی چھوٹا کام اس سے پوشیدہ نہ بڑا نہ چھپا نہ کھلا۔

{وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ} اللہ کے ذکر کو نہ بھولو ورنہ وہ تمہارے نیک اعمال جو آخرت میں نفع دینے والے ہیں بھلا دے گا اس لئے کہ ہر عمل کا بدلہ اسی کی جنس سے ہوتا ہے اسی لئے فرمایا کہ یہی لوگ فاسق ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے نکل جانے والے اور قیامت کے دن نقصان پہنچانے والے اور ہلاکت میں پڑنے والے یہی لوگ ہیں۔

جیسے دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَأُولَئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ} (الْمُنَافِقُونَ: ۹) اے اہل ایمان! تمہیں تمہارے مال اور تمہاری اولاد اللہ کی یاد سے غافل نہ کرے، جو ایسا کریں وہ سخت زیاں کار ہیں۔

طبرانی میں حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ایک خطبہ کا مختصر سا حصہ یوں منقول ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا أَمَا تَعْلَمُونَ أَنَّكُمْ تَغْدُونَ وَتَرُوحُونَ لِأَجَلٍ مَعْلُومٍ ؟ فَمَنِ اسْتَطَاعَ أَنْ يَقْضِيَ الْأَجَلَ وَهُوَ فِي عَمَلِ اللهِ، عَزَّ وَجَلَّ، فَلْيَفْعَلْ، وَلَنْ تَنَالُوا ذَلِكَ إِلَّا بِاللهِ، عَزَّ وَجَلَّ. إِنَّ قَوْمًا جَعَلُوا آجَالَهُمْ لِغَيْرِهِمْ، فَنَهَاكُمُ اللهُ تَكُونُوا أَمْثَالَهُمْ، کیا تم نہیں جانتے ؟ کہ صبح شام تم اپنے مقررہ وقت کی طرف بڑھ رہے ہو، پس تمہیں چاہیے کہ اپنی زندگی کے اوقات اللہ عزوجل کی فرمانبرداری میں گزارو، اور اس مقصد کو سوائے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کے کوئی شخص صرف اپنی طاقت و قوت سے حاصل نہیں کر سکتا، جن لوگوں نے اپنی عمر اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے سوا اور کاموں میں کھپائی ان جیسے تم نہ ہونا۔

اللہ تعالیٰ نے تمہیں ان جیسے بننے سے منع فرمایا ہے وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللهَ فَأَنْسَاهُمْ أَنْفُسَهُمْ، خیال کرو کہ تمہاری جان پہچان کے تمہارے بھائی آج کہاں ہیں ؟ انہوں نے اپنے گزشتہ ایام میں جو اعمال کئے تھے ان کا بدلہ لینے یا ان کی سزا پانے کے لئے وہ دربار عالیہ میں جا پہنچے، یا تو انہوں نے سعادت اور خوش نصیبی پائی یا نامرادی اور شقاوت حاصل کرلی، کہاں ہیں ؟ وہ سرکش لوگ جنہوں نے بارونق شہر بسائے اور ان کے مضبوط قلعے کھڑے کئے، آج وہ قبروں کے گڑھوں میں پتھروں تلے دبے پڑے ہیں، یہ ہے کتاب اللہ قرآن کریم، تم اس نور سے روشنی حاصل کرو، جو تمہیں قیامت کے دن کے اندھیروں میں کام آسکے، اس کی خوبی بیان سے عبرت حاصل کرو اور بن سنور جاؤ۔

دیکھو اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا علیہ السلام اور ان کے اہل بیت کی تعریف بیان کرتے ہوئے فرمایا إِنَّهُمْ كَانُوا يُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَيَدْعُونَنَا رَغَبًا وَرَهَبًا وَكَانُوا لَنَا خَاشِعِينَ، یعنی وہ نیک کاموں میں سبقت کرتے تھے اور بڑے لالچ اور سخت خوف کے ساتھ ہم سے دعائیں کیا کرتے تھے اور ہمارے سامنے جھکے جاتے تھے۔ (الانبیاء ۹۰)

لَا خَيْرَ فِي قَوْلٍ لَا يُرَادُ بِهِ وَجْهُ اللّٰهِ، وَلَا خَيْرَ فِي مَالٍ لَا يُنْفَقُ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ، وَلَا خَيْرَ فِيمَنْ يَغْلِبُ جَهْلُهُ حِلْمَهُ، وَلَا خَيْرَ فِيمَنْ يَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (المعجم الکبیر للطبرانی) سنو وہ بات بھلائی سے خالی ہے جس سے اللہ کی رضامندی مقصود نہ ہو، وہ مال خیر و برکت والا نہیں جو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کیا جاتا ہو، وہ شخص نیک بختی سے دور ہے جس کی جہالت بردباری پر غالب ہو اس طرح وہ شخص بھی نیکی سے خالی ہاتھ ہے جو اللہ کے احکام کی تعمیل میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف کھائے۔

پھر ارشاد ہوتا ہے کہ لَا يَسْتَوِي أَصْحَابُ النَّارِ وَأَصْحَابُ الْجَنَّةِ، جہنمی اور جنتی اللہ تعالیٰ کے نزدیک یکساں نہیں، جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ اجْتَرَحُوا السَّيِّئَاتِ أَنْ نَجْعَلَهُمْ كَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ سَوَاءً مَحْيَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ سَاءَ مَا يَحْكُمُونَ (الْجَاثِيَةِ: ۲۱) کیا بدکاروں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ ہم انہیں باایمان نیکوکار لوگوں کے مثل کر دیں گے ان کا جینا اور مرنا یکساں ہے ان کا یہ دعویٰ بالکل غلط اور برا ہے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے وَمَا يَسْتَوِي الْأَعْمَى وَالْبَصِيرُ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَلَا الْمُسِيءُ (غَافِرٍ: ۵۸) نابینا اور بینا برابر نہیں ہیں، ایماندار، اعمال صالحہ والے اور بدکار برابر نہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ربانی ہے أَمْ نَجْعَلُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ كَالْمُفْسِدِينَ فِي الْأَرْضِ أَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِينَ كَالْفُجَّارِ (ص: ۲۸) کیا ہم ایمان لانے اور نیک اعمال کرنے والوں کو فساد کرنے والوں جیسا بنادیں گے یا پرہیزگاروں کو مثل فاجروں کے بنادیں گے؟

اس طرح کی بے شمار آیات اور احادیث شریفہ ہیں، جن کی روشنی میں اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکوکار لوگوں کا اکرام ہوگا، انہیں عزت دی جائے گی، جب کہ بدکار،

گناہ گار، نافرمان، سرکش لوگوں کے لیے کوئی اکرام، کوئی عزت نہیں ہوگی۔ وہ رسوا کن، دردناک اور بڑے عذاب کا شکار بنیں گے، فیصلہ کن مرحلہ وہ ہوگا جب اعمال صالحہ کرنے والوں کے داہنے ہاتھ میں نامہ اعمال تھمایا جائے گا اور وہ کامیابی اور کامرانی ملنے پر فلک شگاف آواز بلند کریں گے۔ اور ناکامی اور نامرادی کا منہ دیکھنے والے سر شرم سے جھکائے، اپنے چہرے لٹکائے، اعمال نامے پیٹھوں پیچھے چھپائے ہوئے ہوں گے، کامیاب اور فائز المرام لوگوں کے لیے جنت کا اٹل وعدہ اور فیصلہ ہے۔

عظمت قرآن

سوال اس آیت کا ترجمہ و تفسیر کیجیے، اسی کی روشنی میں عظمت قرآن بیان کیجیے۔

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ {۲۱} الحشر.

جواب ترجمہ: اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر اتارا ہوتا تو تم اسے دیکھتے کہ وہ اللہ کے رعب سے جھکا جارہا ہے، اور پھٹا پڑتا ہے۔ اور ہم یہ مثالیں لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ وہ غور و فکر سے کام لیں۔

قرآن کریم کی بزرگی بیان ہو رہی ہے کہ فی الواقع یہ پاک کتاب اس قدر بلند مرتبہ ہے کہ دل اس کے سامنے جھک جائیں، رونگٹے کھڑے ہو جائیں، اس کے سچے وعدے اور اس کی حقانی ڈانٹ ڈپٹ ہر سننے والے کو بید کی طرح تھرادے اور دربار الٰہی میں سر بسجود کرادے۔

قرآن کریم کی عظمت کا یہ عالم ہے، اس کی ہیبت اور رعب کا یہ عالم ہے کہ اگر یہ قرآن جناب باری کسی سخت بلند اور اونچے پہاڑ پر بھی نازل فرماتا اور اسے غور و فکر اور فہم و فراست کی حس بھی دیتا تو وہ بھی اللہ کے خوف سے ریزہ ریزہ ہو جاتا، پھر انسانوں کے دلوں پر جو نسبتاً بہت نرم اور چھوٹے ہیں۔ جنہیں پوری سمجھ بوجھ ہے، اس کا بہت بڑا اثر پڑنا چاہیے، ان مثالوں کو لوگوں کے سامنے ان کے غور و فکر کے لئے اللہ تعالیٰ نے بیان فرمادیا۔

مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو بھی ڈر اور عاجزی چاہیے، متواتر حدیث میں ہے کہ منبر تیار ہونے سے پہلے رسول اللہ ﷺ ایک کھجور کے تنے پر ٹیک لگا کر خطبہ پڑھا کرتے تھے جب منبر بن گیا، بچھ گیا وَجَاءَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لِيَخْطُبَ فَجَاوَزَ الْجِذْعَ إِلَى نَحْوِ الْمِنْبَرِ، فَعِنْدَ ذَلِكَ حَنَّ الْجِذْعُ وَجَعَلَ يَئِنُّ كَمَا يَئِنُّ الصَّبِيُّ الَّذِي يُسَكَّن، لِمَا كَانَ يُسمع مِنَ الذِّكْرِ وَالْوَحْيِ عِنْدَهُ (ابن جریر، تفسیر ابن کثیر) اور حضور ﷺ اس پر خطبہ پڑھنے کو کھڑے ہوئے اور وہ تنا دور ہو گیا، تو اس میں سے رونے کی آواز آنے لگی اور اس طرح سسکیاں لے لے کر وہ رونے لگا جیسے کوئی بچہ بلک بلک کر روتا ہو اور اسے چپ کرایا جارہا ہو کیونکہ وہ ذکر وحی کے سننے سے کچھ دور ہو گیا تھا۔

عارف باللہ حضرت امام حسن بصری رحمہ اللہ اس حدیث کو بیان کر کے فرماتے تھے کہ فَأَنْتُمْ أَحَقُّ أَنْ تَشْتَاقُوا إِلَى رسول الله صلى الله عليه وسلم من الْجِذْعِ، لوگو ایک کھجور کا تنا اس قدر اللہ کے رسول ﷺ کا مشتاق ہو تو تمہیں چاہیے کہ اس سے بہت زیادہ شوق اور چاہت تم رکھو۔

جب بے جان تنے کا یہ عالم ہے، جب بے جان پہاڑ کا یہ عالم ہے جو اس آیت کریمہ میں بیان کیا گیا تو انسان جو سوچتا ہے، سمجھتا ہے، دیکھتا ہے اس کا شوق اور ذوق اس مخلوق سے زیادہ ہونا چاہیے جو سوچتی ہے اور نہ ہی سمجھتی ہے، بولتی ہے اور نہ ہی دیکھتی ہے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ وَلَوْ أَنَّ قُرْآنًا سُيِّرَتْ بِهِ الْجِبَالُ أَوْ قُطِّعَتْ بِهِ الْأَرْضُ أَوْ كُلِّمَ بِهِ الْمَوْتَى، اگر کوئی قرآن ایسا ہوتا کہ اس کے باعث پہاڑ چلا دیئے جاتے یا زمین کاٹ دی جاتی یا مردے بول پڑتے۔ (الرعد ۳۱)

تو ایسا اس قرآن کریم کے ساتھ ہی ممکن تھا، یہ سب کچھ اس قرآن سے کروایا جاتا تو ہو سکتا تھا مگر حیرت اور استعجاب کہ کفار نے تسلیم نہیں کیا، کفار نے ہٹ دھرمی سے کام لیا، وہ اس عظیم الشان انقلابی کتاب پر ایمان نہیں لائے، اس کے برعکس وہ اس عظیم انقلابی کتاب کی مخالفت کرتے رہے۔

دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا {وَإِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْأَنْهَارُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَاءُ وَإِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ} (الْبَقَرَة: ۷۴) بعض پتھر ایسے ہیں جن میں سے نہریں بہ نکلتی ہیں بعض وہ ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی نکلتا ہے بعض اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمہ اللہ تفسیر عزیزی میں لکھتے ہیں کہ قرآن کریم اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ کی مثال عمدہ قسم کی غذا کی ہے اگر یہ غذا تندرست جسم میں داخل ہو جائے تو اثرات پیدا کرے گی جسم میں خون پیدا کرنے اور جسمانی قوی کی مضبوطی کا باعث ہو گی، اس کے برخلاف اگر یہ غذا بیمار جسم میں چلی جائے تو بیماری میں اضافہ ہو گا تو جب تک انسانی فاسد مادوں کو اسہال کے ذریعے نکال نہ دیا جائے تو اس وقت تک کوئی دوا جسم میں اثر نہیں کرے گی اسی طرح انسان کے دل و دماغ سے فاسد اخلاق تعصبات، باطل عقائد اور رسومات قبیحہ اور جہالت کا نکالنا ضروری ہے جب یہ چیزیں انسان کے روح میں موجود اللہ کی کلام اور نبی کی زبان سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو گا۔ (تفسیر عزیزی بحوالہ معارف الفرقان للقاسمی)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جب تک انسان خواہشات اور شہوات میں ڈوبا ہوا ہے اس وقت تک قرآن اس کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ (بحوالہ معالم العرفان)

مفسر قرآن حضرت صوفی عبدالحمید سواتی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں پرانے بزرگوں میں دوسری تیسری صدی کے بزرگ حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ فساد چھ راستوں سے مخلوق میں آتا ہے۔ پہلا راستہ ہے ضعف النیۃ بعمل الآخرۃ یعنی آخرت کے اعمال کے بارے میں انسانوں کی نیت کمزور ہوتی ہے، حالانکہ وہ دنیا کے عمل تو پکی نیت سے انجام دیتے ہیں مگر آخرت والے کام بے یقینی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ فساد کا دوسرا راستہ یہ ہے کہ انسانوں کے اجسام ان کی خواہشات کی سواریاں بنی ہوئی ہیں اور وہ خواہشات نفسانی کے علاوہ کسی دوسری چیز کی طرف توجہ ہی نہیں کرتے۔

فرماتے ہیں کہ فساد کا تیسرا راستہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی تو مختصر ہے مگر وہ آرزو لمبی رکھتی ہے اور وہ قرآن کی طرف توجہ ہی نہیں دے سکتے۔ چوتھا راستہ یہ ہے کہ عام طور پر لوگ اللہ کی رضا پر مخلوق کی رضا کو مقدم رکھتے ہیں ان کو ہمیشہ یہی فکر لاحق رہتی ہے کہ لوگ ناراض نہ ہو جائیں خدا چاہے راضی ہو یا ناراض۔ پھر فرماتے ہیں کہ فساد کا پانچواں راستہ یہ ہے کہ لوگ خواہشات میں پڑ کر سنت نبوی ﷺ کو پس پشت ڈال دیتے ہیں اکثر لوگ خوشی اور غمی کے مواقع پر سنت کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ خواہشات نفسانی کا ہی اتباع کرتے ہیں۔

اور چھٹا راستہ یہ ہے کہ اکثر لوگ سلف کی معمولی سی لغزش کو بھی اپنے لئے بڑے بڑے گناہوں کے ارتکاب کا ذریعہ بنالیتے ہیں اور ان کی خوبیوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہودیوں نے اسی لئے انبیاء پر اعتراضات کیے تاکہ لوگ ان کو برا نہ کہیں۔ جب لوگ ان کی برائیوں پر اعتراض کرتے تو وہ کہتے کہ اللہ کے نبی بھی تو ایسا کرتے رہے ہیں، لہٰذا اگر ہم نے ایسا کام کر لیا تو کون سا حرج ہو گیا۔ بہر حال حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ نے انسانی اخلاق و اعمال میں فساد کے ان چھ ذرائع کی نشاندہی کی ہے۔ (معالم العرفان)

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب تک انسان اس دنیا میں رہتا ہے اس پر مادیت غالب رہتی ہے۔ اور اس مادیت کے اثر سے انسان بالکل اس طرح بے ہوش رہتا ہے جس طرح کسی آدمی کو کلورو فارم سونگھا دیا گیا ہو۔ ایسا کرنے سے انسان بے حس ہو جاتا ہے اور پھر اگر آپریشن کر کے اس کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ بھی دیا جائے تو اسے محسوس نہیں ہوتا۔ اسی طرح انسان پر مادیت کا کلوروفارم چڑھا ہوا ہے جب تک اس کا اثر باقی ہے انسان کو برے اعمال کی وجہ سے اس کی ملکیت پر ہونے والا دکھ درد محسوس نہیں ہوتا۔ اس بے حسی کو ختم کرنے کے لئے دو طریقے ہیں۔ اگر انسان کی طبعی موت واقع ہو جائے تو مادیت کا خول اتر کر اصلی انسان ظاہر ہو جاتا ہے اور پھر اس کو بڑی

تکلیف پہنچتی ہے۔ یا پھر دوسری صورت یہ ہے کہ انسان عبادت و ریاضت کے ذریعے مادیت یا حیوانیت کے اثر کو کم کر دے تاکہ بے حسی ختم ہو کر اصلی چیز ظاہر ہو جائے۔

اسی لئے شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا کی زندگی کے دوران بہیمیت اور ملکیت کی کشمکش جاری رہتی ہے اور انسان کی فطرت کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی بہیمیت کمزور ہو کر ملکیت میں اضافہ ہو، یہی وہ مقصد ہے جس کے حصول کے لئے ہم کوئی کوشش نہیں کرتے۔ اگر کوئی محنت کرتے بھی ہیں تو وہ اس قدر قلیل مقدار میں ہوتی ہے کہ بے اثر ہو کر رہ جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک انسان پر مادیت کا خول غالب ہے۔ اس پر قرآن کی آواز اور نبی کا فرمان اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ (معالم العرفان)

صاحب معالم العرفان فرماتے ہیں الغرض! اللہ تعالیٰ نے انسان کے متعلق یہ شکوہ کیا ہے کہ وہ اللہ کے عطا کردہ تمام کمالات کے باوجود اس قدر سنگدل واقع ہوا ہے کہ وہ قرآن حکیم کا اثر قبول نہیں کرتا۔ فرمایا اگر ہم یہ قرآن پہاڑوں پر نازل کرتے اور ان میں انسانوں جیسا شعور ہوتا تو وہ اس کو سن کر ریزہ ریزہ ہو جاتے یعنی اللہ کے خوف سے ڈر جاتے۔ فرمایا وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ یہ مثالیں ہیں جو ہم لوگوں کے لئے بیان کرتے ہیں۔ اور اس کا مقصد یہ ہے لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ، تاکہ وہ غور و فکر کریں اور اللہ کے کلام کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ (معالم العرفان)

صاحب تدبر قرآن اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ یہ ان منافقین کو زجر و ملامت ہے کہ جہاں تک تعلیم و تذکیر اور اتمام حجت کا تعلق ہے اللہ نے تمہارے لیے کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ یہ قرآن ایسی چیز ہے کہ اگر پہاڑ جیسی سخت اور بے حس چیز پر بھی اتارا جاتا تو وہ بھی خشیت الٰہی سے سرافگندہ اور پاش پاش ہو جاتا لیکن تم ایسے سنگ دل اور ڈھیٹ ہو کہ تمہارے دل ذرا بھی اس سے متاثر نہیں ہو رہے ہیں۔ وَتِلْكَ الْأَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُونَ فرمایا کہ یہ تمثیلیں ہم اس لیے بیان کر رہے ہیں کہ لوگ اپنے حال پر غور کریں کہ اگر ایسی مؤثر چیز بھی ان کے دلوں پر اثر انداز نہیں ہو رہی ہے تو اس میں قصور اس شے کا نہیں بلکہ صرف ان کے دلوں کی قساوت کا ہے اور

پھر وہ اس معاملے پر بھی غور کریں کہ جب ان کے دلوں کی قساوت اس درجہ بڑھ گئی ہے تو ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ان کے دلوں پر بھی اسی طرح مہر کر دے جس طرح اس نے یہود کے دلوں پر کر دی۔ (تدبر قرآن)

مفسر قرآن سید قطب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ ایک تمثیل ہے لیکن ایک حقیقت کو بطول مثال پیش کیا گیا ہے۔ یہ قرآن ایک عظیم وزن رکھتا ہے۔ اس کے اندر بہت بڑی قوت ہے، بے پناہ اثر کا مالک ہے، اور اس کے مقابلے میں کوئی چیز ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔ جس پر اس کا وزن پڑے تو متزلزل ہو جاتا ہے، پاش پاش ہو جاتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب پہلی مرتبہ اسے پڑھا تو وہ لرز کر رہ گئے جب وہ ایک رات سننے والے سے سن رہے تھے۔

والطور الخ " قسم ہے طور کی اور ایک ایسی کھلی کتاب کی جو رقیق جلد میں لکھی ہوئی ہے اور آباد گھر کی، اور اونچی چھت کی، اور موجزن سمندر کی، کہ تیرے رب کا عذاب ضرور واقع ہونے والا ہے جسے کوئی دفع کرنے والا نہیں۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ اس کے بعد وہ گھر کو واپس آئے اور اس قدر غم زدہ ہو گئے کہ لوگ ایک ماہ تک ان کی عیادت کرتے رہے۔ کچھ ایسے لمحات آتے ہیں کہ انسان کا دل قرآنی معارف کے لئے کھل جاتا ہے تو قرآن کا اثر اس قدر تیز ہوتا ہے کہ انسان ہل کر رہ جاتا ہے اور اس پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے اور انسان کے اندر اس قدر تغیرات اور تبدیلیاں آجاتی ہیں جس طرح مقناطیس اور بجلی کا اثر لوہے اور جسم پر ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی شدید اثر ہوتا ہے۔ اللہ خالق الجبال بھی ہے اور منزل القرآن بھی۔ اللہ کا فرمان ہے۔ لو انزلنا ۔تا. خشیة الله: اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔ (تفسیر ظلال القرآن)

میرے اللہ کے ناموں کی بڑی برکت ہے، علماء کرام نے ان ناموں کو اپنی کتابوں میں جمع کیا ہے انہیں یاد کرنا چاہیے، ان کا معنیٰ مفہوم اور مطلب یاد کر کے استحضار رکھا جائے۔

اسماء الحسنیٰ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عٰلِمُ الْغَیْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِیْمُ {۲۲} هُوَ اللّٰهُ الَّذِیْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَیْمِنُ الْعَزِیْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا یُشْرِكُوْنَ {۲۳} هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى یُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ {۲۴} الحشر

جواب ترجمہ: وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ چھپی اور کھلی ہر بات کو جاننے والا ہے۔ وہی ہے جو سب پر مہربان ہے، بہت مہربان ہے۔ وہ اللہ وہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، جو بادشاہ ہے، تقدس کا مالک ہے، سلامتی دینے والا ہے، امن بخشنے والا ہے، سب کا نگہبان ہے، بڑے اقتدار والا ہے، ہر خرابی کی اصلاح کرنے والا ہے، بڑائی کا مالک ہے۔ پاک ہے اللہ اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ وہ اللہ وہی ہے جو پیدا کرنے والا ہے، وجود میں لانے والا ہے صورت بنانے والا ہے، اسی کے سب سے اچھے نام ہیں۔ آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ اس کی تسبیح کرتی ہیں، اور وہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا نہ تو کوئی پالنے اور پرورش کرنے والا ہے، نہ اس کے سوا کسی کی ایسی نشانیاں ہیں کہ اس کی کسی قسم کی عبادت کوئی کرے اس کے سوا جن جن کی لوگ پرستش اور پوجا کرتے ہیں وہ سب باطل ہیں، وہ تمام کائنات کا علم رکھنے والا ہے، جو چیزیں ہم پر ظاہر ہیں اور جو چیزیں ہم سے پوشیدہ ہیں سب اس پر عیاں ہیں، خواہ آسمان میں ہوں، خواہ زمین میں ہوں، خواہ چھوٹی ہوں خواہ بڑی ہوں، یہاں تک کہ اندھیریوں کے ذرے بھی اس پر ظاہر ہیں۔ اللہ تعالیٰ اتنی بڑی وسیع رحمت والا ہے کہ اس کی رحمت تمام مخلوق پر محیط ہے، وہ دنیا اور آخرت میں رحمان بھی ہے اور رحیم بھی ہے۔

اللہ کی شان رحمت کا کیا کہنا ، جس کا فرمان عالی شان ہے {وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ} (الْأَعْرَافِ: ۱۵۶) میری رحمت تمام چیزوں کو گھیرے ہوئے ہے۔ اللہ کی شان رحمت دیکھیے وہ فرماتا ہے {كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلَى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ} (الْأَنْعَامِ: ۵۴) تمہارے رب نے اپنی ذات پر رحم و رحمت لکھ لی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اس کی بیش بہا رحمت کا کیا کہنا فرمان ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهِ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا هُوَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ (یُونُس) اے میرے حبیب! فرمادیجیے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و رحمت کے ساتھ ہی خوش ہونا چاہیے، تمہاری جمع کردہ چیز سے بہتر یہی ہے۔ (سورۃ یونس ۵۸)

اس مالک، رب، معبود کے سوا اور کوئی ان اوصاف والا نہیں، تمام چیزوں کا تنہا وہی مالک و مختار ہے ہر چیز کا ہیر پھیر کرنے والا سب پر قبضہ اور تصرف رکھنے والا بھی وہی ہے کوئی نہیں جو اس کی مزاحمت یا مدافعت کرسکے یا اسے ممانعت کرسکے، وہ قدوس ہے یعنی طاہر ہے، مبارک ہے۔

ذاتی اور صفاتی نقصانات سے پاک ہے تمام بلند مرتبہ فرشتے اور سب کی سب اعلیٰ مخلوق اس کی تسبیح و تقدیس میں علی الدوام مشغول ہے کل عیبوں اور نقصانوں سے مبرا اور منزہ ہے، اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں اپنے افعال میں بھی اس کی ذات ہر طرح کے نقصان سے پاک ہے۔

وہ مؤمن ہے یعنی تمام مخلوق کو اس نے اس بات سے بے خوف رکھا ہے کہ ان پر کسی طرح کا کسی وقت اپنی طرف سے ظلم ہو، اس نے یہ فرما کر کہ یہ حق ہے سب کو امن دے رکھا ہے، اپنے ایماندار بندوں کے ایمان کی تصدیق کرتا ہے، وہ مہیمن ہے یعنی اپنی تمام مخلوق کے اعمال کا ہر وقت یکساں طور شاہد ہے اور نگہبان ہے، جیسے فرمان ہے اللہ تعالیٰ ہر چیز پر شاہد ہے اور فرمان ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيدٌ عَلَى مَا يَفْعَلُونَ (یُونُس: ۴۶) اللہ تعالیٰ ان کے تمام افعال پر گواہ ہے جو کچھ وہ کرتے ہیں۔ دوسرے مقام پر ارشاد ہے {أَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلَى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا كَسَبَتْ} (الرَّعْدِ: ۳۳) مطلب یہ ہے کہ ہر نفس جو کچھ کر رہا ہے اسے اللہ تعالیٰ دیکھ رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ عزیز ہے ہر چیز اس کے تابع فرمان ہے کل مخلوق پر وہ غالب ہے پس اس کی عزت عظمت جبروت کبریائی کی وجہ سے اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا، وہ جبار اور متکبر ہے، جباریت اور کبر صرف اسی کے شایان شان ہے۔

حدیث قدسی شریف میں ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے **اَلْعَظَمَةُ إِزَارِي، وَالْكِبْرِيَاءُ رِدَائِي، فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا عَذَّبْتُه** عظمت میرا تہد ہے اور بڑائی میری چادر ہے جو مجھ سے ان دونوں میں سے کسی کو چھیننا چاہے گا میں اسے عذاب دوں گا۔

اپنی مخلوق کو جس چیز پر چاہے وہ رکھ سکتا ہے، کل کاموں کی اصلاح اسی کے ہاتھ ہے، وہ ہر برائی سے نفرت اور دوری رکھنے والا ہے، جو لوگ اپنی کم سمجھی کی وجہ سے دوسروں کو اس کا شریک ٹھہرا رہے ہیں وہ ان سب سے بیزار ہے، اس کی الوہیت شرکت سے مبرا ہے۔

اللہ تعالیٰ خالق ہے یعنی مقدر مقرر کرنے والا، پھر باری ہے یعنی اسے جاری اور ظاہر کرنے والا، کوئی ایسا نہیں کہ جو تقدیر اور تنفیذ دونوں پر قادر ہو جو چاہے اندازہ مقرر کرے اور پھر اسی کے مطابق اسے چلائے بھی کبھی بھی اس میں فرق نہ آنے دے، بہت سے ترتیب دینے والے اور اندازہ کرنے والے ہیں جو پھر اسے جاری کرنے اور اسی کے مطابق برابر جاری رکھنے پر قادر نہیں، تقدیر کے ساتھ ایجاد اور تنقید پر بھی قدرت رکھنے والی اللہ کی ہی ذات ہے، پس خلق سے مراد تقدیر اور برء سے مراد تنفیذ ہے۔

وَلَأَنْتَ تَفْرِي مَا خَلَقْتَ ... وَبَعْضُ الْقَوْمِ يَخْلُقُ ثُمَّ لَا يَفْرِي

اور تم وہی چیز کاٹتے ہو (یا پورا کرتے ہو) جسے تم نے بنایا (یا جس کا ارادہ کیا) اور بعض لوگ (صرف) بناتے ہیں (یا ارادہ کرتے ہیں) پھر اسے پورا نہیں کرتے۔ یعنی تم جو ارادہ کرتے ہو، اسے مکمل بھی کرتے ہو اور کچھ لوگ صرف ارادہ کرتے ہیں، مگر اسے عملی جامہ نہیں پہناتے۔ عرب میں یہ الفاظ ان معنوں میں برابر بطور مثال کے بھی مروج ہیں، اسی کی شان ہے کہ جس چیز کو جب جس طرح کرنا چاہے کہہ دیتا ہے کہ ہو جا وہ اسی طرح اسی صورت میں ہو جاتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان عالی شان ہے {فِي أَيِّ صُورَةٍ مَا شَاءَ رَكَّبَكَ} [الانفطار، جس صورت میں اس نے چاہا تجھے ترکیب دی۔ اسی لئے یہاں فرماتا ہے وہ مصور بے مثل ہے یعنی جس چیز کی ایجاد جس طرح کی چاہتا ہے کر گزرتا ہے۔ پیارے پیارے بہترین اور بزرگ تر ناموں والا وہی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا إِنَّ لِلّٰهِ تَعَالَى تِسْعَةً وَّتِسْعِينَ اِسْمًا، مِائَةٌ إِلَّا وَاحِدًا، مَنْ أَحْصَاهَا دَخَلَ الْجَنَّةَ، وَهُوَ وِتْرٌ يُحِبُّ الْوِتْرَ (بخاری و مسلم) اللہ تعالیٰ کے ننانوے یعنی ایک کم ایک سو نام ہیں جو انہیں شمار کرلے یاد رکھ لے وہ جنت میں داخل ہو گا وہ وتر ہے یعنی واحد ہے اور اکائی کو دوست رکھتا ہے۔

ترمذی شریف میں ان ناموں کی صراحت بھی آئی ہے جو یہ ہیں۔

هُوَ اللهُ الَّذِي لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ، الرَّحْمٰنُ، الرَّحِيمُ، الْمَلِكُ، الْقُدُّوسُ، السَّلَامُ، الْمُؤْمِنُ، الْمُهَيْمِنُ، الْعَزِيزُ، الْجَبَّارُ، الْمُتَكَبِّرُ، الْخَالِقُ، الْبَارِءُ، الْمُصَوِّرُ، الْغَفَّارُ، الْقَهَّارُ، الْوَهَّابُ، الرَّزَّاقُ، الْفَتَّاحُ، الْعَلِيمُ، الْقَابِضُ، الْبَاسِطُ، الْخَافِضُ، الرَّافِعُ، الْمُعِزُّ، الْمُذِلُّ، السَّمِيعُ، الْبَصِيرُ، الْحَكَمُ، الْعَدْلُ، اللَّطِيفُ، الْخَبِيرُ، الْحَلِيمُ، الْعَظِيمُ، الْغَفُورُ، الشَّكُورُ، الْعَلِيُّ، الْكَبِيرُ، الْحَفِيظُ، الْمُقِيتُ، الْحَسِيبُ، الْجَلِيلُ، الْكَرِيمُ، الرَّقِيبُ، الْمُجِيبُ، الْوَاسِعُ، الْحَكِيمُ، الْوَدُودُ، الْمَجِيدُ، الْبَاعِثُ، الشَّهِيدُ، الْحَقُّ، الْوَكِيلُ، الْقَوِيُّ، الْمَتِينُ، الْوَلِيُّ، الْحَمِيدُ، الْمُحْصِي، الْمُبْدِءُ، الْمُعِيدُ، الْمُحْيِي، الْمُمِيتُ، الْحَيُّ، الْقَيُّومُ، الْوَاجِدُ، الْمَاجِدُ، الْوَاحِدُ، الصَّمَدُ، الْقَادِرُ، الْمُقْتَدِرُ، الْمُقَدِّمُ، الْمُؤَخِّرُ، الْأَوَّلُ، الْآخِرُ، الظاهر، الباطن، الولى، الْمُتَعَالِي، الْبَرُّ، التَّوَّابُ، الْمُنْتَقِمُ، الْعَفُوُّ، الرَّءُوفُ، مَالِكُ الْمُلْكِ، ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ، الْمُقْسِطُ، الْجَامِعُ، الْغَنِيُّ، الْمُغْنِي، الْمَانِعُ، الضَّارُّ، النَّافِعُ، النُّورُ، الْهَادِي، الْبَدِيعُ، الْبَاقِي، الْوَارِثُ، الرَّشِيدُ، الصَّبُورُ

اللہ۔ یہ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے، یہی اسم جلالہ ہے، یہی اسم اعظم بتایا گیا ہے، یہ ایک جامع نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات کا جامع ہے، اللہ تعالیٰ کا یہی وہ نام ہے جس کے ساتھ سورۃ الحشر میں اس کی بہت سی صفات ذکر کی گئی ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کا ارشاد ہے

{هُوَ اللّٰهُ الَّذِی لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيمُ. هُوَ اللّٰهُ الَّذِی لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْمَلِكُ الْقُدُّوسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ سُبْحَانَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ. هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَى يُسَبِّحُ لَهُ مَا فِی السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ} (الحشر)

وہ اللہ ہے، وہ ذات کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ چھپی اور ظاہر کو جاننے والا ہے، وہ رحمان اور رحیم ہے، وہ اللہ وہ ہے کہ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے، وہ بادشاہ ہے، وہ پاک ہے، وہ سلامتی دینے والا ہے، وہ تصدیق کرنے والا ہے، وہ نگہبان ہے، وہ زبردست ہے، وہ اصلاح کرنے والا ہے، وہ بڑائی والا ہے، وہ ان چیزوں سے پاک ہے جن کو وہ شریک ٹھہراتے ہیں، وہ اللہ پیدا کرنے والا ہے، وہ باری ہے، وہ مصور ہے، اس کے اچھے اچھے نام ہیں، تسبیح کرتی ہے اسی کی جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں، وہی زبردست حکمت والا ہے۔

قرآن کریم میں اسم اللہ بے شمار مقامات پر وارد ہوا ہے، اہل علم و عرفان کی تلاش و جستجو سے علم ہوتا ہے کہ نو سو اسی (۹۸۰) مقامات پر اللہ کا نام آیا ہے، اس قدر کثرت سے اس نام کے قرآن کریم میں وارد ہونے کے بارے میں اہل دانش کہتے ہیں کہ یہ اس کی عظمت شان اور اہمیت مقام پر دلالت ہے۔

معارف اسم اللہ پر اہل علم نے کتابیں تحریر کی ہیں، میرے عظیم استاذ، محدث دوراں، غزالی دوراں، ترمذی وقت شیخ موسیٰ روحانی بازی رحمہ اللہ نے لفظ اللہ کی تحقیق پر عظیم اور ضخیم کتاب "فتح اللہ" عربی زبان میں تحریر فرمائی، جو اپنے موضوع پر بے مثال ولاجواب کتاب ہے۔

اہل علم نے اللہ کا معنیٰ اور مفہوم یوں بیان فرمایا ہے أَنَّهُ الْمَعْبُودُ وَحْدَهُ، الَّذِي لَا يَسْتَحِقُّ الْعِبَادَةَ بِجَمِيعِ أَنْوَاعِهَا سِوَاهُ، وہی اکیلا معبود ہے، کوئی بھی اس کے سوا عبادت کی تمام اقسام کا مستحق نہیں ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ، اَلرَّحِيمُ : رحمن رحمت سے مشتق ہے، یہ مبالغے کا صیغہ ہے، فعلان کے وزن پر ہے، بعض کہتے ہیں کہ یہ مشتق نہیں ہے، رحمن اور رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں لیکن رحیم سے رحمٰن میں مبالغہ زیادہ ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ أَنَا اللهُ، وَأَنَا الرَّحْمٰنُ، خَلَقْتُ الرَّحِمَ وَشَقَقْتُ لَهَا مِنِ اسْمِي، فَمَنْ وَصَلَهَا وَصَلْتُهُ، وَمَنْ قَطَعَهَا بَتَتُّهُ (ترمذی) میں رحمٰن ہوں، میں نے رحم (رشتہ داری) کو پیدا کیا، میں نے رحم سے ہی اپنا نام رکھا ہے، جو اس (رشتہ داری) کو ملائے گا میں اسے ملاؤں گا، جو اس (رشتہ داری) کو کاٹے گا میں اسے کاٹوں گا۔ یہی وہ روایت ہے جس کو پیش نظر رکھتے ہوئے بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ رحمٰن مشتق ہے، اس لیے اس کے برخلاف کہنے کا کوئی مطلب ہے۔

رحمٰن ایسا صفاتی نام ہے جو اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہے، اللہ کے علاوہ کسی اور کو رحمٰن نہیں کہا جاسکتا، بعض اہل تفسیر کہتے ہیں رحمٰن نام ہی کی نسبت ایسی ہے کہ اللہ اپنی ساری مخلوق پر رحم کرتا ہے، بایں طور کہ اس نے مخلوق کو پیدا کیا اور ان کو وسیع رزق عطا فرمایا، رحمٰن قرآن کریم میں ستاون مقامات پر آیا ہے۔ رحمٰن میں ایسی صفت رحمت پائی جاتی ہے جو اسی کے ساتھ قائم ہے، ابن جریر نے عزرمی سے نقل فرمایا کہ رحمٰن میں رحمت عام ہے، جو تمام مخلوق کے لیے ہے، رحیم میں رحمت خاص ہے جو اہل ایمان کے لیے ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جہاں جہاں استویٰ عرش (عرش پر مستوی ہونے) کا ذکر فرمایا اس کے ساتھ کہیں بھی رحیم کی صفت ذکر نہیں فرمائی، جہاں بھی استویٰ علی العرش کا ذکر

فرمایا وہاں رحمٰن کی صفت ذکر فرمائی ہے تاکہ رحمت اس کی تمام مخلوق کو شامل رہے، مگر جہاں بھی ایمان والوں کا ذکر فرمایا وہاں رحیم کی صفت ذکر فرمائی ہے، جیسے ارشاد ہے {وَكَانَ بِالْمُؤْمِنِينَ رَحِيماً} (الأحزاب ۴۳) رحمٰن کی رحمت دنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں عام ہے، وہ دنیا اور آخرت والوں پر رحم کرتا ہے، رحیم اہل ایمان کے لیے خاص ہے کہ وہ آخرت میں قیامت کے دن اہل ایمان پر رحم کرے گا، حالانکہ رحمٰن اہل ایمان اور کافروں پر دنیا میں یکساں رحم کرتا ہے، جیسے معاشی مسائل ہیں، حیات دنیوی کے وسائل واسباب ہیں، اسی طرح ان اشیاء کی دونوں کے لیے یکساں فراہمی جس سے ان کی کفالت ہوتی ہے، یعنی رحمان کی رحمت عام ہے، جب کہ رحیم کی رحمت خاص ہے۔

بعض اہل علم رحمٰن ورحیم میں کوئی فرق نہیں کرتے، کیونکہ ایک ماثور ومنقول دعا میں یوں الفاظ وارد ہوئے ہیں يَا رَحْمَانَ الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَرَحِيمَهُمَا، یہاں رحیم اس معنٰی ومفہوم پر محمول ہے کہ اللہ دنیا میں ایمان والوں پر اس لیے رحم کرتا ہے کہ وہ اس پر ایمان لاتے ہیں، اس کے احکامات کی پیروی کرتے ہیں، اس کے نواہی سے بچتے ہیں، رحیم ان کے اوامر کی پیروی اور نواہی سے اجتناب کی راہیں آسان کرتا ہے، اور آخرت میں ان پر رحم کرنے کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ انہیں جنت میں داخل کرے گا، ان کے ان اعمال کے سبب جو انہوں نے دنیا میں کیے تھے، اس پر ایمان لائے تھے، اس کی اطاعت کی تھی، گویا کہ انہیں جنت کا بدلہ ملنا اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے تو اس دعا میں رحیمھا کا یہی مفہوم ہے۔

رحمٰن قرآن کریم میں ستاون مرتبہ آیا ہے، جب کہ رحیم ایک سو چودہ مرتبہ آیا ہے، اکثر اہل علم کہتے ہیں کہ رحمٰن عربی زبان کا لفظ ہے، جب کہ حضرت ثعلبہ کہتے ہیں کہ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے۔ **الملك، المالك**، بادشاہ، آقا، بادشاہی اسی کی ہے۔ اسی لیے وہ ''بادشاہ'' کی صفات سے متصف ہے یعنی عظمت، کبریائی، غلبہ، تدبیر و انتظام وغیرہ۔ اسے تخلیق میں، احکامات جاری کرنے میں اور جزاوسزا دینے میں مطلقاً تصرف حاصل ہے۔ اوپر والا اور نیچے والا سارا جہان اس کی ملکیت ہے۔ سب

اس کے بندے، مملوک اور محتاج ہیں۔ وہی اکیلا مالک ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ملک وہ ذات ہے جو اپنی ذات اور اپنی صفات میں ہر موجود سے مستغنی اور بے نیاز ہو، مگر اس سے کوئی مستغنی اور بے پرواہ نہ ہو، اپنی ذات میں بھی اور اپنی صفات میں بھی، اپنے وجود میں بھی اور اپنی بقاء میں بھی، بلکہ یوں کہہ لیجیے کہ ہر موجود چیز اسی سے ہوتی ہے، اس کے علاوہ ہر چیز اپنی ذات اور اپنی صفات میں اس کی مملوک ہوتی ہے، مگر وہ ہر چیز سے مستغنی ہوتا ہے، یہی ملک مطلق ہے۔ کوئی بندہ مطلق بادشاہی کا تصور بھی نہیں کر سکتا، اس لیے کہ وہ ہر چیز سے مستغنی نہیں ہو سکتا، کیونکہ وہ ہمیشہ اللہ کا محتاج و فقیر ہوتا ہے۔

امام ترمذی کی روایت کے مطابق الملک اسماء حسنیٰ میں سے ایک نام ہے، لغت میں ملک بادشاہ کو کہا جاتا ہے، دنیا میں اور لوگ بھی ملک کہلائے ہیں اور کہلواتے ہیں، یہ نام رکھنا شرک کے زمرے میں نہیں آتا، قرآنی نص کے مطابق بھی ملک کی جمع ملوک انسانی بادشاہوں کے لیے استعمال ہوئی ہے، ملک کا لفظ بھی انسان کے لیے استعمال ہوا ہے۔

قرآنی ارشادات دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک کا لفظ جب اللہ کے لیے استعمال ہوا تو اضافت کے ساتھ ہوا، جیسے ملک الناس ہے، اس کا معنیٰ ہے ساری نوع انسانی کا بادشاہ، پتا چلا کہ ساری انواع انسانی کی بادشاہی اور حکومت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے اور نہ ہی آنے والے وقت میں یہ مرتبہ اور مقام کسی کو حاصل ہو گا، اللہ کو قرآن کریم میں ملک الحق فرمایا گیا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کے بادشاہ محض ظاہری اعتبار سے ملوک و ملک کہلواتے ہیں جب کہ حقیقی ملک اللہ ہی ہے کوئی اور نہیں ہے، نمرود، بخت نصر دو کافر بادشاہ، سلیمان اور ذوالقرنین مسلمان بادشاہ اگرچہ روئے زمین کے بہت بڑے حصہ پر ان کی بادشاہی کا سکہ چلتا تھا، مگر ساری دنیا پر ان کا سکہ نہیں چلتا تھا اور نہ ہی ساری روئے زمین ان کے زیر نگیں تھی۔

اللہ ہی ہے جو ملک الحق ہے، وہ ملک القدوس ہے، جو عالم امر اور عالم خلق کا اکیلا حکمران ہے، مالک اور ملک میں اہل علم فرق بیان کرتے ہیں، ان میں ملک مالک سے زیادہ وسعت رکھتا ہے، کیونکہ ممکن ہے کوئی آدمی زمین کے کسی حصہ کا مالک ہو مگر ضروری نہیں کہ وہ اس قطعہ زمین کا بادشاہ بھی ہو، ملک کے لیے صفت حکمرانی لازمی ہے، اگرچہ اسے اس زمین کے حصہ کے مالکانہ حقوق نہ بھی حاصل ہوں۔

ملک پر توجہ دیتے ہوئے یہ بات بھی ذہن نشین رہنا چاہیے کہ ملک میں قہاریت والی صفت پائی جاتی ہے، ملک میں کسی کو بلند رتبہ دینے، کسی کے مابین فیصلہ کرنے، کسی کے درمیان عدل وانصاف کرنے، کسی سے انتقام لینے، کسی کو انصاف دینے، کسی سے کوئی چیز روک دینے، کسی کو نقصان پہنچانے، کسی کو نفع پہنچانے کی طاقت والی صفات بھی ہوتی ہیں، یہ ساری چیزیں فرمانروائی کے لیے ضروری ہیں، جو ایک اللہ کے سوا کسی اور میں نہیں پائی جاتی ہیں۔

علامہ منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ لوگ بادشاہ کی سلطنت میں بود وباش رکھتے ہیں، وہاں کے قوانین کی پابندی کو بھی لازم سمجھتے ہیں، نیز قانون سے لاعلمی ان کے لیے عدالت میں کوئی عذر معقول تصور نہیں کی جاتی، اسی اصول پر شریعت مبنی ہے (جو قانون الٰہی ہے) اور اسی اصول پر شریعت سے لاعلمی کسی انسان کے لیے عذر نہ ٹھہری، وللہ الحجۃ البالغہ اللہ کی برہان کامل ہے۔

اسم پاک الملک سے تعلق پیدا کرنے والوں کو لازم ہے کہ خود کو ایک وفادار شہری، محب قانون اور محب الملک ہونے کا ثبوت دیں، جب لوگ اس نکتہ کو سمجھ جائیں گے تو آئین ربانی کا نفاذ کلی سارے ملک میں خود بخود ہو جائے گا، سورۃ قمر میں عند ملیک مقتدر، ملیک بھی بمعنیٰ الملک ہے مگر یہ نام حدیث ترمذی میں نہیں آیا۔

ملک کی شان یہ ہے کہ وہ حکم کرتا ہے، وہ روکتا ہے، وہ عزت دیتا ہے، وہ اپنے بندوں کے معاملات میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے، وہ جیسے چاہتا ہے انہیں پلٹتا ہے۔ (بدائع الفوائد ج ۲ ص

۲۱۲، شرح اسماء الحسنیٰ ابن الجوزی)

اللہ تعالیٰ کو چیزوں کی ملکیت تام حاصل ہے، اس کی کامل ملکیت کا ہی یہ کمال ہے کہ ان اشیاء میں اس کا تصرف عام ہے، ثواب اور عقاب میں تنوع ہے، اکرام اور اہانت میں تنوع ہے، عدل و فضل میں تنوع ہے، اعزاز اور اذلال میں تنوع ہے۔

اللہ وہ ملک (بادشاہ) ہے جو سچا ہے، حقیقی ہے، اور بادشاہت اسی کو سزاوار ہے جو حکم کرتا ہے، روکتا ہے، ثواب دیتا ہے، سزا دیتا ہے، اہانت کرتا ہے، اکرام کرتا ہے، عزت دیتا ہے اور ذلت دیتا ہے (مفتاح دار السعادہ ج ا ص ۱۰۷)

اَلْقُدُّوسُ، بہت پاک ذات، یہ نام اللہ کی پاکی بیان کرتا ہے، یہ نام ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام عیبوں اور نقائص سے پاک ہے، منزہ ہے، نبی کریم ﷺ وتر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد **سُبْحَانَ الْمَلِكِ الْقُدُّوسِ** تین بار اور **رب الملائكة والروح** پڑھا کرتے تھے (نسائی، ابو داؤد)

اللہ تعالیٰ کی ذات کے پاک اور مقدس ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ان نقائص اور عیوب سے پاک ہے جو انسانوں میں پائے جاتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو عیوب اور کمزوریاں کسی فرشتے میں بھی پائی جاتی ہیں ان سے بھی رب تعالیٰ مقدس اور پاک ہے۔

علامہ منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ وہ لوازم حدوث اور نقصان امکان سے ارفع و اعلیٰ ہے، وہ دریافت حِس اور تصورِ خیال اور احاطہ عقل سے بلند تر ہے، وراء الوراء ثم وراء الورا۔ (شرح اسماء الحسنیٰ)

جو لوگ اس اسم پاک سے تعلق پیدا کرنا چاہیں، انہیں مواظبت و ضو ضروری ہے اور لازم ہے کہ قابل نفرت عیوب اور قابل انکار نقائص سے خود کو دور رکھیں، افعال محمودہ اور اعمال صالحہ کی پابندی اختیار کریں اور بایں ہمہ اس نقص بشری کو جو شامل ولاحق بشریت ہے فراموش نہ کریں، جبریل کو روح القدس کہنا یا مسجد اقصیٰ کو بیت المقدس کہنا یہ معنیٰ رکھتا ہے کہ وہ اپنی اپنی صنف میں صفت پاکیزگی سے تعلق رکھتے ہیں۔ (شرح اسماء الحسنیٰ)

اَلسَّلَامُ، سلامتی دینے والا، یعنی وہ تمام نقائص سے پاک ہے اور اس بات سے بھی پاک ہے کہ مخلوق میں کوئی اس کی مثل ہو، وہ تمام عیوب سے منزہ ہے اور اس بات سے بھی منزہ ہے کہ کوئی مخلوق کسی صفت کمال میں اس کی مثل یا اس سے قریب ہو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: {لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ} (الشوریٰ:۱۱) کوئی چیز اس کی مثل نہیں {وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ} (الاخلاص: ۴) اس کا کوئی ہم سر نہیں {هَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا} (مریم: ۶۵) کیا تجھے کوئی اس کے برابر کا معلوم ہے؟ {فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا} (البقرہ: ۲۲) دوسروں کو اللہ کے جوڑ کا قرار نہ دو۔ ''قدوس'' اور ''سلام'' کا مفہوم باہم مشابہ ہے۔ ان دونوں میں اللہ تعالیٰ سے نقص کی ہر لحاظ سے نفی پائی جاتی ہے اور ہر لحاظ سے کمال مطلق کا اثبات ہوتا ہے کیوں کہ جب نقص کی نفی ہو جائے تو اس سے کمال کا اثبات ہوتا ہے۔

سلام بطور نام صرف اللہ ہی کے لیے ہے، اس کے معنیٰ سالم ہیں، یعنی جو سلامتی میں کامل ہو، وہ جس کی سلامتی معرض خطر وزوال میں نہ ہو، وہ جو دوسروں کو سلامتی بخشتا ہو، نبی ﷺ نماز کے بعد پڑھا کرتے تھے، اَللّٰهُمَّ اَنْتَ السَّلَامُ وَمِنْكَ السَّلَامُ تَبَارَكْتَ يَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَام (بخاری) ام المومنین خدیجۃ الکبریٰ کے حال میں ہے کہ جبریل نے ان کو رسول مقبول کے واسطہ سے اللہ تعالیٰ کا سلام اور اپنا سلام پہنچایا تو انہوں نے جواب میں کہا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّلَامُ وَمِنْهُ السَّلَامُ، یعنی اللہ پاک تو خود سلامتی کا مالک ہے اور ہم کو سلامتی اسی سے ملتی ہے۔ سلام مصدر بھی ہے، اہل ایمان کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سلام ملے گا (ایضاً)

اَلْمُؤْمِنُ: تصدیق کرنے والا، جس نے اپنی صفات کمال اور کمال جلال وجمال کے ساتھ اپنی تعریف فرمائی جس نے دلائل وبراہین کے ساتھ رسول بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ اس نے معجزات اور دلائل کے ساتھ اپنے رسولوں کی تصدیق فرمائی جن سے ان کا سچا ہونا اور ان کی لائی ہوئی شریعت کا صحیح ہونا ثابت ہو گیا۔

مؤمن اگر ایمان سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو ایمان دیتا ہے، سورۃ حجرات

میں فرمایا کہ اللہ ہی ہے جس نے ایمان کو تمہارا محبوب بنا دیا ہے، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی شان بیان کرتے ہوئے سورۃ مجادلہ میں فرمایا کہ یہی ہیں وہ لوگ جن کے قلوب میں ایمان لکھ دیا ہے۔

مؤمن امن سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو امن دیتا ہے، بیت اللہ شریف کی تعریف میں فرمایا کہ ہم نے بیت اللہ شریف کو لوگوں کے لیے پناہ گاہ اور امن گاہ بنایا ہے، اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں جس خلافت راشدہ کا ذکر فرمایا ہے اس میں خوف کو امن کے ساتھ بدلنے کی بشارت بھی سنائی۔

قاضی منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الغرض اللہ تعالیٰ کا اسم پاک مؤمن ہے، کیونکہ وہ ایمان عطا فرماتا ہے، وہ امن عطا کرتا ہے، اس کا نام فساد کو مٹانے والا ہے، اس کا نام دل کو آرام اور روح کو اطمینان دینے والا ہے، اس کا نام ملک کو بسانے والا، رعایا کو ٹکانے والا ہے، اس کا نام اجڑا وطن آباد کرنے والا ہے، جو لوگ اس اسم پاک سے تعلق پیدا کرنا چاہیں، انہیں مصلحت عامہ اور امن عامہ کا ممد و معاون بننا چاہیے، انہیں فساد انگیز تحریکوں، گندی سازشوں سے الگ رہنا چاہیے، انہیں امن کے طریقے اور ایمان کے ضابطے معلوم کر کے ان پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ)

اَلْمُهَيْمِنُ: نگہبان، نگران ، یعنی پوشیدہ باتوں اور دلوں کے رازوں سے باخبر جسے ہر چیز کا علم ہے، دوسرا معنیٰ مہیمن کا یہ ہے کہ وہ جو دوسرے کے خوف سے ہم کو مامون بنا دے۔

عربی محاورے میں هَيْمَنَ الطَّائِرُ عَلَى فِرَاشِهٖ کہا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ پرندے نے اپنے بچوں کو پروں کے نیچے چھپا لیا، اسی طرح محاورہ ہے هَيْمَنَ عَلَى كَذَا فلاں چیز کی نگہبانی کی۔

مہیمن اس امانت دار کو کہا جاتا ہے جو کسی کا حق ضائع نہ کرے، مہیمن اس نگہبان کو کہتے ہیں جو تمام خطرات کو دور کر دے، مہیمن اللہ جل شانہ کا صفاتی نام ہے،

اَلْعَزِيْزُ: بڑے اقتدار والا ہے، با اقبال ہے، اسے ہر طرح کا اقبال حاصل ہے، قوت کا اقبال، غلبہ کا اقبال، امتناع کا اقبال یعنی کوئی مخلوق اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی، تمام مخلوقات اس کے آگے دبی ہوئی

ہیں، اس کی مطیع ہیں اور اس کی عظمت کو دل سے تسلیم کرتی ہیں۔

قرآن کریم میں بہت سے مقامات پر یہ نام استعمال کیا گیا ہے، ۲۴ مقامات پر عزیز حکیم، ۵ مقامات پر عزیز رحیم، ۲ مقامات پر عزیز غفور، ۳ مقامات پر عزیز غفار، ایک جگہ عزیز مقتدر، ۲ مقامات پر قوی عزیز، ایک جگہ پر عزیز وھاب، ۴ مقامات پر عزیز الحلیم، دو دفعہ عزیز الحمید فرمایا گیا ہے (شرح اسماء الحسنیٰ منصور پوری رحمہ اللہ)

ان جملہ آیات پر غور کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ مالک جسے ساری مخلوق پر غلبہ تام اور اقتدار کامل حاصل ہے وہ اپنی اقتدار و قدرت کا استعمال اور رحم، غفران اور علم، حمد اور رحم کے ساتھ فرماتا ہے، یہ سبق ہے ان لوگوں کے لیے جن کو دنیائے فانی میں چند روزہ محدود غلبہ کسی مقام یا اشخاص پر حاصل ہو گیا ہو کہ وہ بھی اپنے اختیارات کا استعمال علم صحیح کے بعد اول عفو و رحم اور پھر دانائی و حکمت کے ساتھ کیا کریں، اس اسم سے تخلق کا یہی طریق ہے، نیز اہل ایمان کو لازم ہے کہ عزت مزعومہ کی تلاش میں عزت ایمانی کو خیر آباد نہ کہہ دیا کریں۔ (شرح اسماء الحسنیٰ)

اَلْجَبَّارُ: ہر خرابی کی اصلاح کرنے والا، اس کا مطلب سب سے بلند بھی ہے، زبردست بھی جس کے سامنے کوئی بولنے کی جرأت نہ کر سکے اور اس کا معنی شفقت کرنے والا، ٹوٹے دلوں کو جوڑنے والا بھی ہے۔ ضعیفوں، عاجزوں اور پناہ کے طالبوں کے زخمی دلوں پر مرہم رکھنے والا ہے۔

جب کسی انسان کا نام جبار ہوتا ہے تو اس کی وجہ تسمیہ اور ہوتی ہے، وہ جبار النخل سے بنایا گیا ہے یعنی جو کھجور اتنی بلند ہو کہ اس پر چڑھنے کا حوصلہ نہ ہو سکے، چونکہ سرکش، سنگ دل، بے رحم لوگ ایسے ہی ہوا کرتے ہیں کہ ان سے خلق خدا کو آزار کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوا کرتا اور وہ کسی کا حق اپنے اوپر نہیں سمجھا کرتے، اس لیے وہ جبار کہلانے کے سزاوار ہوتے ہیں، سورہ ہود میں **وَاتَّبَعُوا اَمرَ كُل جَبَّارٍ عَنِيدٍ**، سورہ ابراہیم میں ہے **وَخَابَ كُل جَبَّار عَنِيدٍ**، سورہ مومن و مریم، قصص، مائدہ، شعراء میں بھی یہی لفظ ایسے سرکش انسانوں کے متعلق آیا ہے، سورۃ ق میں یہی لفظ نبی

ﷺ کی منفی صفت میں واقع ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا نام جبار ان معانی میں ہے کہ وہ ریڑھ کی ہڈی کی گرہوں کو پیوستگی دینے والا، شکستہ دل انسانوں کو ڈھارس دینے والا، کشتی شکستگان کو ساحل پر پہنچانے والا، وہی دوائے دردمنداں ہے اور وہی مرہم شکستہ دلاں! اس جبر سے جبروت بھی بنا ہے، جو جبر کا مبالغہ ہے، حصن حصین میں بحوالہ طبرانی اوسط درج ہے کہ نبی ﷺ یہ دعا پڑھا کرتے تھے **سُبْحَانَ ذِي الْمُلْكِ وَالْمَلَكُوتِ وَالْجَبَرُوتِ وَالْكِبْرِيَآءِ وَالْعَظَمَةِ**، اس اسم پاک سے تخلق کے لیے صفت ہمدری وغمگساری پیدا کرنی ضروری ہے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ للمنصوری رحمہ اللہ)

اَلْمُتَكَبِّرُ: بڑائی کا مالک ہے، کبریائی والا، یعنی اتنا عظیم کہ اس کی طرف کسی برائی، نقص یا عیب کی نسبت نہیں ہو سکتی۔ المتکبر کبر سے بنا ہے، اس کا معنیٰ رفعت، شرف، بزرگی ہے، اہل دنیا کا نام متکبر اس لیے برا ہے کہ ان میں درحقیقت رفعت وشرافت ذاتی ذرا نہیں ہوتی، اضافی اوصاف سے وہ جھوٹے غرور میں آکر متکبر بن جاتے اور اپنی نوع کے دیگر انسانوں کو حقیر وذلیل سمجھنے لگتے ہیں، ان جھوٹ کی بزرگی پر اترانے والوں کی علامت یہ ہے کہ ہر چند ان کی بات بات میں تکبر وغرور بھرا ہوتا ہے لیکن اس پر کسی وقت اگر کوئی ان کو متکبر کہہ دے تو اسے برا مناتے ہیں، اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے جسے حقیقتاً کبریائی حاصل ہے اور وہی ہے جو اپنی صفت میں آپ کو متکبر کہہ سکتا ہے، اہل دنیا کی صفت میں یہ لفظ سورہ مومن و نحل وزمر میں مستعمل ہوا ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفت میں صرف ایک مقام یعنی سورۃ حشر میں آیا ہے۔

متکبر جب کہ اسمائے حسنیٰ میں سے ہے تو اس کے معنیٰ یہ ہیں وہ معبود جو اپنے علو وبرتری میں سب سے اعلیٰ وارفع ہے، جو صفات ذمیمہ اور اخلاق رذیلہ سے برتر وبالا ہے، کبریائے ذاتی استعلائے نفسی اور ہر ایک کبیر سے برتری نے اسی وصفی نام کو ذات سبحانی پر صادق کر دیا ہے، اس اسم سے تعلق پیدا کرنے والے کے لیے یہ بھی لازم ہے کہ اہل دنیا میں سے جو مغرور ومتکبر ہوں، ان کے سامنے اپنے

آپ کو ذلیل وخوار نہ ہونے دے اور یہ بھی لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کبریائی کو پیش نظر رکھتا ہوا خود اپنے نفس کو متواضع بنائے، مساکین و فقراء سے نفرت نہ کرے۔ (معارف اسماء)

اَلْخَالِقُ، اَلْخَلَّاقُ: پیدا کرنے والا، یہ دونوں نام خلق سے مشتق ہیں، خلق کا لغوی معنیٰ کبھی تقدیر ہوتا ہے اور کبھی اس کا معنیٰ ایجاد بھی ہوتا ہے، ایجاد اور موجد پر اس معنیٰ کو محمول کرنا اللہ کے سوا کسی پر نہیں ہوسکتا، قرآن میں اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَ الْاَمْرُ میں خلق تقدیر کے معنیٰ میں ہے، امر سے مراد ایجاد ہے، جیسے کن فیکون میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا نام خالق، باری اور مصور یکجا طور پر سورۃ الحشر میں آئے ہیں، سات مقامات قرآن کریم میں ایسے ہیں جہاں خالق اضافت کے ساتھ آیا ہے، اسی طرح خالقین کا لفظ جمع کے ساتھ بھی قرآن کریم میں آیا ہے، اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ دو مقامات پر آیا ہے، اسی طرح خلّاق کا لفظ دو مقامات پر آیا ہے۔

خلق لغت میں اندازہ کرنے کے معنیٰ میں آتا ہے، اور خلق کا معنیٰ اس طرح پیدا کرنا بھی آتا ہے جس کی پیدائش کی پہلے کوئی مثال موجود نہ ہو اور اللہ تعالیٰ نے جو چیز بھی پیدا فرمائی اس کی پہلے کوئی مثال نہیں ہوئی، اسی طرح خلق کا معنیٰ بنانا بھی ہے۔ (معجم مقاییس اللغہ)

خالق وہ ہے جس نے ماہیات کا اندازہ اور ذوات کا تعین فرمایا، جو حقائق کو عدم سے وجود میں لایا، سورۃ الاعراف میں ہے اللہ تمہارا رب ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو بنایا، سورۃ النباء میں فرمایا اللہ وہ ذات ہے جس نے رات کو بنایا، سورۃ الملک میں فرمایا کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے موت اور زندگی کو پیدا فرمایا، سورۃ زخرف میں فرمایا اللہ وہ ذات ہے جس نے جوڑا جوڑا بنایا۔

سورۃ یاسین میں فرمایا کہ اللہ وہ ذات ہے جو پیدائش کی ہر ایک حالت کا جاننے والا ہے، یہاں مادی اور غیر مادی دونوں طرح کی چیزوں پر خلق کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے، خلق کا لفظ کسی مادی چیز کو کسی

خاص شکل میں تیار کرنے پر بھی بولا جاتا ہے، جیسے قرآن کریم میں فرمایا گیا کہ میں تمہارے لیے مٹی سے پرندے کی شکل کی طرح بناتا ہوں، فَتَبٰرَكَ اَحسَنُ الخَالِقِينَ بھی اسی معنٰی کے لحاظ سے ہے اللہ جل شانہ اَحسَنُ الخَالِقِينَ بھی ہے، خالق بھی ہے، خلاق بھی ہے، ان تینوں لفظوں اور ناموں کا مادہ ایک ہی ہے، مگر ہر ایک کی کیفیت الگ الگ ہے، ہر ایک کی خصوصیت الگ الگ ہے۔

اَلبَارِی: وجود میں لانے والا، باری موجد اور مبدع کو کہا جاتا ہے، بَرَأَ اللّٰهُ الخَلقَ کا معنٰی ہے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا، بَرِیَّه مخلوق کو کہا جاتا ہے، اس معنٰی کے لحاظ سے خالق اور باری میں کوئی فرق نہیں ہے، ایک معنٰی باری کا کاٹنا اور جدا کرنا بھی کیا گیا ہے، اس معنٰی کے لحاظ سے خالق اور باری میں یہ فرق ہو گا کہ خالق کا معنٰی چیزوں کو پیدا کرنے والا ہو گا جب کہ باری کا معنٰی اشخاص کو ایک دوسرے سے جدا کرنے والا ہو گا۔

علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے شرح اسماء الحسنٰی میں فرمایا کہ الباری البرا سے مشتق ہے، برا مٹی کو کہتے ہیں، اس معنٰی کے لحاظ سے الباری اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو مٹی سے مرکب کیا ہے۔ (شرح اسماء الحسنٰی للبیضاوی) اللہ تعالیٰ کا نام الباری قرآن کریم تین بار آیا ہے، الباری سورۃ الحشر میں ایک بار آیا ہے، جب کہ بَارِئِكُم دو بار آیا ہے ۔

علامہ ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ الباری کا اطلاق صرف اللہ تعالیٰ پر ہو سکتا ہے اس کے علاوہ کسی پر اس نام کا اطلاق نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے مخلوق کو عدم سے وجود بخشا، بندے کی اپنی قدرت نہیں تھی (شفاء)

اَلمُصَوِّرُ: صورتیں بنانے والا، جس نے تمام موجودات کو پیدا کیا، انھیں وجود بخشا اور اپنی حکمت کے ساتھ ٹھیک ٹھیک بنایا اور اپنی حمد و حکمت کے ساتھ ان کی صورت گری کی۔ وہ ازل سے اس وصف عظیم کا حامل ہے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ وہ رحموں میں جیسے چاہتا ہے تمہاری صورتیں بناتا ہے، ماں کے پیٹ میں بچہ کی صورت وشکل بنانے والا اللہ ہی ہے، وہ سفید رنگت، سیاہ رنگت، سانولی رنگت، سالم وتندرست، ناقص وناکمل، مرد اور عورت جیسی تخلیق وہ چاہتا ہے وہی صورت بناتا ہے۔

علامہ منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دنیا میں جو انسان مصور کہلاتے ہیں وہ صورت بنانے والے نہیں ہوتے بلکہ صورت کی نقل اتارنے والے ہوتے ہیں، پھر وہ نقل بھی اصل سے کوئی مناسبت نہیں رکھتی، اگر انسان وحیوان یا شجر وحجر کا سایہ نمودار ہو جاتا ہے تو سورج یا چراغ کی فضیلت کیا ہے اللہ تعالیٰ مصور ہے اور اس نے کروڑوں، اربوں، کھربوں صورتیں بنائی ہیں، بایں ہمہ ہر ایک صورت دوسرے سے بالکل الگ ہے، اس تفریق کو اول جنس میں پھر نوع میں، پھر صنف میں، پھر افراد میں دیکھو کہ یہ تمام سلسلہ عجائب در عجائب امور پر مشتمل ہو گا۔

عالم جمادات کو لو، پتھر ایک جنس ہے اور اس کی قسم میں ہزاروں اقسام سیکڑوں رنگ ہیں، ان کے ہزاروں خواص ہیں، ریتلی پتھری سے لے کر یاقوت، الماس، نیلم تک غور کرتے چلے جاؤ، یہ ایک ناپیدا کنار سلسلہ ہے، کوئلہ، نمک، مٹی کا تیل ہزاروں معدنیات ہیں۔

عالم نباتات کو لو، زمین پر پھیل جانے والی بوٹیاں، چھت پر چڑھ جانے والی بیلیں، زمین سے اوپر اٹھی ہوئی بوٹیاں، پودے، درخت، کروڑوں اقسام کے ملیں گے، کوئی صرف سایہ دیتا ہے، کوئی پھل اور سایہ دونوں، کوئی عمارت کے کام میں بھی آتا ہے، ہر ایک کا پتہ پھل، پھول رنگت وغیرہ تاثیر بالکل الگ الگ ہے، تاثیرات کے لحاظ سے جڑ میں اثر اور ہے، پتہ میں اور اوپر کے حصے کی خاصیت اور ہے، اندر کے گودے کی اور، میوہ میں خاصیت جدا ہے اور بیج میں جدا۔ عطر، گوند، عرق بھی انہی بوٹیوں سے حاصل ہوتے ہیں، یہ ایسا جنگل ہے جس کی پوری سیر کوئی نہیں کر سکا۔

عالم حیوانات میں آؤ، انڈا دینے والے، بچہ دینے والے، زمین کے اندر گھسنے والے، زمین کے اوپر

بسنے والے، دوپاؤں والے، چار پاؤں والے، گھاس کھانے والے، ماس کھانے والے، دودھ دینے والے، گوشت مہیا کرنے والے، بوجھ اٹھانے والے، سواری دینے والے، حملہ کرنے والے، مطیع ہو کر رہنے والے کروڑہا اقسام کے موجود ہیں۔ بہت سے ایسے حیوان ہیں جن سے آج تک انسانی تمدن نے فائدہ اٹھانا بھی نہیں سیکھا، انہی کی اقسام میں طیور بھی شامل ہیں اور وہ بھی اپنی رنگتوں، بولیوں اور پرواز کے لحاظ سے مختلف ہیں۔ اپنی اپنی عادات واطوار ہیں، دوسرے سے متمیز ہیں، پرواز کی شکلیں، گھونسلے بنانے کی صورتیں جدا جدا ہیں۔

پھر عالم انسان کو لو، وہ سب تفاوت جو حیوانیت میں تھی، ملک ملک کے باشندوں کی بناوٹ، خط وخال وغیرہ میں موجود ہیں، انسانوں کے علوم الالسنہ ایک ایسی شے ہیں، جس کی بابت یہ ضرب المثل صادق آتی ہے کہ از علم لغت فرشتہ عاری است، انسان کی قوت ایجاد واختراع اس قدر بڑھی ہوئی ہے کہ جملہ کائنات پر گویا اسی کو تصرف تام اور اقتدار کلی حاصل ہے۔

پھر روحانیات میں آؤ، تو معلوم ہوتا ہے کہ دنیا ومافیہا سب کے سب ایک عالم صغیر تھے، عالم کبیر تو انسان کا قلب ہے، جہاں حقائق ومعارف کی نشو ونما ہوتی ہے، معانی تمثیل اختیار کرتے ہیں، تصورات کو درجہ تصدیق ملتا ہے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ)

قرآن کریم میں مصور بطور صیغہ اسم ایک بار آیا ہے، سورۃ الحشر کی آیت ۲۴ میں جہاں خالق، باری اور مصور یکجا آیا ہے، صیغہ فعل کے ساتھ چار بار آیا ہے۔

علامہ ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے دونوں نام خالق اور مصور مطلق بولے جائیں تو ان دونوں سے اللہ ہی مراد ہوتا ہے ہاں اگر یہ دونوں نام مقید ہوں تو پھر ان کا اطلاق بندے پر بھی ہو سکتا ہے۔ (شفاء العلیل)

ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب طریق الہجرتین میں لکھا کہ خالق، باری، مصور کا اللہ تعالیٰ پر اطلاق صانع اور فاعل سے زیادہ کامل ہے، یہی وجہ ہے کہ صانع اور فاعل اسماء الحسنیٰ میں شامل نہیں

ہیں۔(طریق الہجرتین)

مفتاح دارالسعادت میں ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ اسم خالق مخلوق کا تقاضا کرتا ہے، اسم باری مبروء کا تقاضا کرتا ہے جب کہ اسم مصور تصویر کشیدہ کا تقاضا کرتا ہے اور یہ ضروری ہے۔

اَلْغَفَّارُ: بہت زیادہ بخشنے والا، الغفار یہ غفر سے ہے، غفر کا لغوی معنیٰ چھپانا اور ڈھانپ دینا ہے، عربی محاورہ میں کہا جاتا ہے **غَفَرَ الْمَتَاعَ فِي الْوِعَاءِ** کپڑے صندوق میں رکھ دیے، **غَفَرَ الشَّيبَ بِالْخِضَابِ** سفید بالوں کو خضاب سے چھپا دیا، اسی سے اسم آلہ **مِغفَر** ہے، لوہے کہ ٹوپی جو حفاظت کے لیے سر پر پہنی جاتی ہے، **غَفِيرہ** لوہے کے لباس کو کہا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کا نام غفار ہے، اس لیے کہ وہ اپنے بندوں کے گناہوں کو چھپا دیتا ہے، چھپا دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ گندی، قابل نفرت چیز پر مٹی ڈال دیتے ہیں اور اللہ پاک ہماری آلودگیوں کو اپنی بخشش و بخشائش سے دور کر دیتا ہے۔

اسی مصدر سے **غَفُورٌ** بھی آتا ہے اور **غَافِرُ الذَّنبِ** بھی، غفار قرآن مجید میں تین مقامات پر آیا ہے، سورہ نوح میں بحالت انفرادی **انکسبن مغفرا** اور سورہ زمر و مومن میں **عَزِيزُ الْغَفَّارِ** فرمایا گیا ہے اور عزت و قوت، قدرت و شوکت کے ساتھ غفران کی شان اور بھی عالی ہو جاتی ہے۔(شرح اسماء الحسنیٰ للمنصوری رحمۃ اللہ)

غافر، غفور، غفار یہ تین منصوص نام ہیں جو قرآن کریم میں آئے ہیں، اللہ کے بندے کے لیے بھی تین نام آئے ہیں، ان میں ایک ظالم، دوسرا ظلوم اور تیسرا ظلام ہے، یہ اللہ کے ایسے بندوں کے نام ہیں جو معصیت میں آگے نکل گئے، گویا کہ اللہ تعالیٰ یوں کہتے ہیں کہ میرے بندے! تیرے ظلم و معصیت میں تین نام ہیں، اور میرے رحمت و مغفرت میں تین نام ہیں، اگر تو ظالم ہے تو میں غافر ہوں، اگر تو ظلوم ہے تو میں غفور ہوں، اگر تو ظلام ہے تو میں غفار ہوں، پھر تیری صفات متناہی اور ختم ہونے والی ہیں جب کہ میری صفات غیر متناہی اور نہ ختم ہونے والی ہیں، جیسا کہ میری شایان شان ہیں، اس لیے اے مسکین! تو مایوس مت ہو، جو اپنے رب کی رحمت سے مایوس ہو گا وہ گمراہوں میں سے ہو گا۔

قرآن کریم میں مغفرت کے الفاظ ماضی اور مستقبل کے صیغوں کے ساتھ آئے ہیں، سورہ ص میں فَغَفَرْنَا لَهُ ہے، سورہ النساء میں لَا يَغْفِرُ اور يَغْفِرُ استعمال ہوا ہے، اسی سے امر کے صیغہ سے وَاغْفِرْ لَنَا آیا ہے اسی طرح سورۃ البقرہ میں غُفْرَانَكَ مصدر استعمال ہوا ہے۔ اسم غفور قرآن کریم میں اکانوے بار آیا ہے، تہتر بار اسم غفور رحیم کے ساتھ مل کر آیا ہے، چھ مقامات پر غفور کے ساتھ حلیم کا نام استعمال ہوا ہے، چار مقامات پر عفو اور غفور آیا ہے، تین مقامات پر غفور شکور کے ساتھ آیا ہے، اسی طرح غفور کے ساتھ عزیز دو مقامات پر آیا ہے، اسی طرح غفور کے ساتھ وَدُوْدٌ ایک مقام پر آیا ہے۔

اس کی معاف کرنے کی صفت ہمیشہ سے معروف ہے اور بندوں کے گناہ بخش دینا سدا سے اس کی شان ہے، ہر کوئی اس کی معافی اور مغفرت کا محتاج ہے جس طرح اس کی رحمت اور اس کے کرم کے بغیر کسی کو چارہ نہیں، اس نے وعدہ کیا ہے کہ جو شخص معافی کے ذرائع اختیار کرے گا، اسے ضرور بخش دیا جائے گا۔ اس کا ارشاد ہے وَاِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰى (طٰہٰ: ۸۲) میں بہت بخشنے والا ہوں اس کو جو توبہ کرے، ایمان لائے، نیک عمل کرے پھر ہدایت پر قائم رہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ غفار وہ ذات ہے جو خوبصورتی کو ظاہر کرتی ہے اور برائی کو چھپاتی ہے، گناہ برائیوں میں سے ہیں، جن پر اللہ تعالیٰ پردہ ڈال کر دنیا میں چھپا لیتا ہے، اور آخرت میں ان کی سزا سے درگزر کرتا ہے، پہلی پردہ پوشی اس کی طرف سے اپنے بندے کے لیے یہ ہوتی ہے کہ وہ بندے کی اندرونی برائیوں کو اس کے ظاہری حسن کے پردے سے چھپا دیتا ہے۔

تورات، زبور، انجیل اور قرآن مجید فرقان حمید میں بے شمار مقامات پر یہ بات آئی ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی مَزَلَّةُ الْاَقْدَام کو ظاہر فرمایا، اور انہیں معافی کا پروانہ عطا فرمایا، موسیٰ علیہ السلام نے قبطی کو مکہ مار کر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا، پھر انہوں نے اللہ سے درخواست کی تھی کہ اے میرے رب! میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے تو مجھے معاف کر دے (قصص ۱۶) داؤد علیہ السلام کی مزلۃ الاقدام کا ذکر کرتے ہوئے انہیں معافی کا پروانہ عطا فرمایا، رحمت دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کو فرمایا گیا کہ اپنے ذنب

کی معافی مانگیے (غافر ۵۵) پھر اللہ تعالیٰ نے معافی کا اعلان فرمایا۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وہ غفور و غفار اور ستار ہے جو اپنے بندوں کے گناہوں کی پردہ پوشی کرتا ہے، وہ انہیں ڈھانپ لیتا ہے کسی کو ان کے گناہوں کی اطلاع نہیں دیتا، وہ ان کی خطاؤں اور گناہوں سے درگزر کر دیتا ہے، اس لیے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ ان کو معاف کر دیتا ہے، انہیں درگزر کر دیتا ہے، وہ ایسا غفور ہے جو ایک کے بعد ایک ان کا گناہ معاف کرتا ہے، ان کے ان گنت گناہوں کو معاف کرتا ہے اور ان کی پردہ پوشی کرتا ہے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ، اشتقاق اسماء اللہ للزجاجی، تفسیر اسماء اللہ للزجاج، عارضۃ الاحوذی)

قرآن کریم میں مغفرت اور بخشش کی بے شمار آیات ہیں، غَافِرُ الذَّنبِ گناہوں کو معاف کرنے والا بطور اکرام فرمایا گیا، قَابِلُ التَّوبِ توبہ قبول کرنے والا بطور اکرام کے فرمایا گیا، شَدِیدُ العِقَاب سخت سزا دینے والا بطور عدل کے فرمایا گیا، ذِی الطَّولِ بطور احسان و فضل کے ہے۔

اسی طرح غَافِرُ الذَّنبِ ظالموں کے لیے فرمایا گیا، قَابِلِ التَّوب میانہ رو لوگوں کے لیے ہے جب کہ شدید العقاب کافروں کے لیے فرمایا گیا ہے اور ذی الطول سابقین کے لیے فرمایا گیا ہے۔ بعض مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ الغافر ان لوگوں کے لیے فرمایا ہے جو علم الیقین رکھتے ہیں، غفور ان لوگوں کے لیے فرمایا گیا ہے جن کو عین الیقین حاصل ہے، غفار ان لوگوں کے لیے فرمایا گیا ہے جو حق الیقین رکھتے ہیں۔

بعض حضرات نے غفور اور غفار کے درمیان یہ فرق بیان فرمایا ہے کہ غفور آخرت میں مغفرت فرمائے گا اور سزا سے درگزر کرے گا، غفار وہ ہے جو دنیا میں اپنے بندوں کی پردہ پوشی کرتا ہے اور انہیں رسوا نہیں کرتا، بعض یہ فرماتے ہیں کہ غفار پردہ پوشی میں مبالغہ ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی وہ گناہوں کو ظاہر نہیں کرے گا۔ (شان الدعا ص ۶۵، الاسماء والصفات ج ۱ ص ۱۵۰، تفسیر اسماء اللہ للزجاج)

بندے کو بھی چاہیے کہ وہ اس اسم کی برکت سے مخلوق سے ان باتوں کو پوشیدہ رکھے جو وہ چاہتا ہے کہ اللہ اس سے پوشیدہ رکھے، نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ جس نے کسی مؤمن کی پردہ پوشی کی اللہ تعالیٰ اس کے عیوب کی قیامت کے دن پردہ پوشی فرمائیں گے۔(ابن ماجہ، معجم اوسط طبرانی، الترغیب والترھیب)

اَلْقَهَّارُ: یہ قہر سے ہے، قہر کے معنیٰ زبردست قوت والا، قہر کا معنیٰ ہے چیرگی، قہر کا معنیٰ ہے غلبہ، قہار اسے کہا جاتا ہے جو ہر چیز پر غالب ہو، جس کے سامنے کوئی سر نہیں اٹھا سکتا، تمام مخلوقات اس کے سامنے سرنگوں ہیں، سب اس کی شان، قدرت، طاقت اور اقتدار کامل کے سامنے عاجز اور سرافگندہ ہیں۔

قرآن کریم کی سورہ انعام میں اللہ کے بارے میں ہے کہ وہ ذات اپنے بندوں کے اوپر پورا غالب ہے، قاہر کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، سورہ اعراف میں فرعون کی زبانی بیان کیا گیا کہ ہم بنی اسرائیل پر پورا غلبہ رکھتے ہیں، یہاں قاہرون کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

علامہ منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ کسی انسان کا یہ دعویٰ کہ وہ کسی دوسرے انسان پر یا قوم پر یا ملک پر غلبہ تام رکھتا ہے، اتنا ہی غلط ہے جتنا فرعون کا قول بنی اسرائیل کے مقابلہ میں تھا، ایسا ہی دعویٰ تو ذلت ورسوائی اور ہلاکت وتباہی پیدا کرنے والا ہوتا ہے۔ہاں رب العالمین ہی کو یہ اسم سزاوار ہے جو ہماری روح، ہمارے جسم پر پورا غلبہ رکھتا ہے، ہمارا زمین پر چلنا پھرنا، آسمان کے تلے بے فکر رہنا سہنا محض اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان اشیاء سے ہم کو حق تمتع دیا ہے، ورنہ وہی زمین ہم کو اپنا لقمہ بنا سکتی ہے اور وہی آسمان پرکاہ کی طرح ہم کو جلا سکتا ہے۔(شرح اسماء الحسنیٰ)

مولانا منصوری رحمۃ اللہ علیہ نے قرآن کریم کی وہ آیات اپنی شرح میں نقل فرمائی ہیں جن میں اللہ کا اسم صفاتی القہار اللہ کے اسم الواحد کے ساتھ استعمال ہوا ہے، اس کے بعد متوجہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ غور کرو کہ اسم قہار میں ایک نرالی شان اور جلالی شان ہے، وہ الوہیت ووحدانیت کے سوا اور کسی

اسم کے ساتھ مستعمل نہیں ہوا، یہی اسم ہے جو بتلاتا ہے کہ وجود کو اعیان پر اور واجب الوجود کو امکان پر کس طرح غلبہ کلی حاصل ہے کہ کوئی شے، کوئی امر، کوئی زمان، کوئی مکان اس کے غلبہ سے باہر نہیں، اس اسم سے تعلق پیدا کرنے والوں کو عبادت، اطاعت اور خشیت اللہ تعالیٰ ہی کی کرنی واجب ہے۔

حجۃ الاسلام امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ قہر کا معنیٰ ہے توڑنا، قہار اسے کہا جاتا ہے جو اپنے دشمنوں میں سے جابروں، قاہروں اور ستم گروں کو توڑتا ہے، انہیں موت کے گھاٹ اتارتا ہے، انہیں ذلت کی پستیوں میں پھینکتا ہے، ہر کوئی اس کے قہر اور غلبہ کے نیچے مسخر ہوتا ہے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ للبیضاوی) علامہ ابن القیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندہ اپنے دل سے ایک عظیم رب کی گواہی دیتا ہے کہ وہ قاہر ہے، قادر ہے اور ہر چیز سے بڑا ہے، اپنی ذات اور اپنی صفات اور اپنے افعال میں۔ (شفاء العلیل) طریق الہجرتین میں ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ اپنے بندوں پر غالب ہے، وہ زمین وآسمان کے اوامر کی تدبیر کرتا ہے، پھر یہ امور اسی کی طرف چڑھتے ہیں۔ (طریق الہجرتین)

تحفۃ المودود میں ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بادشاہوں کے لیے قاہر، ظاہر جبار اور متکبر جیسے نام رکھنا جائز نہیں ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض علماء کے نزدیک قہر وصف مخصوص پر قدرت کا نام ہے، قاہر اسے کہیں گے جو کسی کو اس چیز سے روک دے کہ وہ اس کی منشاء اور چاہت کے بغیر کچھ کر سکے۔

یہ بات جان لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان وجوہات کی بناء پر قاہر وغالب ہے، پہلی یہ کہ وہ عدم سے وجود میں لانے پر قاہر اور غالب ہے، دوسری یہ کہ وہ متضاد طبیعتوں کے ملاپ اور آمیزش میں قاہر اور غالب ہے، تیسری یہ کہ وہ لطیف ارواح کو کثیف اجسام میں رکھنے پر قاہر ہے، چوتھی یہ کہ وہ عقلوں کے صمدیت کی حقیقت کو پانے میں قاہر ہے۔ پانچویں یہ کہ وہ قاہر ہے مخلوق پر اپنی مشئیت میں جیسے ارشاد ہے تمہاری چاہت اللہ کی چاہت کے بغیر کچھ نہیں ہے (الانسان ۳۰)

قاہر قرآن کریم میں دو مقامات پر آیا ہے، ایک مقام پر قہار اسم واحد کے ساتھ مل کر استعمال ہوا ہے جو کہ چھ مقامات پر آیا ہے۔(شرح اسماء الحسنیٰ للبیضاوی) بعض مشائخ رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ قاہر اس ذات کو کہتے ہیں جو عبادت گزاروں کے نفوس پر غالب ہوتی ہے کہ انہیں اطاعت پر مر کوز رکھتی ہے، اور قہار وہ ذات ہے جو طلب گاروں کے دلوں پر قاہر اور غالب ہوتی ہے کہ انہیں مشاہدے کا لباس پہناتی ہے۔(شرح اسماء الحسنیٰ)

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندوں میں قہار اسے کہتے ہیں جو اپنے دشمنوں پر غالب آتا ہے، اور اس کا سب سے بڑا دشمن اس کا نفس ہے جو اس کے پہلوؤں کے درمیان ہوتا ہے، نفس شیطان سے بھی بڑا دشمن ہے، جب بھی شہوت غالب آتی ہے تو شیطان غالب آجاتا ہے، شیطان انسان پر غلبہ اس کی شہوات کے واسطے سے حاصل کرتا ہے، عورتیں شیطان کی رسیاں ہیں، جسے عورتوں کی شہوت نہیں وہ ان رسیوں کی شہوت کا تصور بھی نہیں کر سکتا، جب انسان اپنے نفس کی شہوات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو پھر اس کے تمام دشمن اس پر غالب آجاتے ہیں، اس حالت میں اسے کسی دوسرے کا خوف وڈر بالکل نہیں ہوتا، اس لیے کہ اس کے دشمنوں کا انتہائے مقصود اسے ہلاکت وتباہی کی وادی میں اتارنا ہوتا ہے، اگر انسان اپنی زندگی میں شہوات کے ہاتھوں زچ ہو گیا تو گویا وہ موت کی حالت میں زندگی بسر کر رہا ہے۔(شرح اسماء)

عارف باللہ شیخ عبد الکریم قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اہل حق نے قہار کے معنیٰ میں اختلاف کیا ہے کہ کیا یہ صفات ذات میں سے ہے یا صفات فعل میں سے ہے، ایک گروہ کا یہ کہنا ہے کہ یہ صفات ذات میں سے ہے، اس میں قاہر سے زیادہ مبالغہ کا معنیٰ پایا جاتا ہے، ایک گروہ کا کہنا یہ ہے یہ صفات فعل میں سے ہے اور اس کا معنیٰ جبار ہے وہ اپنی مخلوق سے اس معنیٰ کا تقاضا پورا کرتا ہے چاہے وہ چاہیں یا انکار کریں، راضی ہوں یا ناخوش ہوں، اس میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے کہ جو شخص یہ

بات جان گیا کہ وہ ذات قہار ہے تو اچانک ہی وہ نہ چاہتے ہوئے بھی ڈر جائے گا، اور اچانک ہی اس کے قہر کا خیال کرتے ہوئے خوف زدہ ہو جائے گا، یوں وہ اپنے دل سے ڈرنے والا ہو گا، وہ اپنے لوگوں سے ہٹ کٹ کر اپنے رب کی خدمت میں ہمیشہ لگا رہے گا، وہ اپنے ہم نشینوں کی ہم نشینی اور صحبت سے جدا رہ کر اپنے رب کی خدمت میں مشغول رہے گا، کیونکہ اسے بڑا مطلوب و مقصود مل گیا ہے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ للقشیری رحمہ اللہ)

یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ اللہ عابدین کے نفسوں پر، عارفین کے دلوں پر، اور محبین کی روحوں پر قاہر و غالب ہے، عابدین کے نفس اس کی سزا کے خوف سے مغلوب ہوتے ہیں، عارف کا دل اس کے قرب کی سطوت سے مغلوب ہوتا ہے، جب کہ محب کی روح اس کی حقیقت واضح ہونے کے باعث مغلوب ہوتی ہے۔ (ایضاً)

علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ بات جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اپنے تمام بندوں کو موت دینے کا غلبہ رکھتا ہے، جس سے کسی کو چھٹکارہ اور خلاصی نہیں ہے، کوئی بھیجا ہوا نبی، کوئی چنا ہوا فضیلت یافتہ، کوئی مقرب فرشتہ اس سے چھٹکارہ نہیں پا سکتا، اس وقت جب موت آتی ہے تو مخلوق کی صولت و سطوت گھٹ جاتی ہے، مخلوق کی صولت و سطوت بھاگ جاتی ہے، جیسے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ملک الموت کو موت کا ذائقہ چکھائے گا تو اس وقت ملک الموت نزع کے وقت کہے گا تیری عزت کی قسم! اگر مجھے پتا ہوتا کہ موت کا ذائقہ ایسا ہوتا ہے تو میں کسی کی روح قبض نہ کرتا۔

پھر اللہ تعالیٰ بروز محشر فرمائیں گے کہ آج کس کی بادشاہی ہے؟ پھر خود ہی جواب دے گا کہ آج واحد القہار کی بادشاہی ہے، آج جابر بادشاہ کہاں ہیں؟ اکاسرہ کی بادشاہی کہاں ہے؟ انبیاء اور رسل کہاں ہیں؟ مقرب فرشتے اور کراما کاتبین کہاں ہیں؟ آدم اور ان کی اولاد کہاں ہے؟ انکار کرنے والے اور الحاد کرنے والے کہاں ہیں؟ اہل توحید اور زہاد کہاں ہیں؟ روحیں جسموں سے نکل جائیں گی، کوئی

جواب نہیں دے سکے گا، باقی اگر کوئی رہے گا تو لم یزل ولا یزال (ہمیشہ رہنے والا) رہے گا (شرح اسماء الحسنیٰ قشیری رحمہ اللہ)

اَلوَھَّابُ: بہت زیادہ دینے والا، کثیر الہبہ، دائم العطا، ھبہ اس عطیہ کو کہا جاتا ہے جو کسی معاوضے اور کسی غرض کے بغیر کسی کو دیا جائے، کسی سے کوئی امید رکھے بغیر کوئی چیز کسی کو دی جائے۔ الوھاب وھب وھباً مصدر سے ہے، ھبہ اور موھب اسی مصدر سے ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ھبہ کا حصول اللہ کے علاوہ کسی سے ممکن نہیں، اس لیے کہ ھبہ کہتے ہیں بغیر کسی عوض کے کسی کو مالک بنانا، مالک بنانا کسی بندے کی طرف سے اس لیے درست نہیں ہے کہ وہ خود مملوک ہے اور مملوک کسی کو مالک بنانے پر قدرت نہیں رکھتا، اللہ نے قرآن کریم میں ایک مملوک بندے کی مثال بیان فرمائی ہے جو کسی کو کچھ دینے کی قدرت نہیں رکھتا (النحل ۷۵)

اس لیے کہ اللہ کے ارادے کے بغیر کسی سے کوئی ھبہ نہیں مل سکتا، اللہ کا حکم ہوتا ہے تو اس کے دل میں کسی کو کچھ دینے کا خیال پیدا ہوتا ہے، اس کے علاوہ بغیر عوض کے کسی بندے سے کچھ ملنا محال ہے، وہ کسی کو کچھ دے گا تو ثواب کے ارادے سے دے گا، سزا سے بچنے کے لیے کچھ دے گا، جب کہ اللہ انسان کو بغیر کسی غرض کے دیتا ہے، وہ مالک الملک ہے۔

وہاب اسے کہا جاتا ہے جس کی عطائیں اور نوازشات بہت زیادہ ہوں، بندہ اگر کسی کو کچھ دے بھی دے تو سب کچھ نہیں دے سکتا، بندہ کسی بیمار کو شفاء نہیں دے سکتا، کسی بانجھ کو اولاد نہیں دے سکتا، کسی غم کے مارے کو صبر نہیں دے سکتا۔

بعض علماء رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ وھاب میں واھب سے زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے، وھاب اسے کہا جاتا ہے جو بغیر عوض کے دے، ھبہ اس عطیہ کو کہا جاتا ہے جو کسی غرض اور کسی عوض سے خالی ہو، وھاب ایک اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی ذات ہی ہے۔

حضرات مشائخ کرام رحمۃ اللہ علیہم فرماتے ہیں کہ وہاب وہ ذات ہے جو بہت زیادہ عطا وانوال کرتی ہے، کثیر المنن اور کثیر الافضال ہے، کثیر اللطف ہے، کثیر الاقبال ہے، وہ ذات ہے جو مانگے بغیر ہی دیتی ہے، اس کی عطائیں اور نوازشات کسی حال میں بھی بندے سے جدا نہیں ہوتی ہیں۔ بعض حضرات یوں کہتے ہیں کہ وھاب وہ ہے جو تجھے بلاوسیلہ عطا کرے، بلاسبب تجھ پر انعام کرے، بلاحیلہ تجھے عطا کرے، بعض کہتے ہیں کہ وہاب وہ ہے جو بلاعوض عطا کرے اور بغیر کسی غرض کے عطیہ کرے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ جود وعطا حقیقی طور پر اللہ ہی کی طرف سے ہوتی ہے، وہ ہر محتاج وضرورت مند کو اس کی ضرورت کی چیز بلاعوض عطا کرتا ہے، اس کی دنیوی یا اخروی کوئی غرض نہیں رکھتا۔ جو شخص کسی کو کچھ دیتا ہے اور دینے سے اس کی دنیوی یا اخروی غرض وابستہ ہوتی ہے، تعریف، مدح، محبت ومودت، مذمت سے چھٹکارے کا حصول، شہرت وناموری مقصود ہو تو اسے معتاض کہا جاتا ہے نہ کہ وھاب اور جواد، اس لیے یہ بات ذہن نشین رہنا چاہیے کہ دینے والے کی کوئی بھی غرض ہو تو اس کو ھبہ نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ عوض ہے، جواد اس ذات کو کہا جاتا ہے جو فیض اٹھانے والے پر فیض کسی ایسی غرض کے بغیر لٹائے جو اس کی طرف لوٹے (مقصد الاسنیٰ)

کسی بندے سے جود اور ہبہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا، اس لیے کہ بندہ جو کچھ دے گا وہ کسی نہ کسی غرض سے دے گا، جو کسی دنیوی یا اخروی غرض کو مد نظر رکھے بغیر سب کچھ اللہ کے لیے لٹادے وہ اس بات کا مستحق ہے کہ اسے وھاب اور جواد کہا جائے، اس کے علاوہ کوئی جنت کے حصول کے لیے، کوئی اچھا نام باقی رکھنے کے لیے ایسا کرے گا تو وہ ان صفات والا نہیں ہو گا، حقیقی وہاب ایک اللہ ہی کی ذات۔

اَلرَّزَاقُ، اَلرَّازِقُ: بہت زیادہ رزق دینے والا، کھانے پینے، پہننے کی چیزوں کو رزق کہا جاتا ہے، یہ چیزیں حلال ہوں یا حرام ہوں، ہاں معتزلہ کے نزدیک صرف حلال چیزیں ہی رزق کہلاتی ہیں، قرآن

کریم کی سورۃ ھود ۶ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو دابہ بھی زمین میں ہیں ان کے رزق کی ذمہ داری اللہ کی ہے، یہاں رزق کی دلالت پہلے معنیٰ پر ہے، جب کہ ساری زندگی حرام کھانے والے شخص نے جو کچھ کھایا اسے رزق اللہ نہیں کہیں گے بلکہ یہ بالاتفاق باطل ہے۔ (شرح اسماء بیضاوی)

وہ اپنے تمام بندوں کو چاہے وہ مومن ہوں یا کافر، مطیع ہوں یا نافرمان، نیکوکار ہوں یا گناہ گار، کمزور ہوں یا طاقتور سب کو رزق دیتا ہے۔ زمین میں چلنے والی جو بھی چیز ہے اس کا رزق اللہ ہی کے ذمے ہے۔ اس کی طرف سے بندوں کو ملنے والے رزق کی دو قسمیں ہیں۔ رزق عام: اس میں نیک و بد، پہلے اور پچھلے سب شریک ہیں۔ یہ ابدان کا رزق ہے۔ رزق خاص: یہ دلوں کا رزق ہے اور دلوں کو غذا علم اور ایمان سے ملتی ہے۔ رزق حلال وہ ہوتا ہے جو دین کی درستی کے لیے ممد و معاون ثابت ہو۔ یہ مومنوں کے لیے مخصوص ہے۔ تاہم یہ انھیں اپنے اپنے مرتبے کے مطابق (کم و بیش) ملتا ہے جیسے بھی رب کی حکمت و رحمت کا تقاضا ہوتا ہے۔

علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ رزق کی دو قسمیں ہیں ایک رزق ظاہری اور ایک رزق باطنی، رزق ظاہری جیسے بدنوں کے لیے کھانے، باطنی جیسے معارف وغیرہ یہ دلوں کے کھانے ہیں، دونوں رزقوں میں بہترین اور اشرف یہی رزق ہے، اس رزق کا نتیجہ ہمیشہ کی زندگی ہے اور دوسرے رزق کا نتیجہ جسم کی قوت ہے ایک مدت تک، دونوں قسم کے رزقوں کا متولی اللہ تعالیٰ ہے وہ جس کے لیے چاہتا ہے فراخ کر دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگ کر دیتا ہے۔ (الرعد ۲۶)

قرآن کریم کی سورۃ الذاریات ۵۸ میں ایک بار اسم الرزاق آیا ہے، جب کہ پانچ بار خَيْرُ الرَّازِقِينَ آیا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام دعا کیا کرتے تھے جس میں عرض کرتے يَارَازِقَ البغاث فِي عُشِّهِ اے کوے کے بچے کو اس کے گھونسلے میں رزق دینے والے۔

علامہ منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بعض اوقات ماں باپ، حاکم، محسن، بادشاہ کو یہ گمان

ہو جایا کرتا ہے کہ وہ کسی بچہ یا شخص کو رزق دیا کرتا ہیں، اگر ان کو عارضی طور پر ان کے دعویٰ میں سچا سمجھ لیا جاوے تب بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رزق رسانی بدرجہ اتم واکمل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق کو دیکھو! کوئی روٹی کا بھوکا ہے، کوئی گوشت کا، کوئی گھاس کا، کوئی ذوق وشوق کا، کوئی محبت کا کوئی ذکر کا، ہر ایک کو رزق پہنچانا اسی رزاق مطلق کا کام ہے۔

ایک غذا کے اندر معدہ، اعصاب، شرائین، جگر، طحال، قلب ودماغ کے پرورش کرنے والے الگ الگ اجزا ہیں اور ہر ایک عضو اپنی اپنی غذا کو چوس لیتا ہے اور دوسرے عضو کا حصہ اس کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔ ایک ہی جسم کے اندر رزق کی ایسی تقسیم رزاق مطلق کے سوا اور کون کر سکتا ہے، اس اسم سے تعلق پیدا کرنے والے کو لازم ہے کہ بھوکوں کو روٹی کھلایا کرے اور رمضان شریف میں روزے کھلوایا کرے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ)

اس اسم مبارک سے جو بندہ بھی حظ اٹھانا چاہتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس وصف کی حقیقت جانے اور تقسیم کرنے والے کی تقسیم پر تمام دنوں میں راضی رہے، اس لیے کہ وہی ذات ہے جس کی طرف سے رزق کا انتظار کیا جاسکتا ہے، وہی ذات ہے جس پر بھروسہ کیا جاسکتا ہے (شرح اسماء الحسنیٰ للبیضاوی)

حضرت حاتم بن عنوان جو اصم رحمۃ اللہ علیہ کے نام سے معروف تھے، بڑے زاہد اور متقی انسان تھے، اہل بلخ میں سے تھے، بغداد تشریف لے گئے جہاں امام احمد بن حنبل کی خدمت میں حاضری دی، وہاں ان پر بعض حالات کھلے، انہیں اس امت کا لقمان کہا جاتا ہے، حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کہاں سے کھاتے ہیں؟ میں نے کہا کہ اللہ کے خزانوں سے کھاتا ہوں، ان سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کو روٹی آسمان کی طرف سے ملتی ہے؟ تو میں نے کہا کہ اگر زمین نہ ہوتی تو آسمان کی طرف سے ملتی، اس شخص نے پوچھا کہ یہ باتیں جو تم لوگ کرتے ہو یہ کہاں سے آتی ہیں؟ تو حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ نے کہا

چونکہ باتیں صرف آسمان کی طرف سے آتی ہیں اس لیے یہ باتیں کرتے ہیں، اس شخص نے کہا کہ میں بحث میں آپ سے زیادہ مضبوط نہیں ہوں، تو حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا یہ اس لیے کہ باطل حق سے زیادہ مضبوط نہیں ہوتا۔ (منقول از شرح اسماء الحسنیٰ للبیضاوی)

علامہ قشیری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شرح اسماء الحسنیٰ میں فرمایا کہ کسی سے پوچھا گیا کہ تم کہاں سے کھاتے ہو؟ اس نے جواب دیا اس بادشاہ کے خزانے سے کھاتا ہوں جسے چور نہیں پڑتے اور جس کو دیمک نہیں چاٹتی۔ (شرح اسماء للقشیری رحمہ اللہ)

حضرت حاتم اصم رحمہ اللہ اپنی بیوی کے پاس تشریف لائے تو اسے کہنے لگے کہ میں سفر پر جارہا ہوں تم اپنی ضرورت کا خرچ مجھے بتاؤ تاکہ میں وہ تیرے حوالے کروں؟ بیوی نے کہا کہ جتنی زندگی باقی ہے اتنا خرچ دے دیں، حاتم اصم نے فرمایا مجھے کیا معلوم کہ آپ نے کتنا زندہ رہنا ہے، چنانچہ جب حاتم اصم سفر پر نکلے تو عورتیں حاتم اصم کی بیوی کے پاس آئیں، وہ اس کی شان و شوکت کا اظہار چاہتی تھیں جب کہ اس کے خاوند نے کوئی خرچ گھر میں نہیں چھوڑا تھا، یہ عورت کہنے لگی کہ میرا خاوند تو صرف رزق کو تولنے والا ہے وہ رزق دینے والا نہیں ہے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ للقشیری)

جس شخص کو اس وصف کی حقیقت معلوم ہوگئی تو وہ اپنی زبان اور ہاتھ سے ان لوگوں تک رزق پہنچانے کا ذریعہ بن جائے گا جن کو اس کی ضرورت ہے، حدیث شریف میں آتا ہے بندوں کے ہاتھ اللہ کے خزانے ہیں۔ (شرح اسماء الحسنیٰ بیضاوی)

وہ شخص خوش نصیب ہے جو اس وصف سے متاثر ہو کر راہنمائی کرنے والا علم، راہنمائی کرنے والی زبان، صدقہ کرنے والا اور خرچ کرنے والا ہاتھ رکھتا ہو، جو انسانی دلوں تک اپنے قول و عمل کے ذریعے رزق پہنچاتا ہے، جو انسانی بدنوں تک اپنے افعال و اعمال کے ذریعے رزق پہنچاتا ہے، جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو محبوب بنالیتے ہیں تو اپنی مخلوق کی حاجتیں اس سے وابستہ کر دیتے ہیں، جب تک وہ

اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان رزق پہنچانے میں لگا رہتا ہے تب تک وہ اس صفت سے وافر حصہ حاصل کرتا رہتا ہے۔

نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ امانت دار خازن (خزانچی) وہ شخص ہے جو اس چیز میں سے دیتا ہے جس کا اسے حکم دیا گیا ہے، وہ اپنے نفس کی خوشی سے صدقہ کرنے والوں میں سے ایک ہوتا ہے اور بندگان خدا کے ہاتھ رب کے خزانے ہوتے ہیں، اگرچہ یہ آخری بات نقل کرنے کے بعد علامہ بیضاوی اپنی کتاب شرح اسماء اللہ الحسنیٰ کے حاشیہ میں لکھتے ہیں کہ اس روایت کی کوئی اصل نہیں ہے، مگر جب رب تعالیٰ نے اپنے کو خیر الرازقین فرمایا تو اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ بندگان خدا جو اس طرح مخلوق تک رزق پہنچاتے ہیں وہ رب العالمین کو راضی کرتے ہیں۔

اَلْفَتَّاحُ: فیصلہ کرنے والا، کھولنے والا، وہ شرعی احکام کے ذریعے سے، تقدیر کے فیصلوں کے ذریعے اور جزا اور سزا کے ذریعے سے اپنے بندوں کے درمیان فیصلے کرتا ہے، وہ اپنے لطف و کرم سے سچے لوگوں کی چشم بصیرت کو کھول دیتا ہے، ان کے دل اپنی معرفت، محبت اور اپنی طرف جھکاؤ کے لیے کھول دیتا ہے، اپنے بندوں کے لیے رحمت کے اور طرح طرح کے رزق کے دروازے کھول دیتا ہے، انھیں وہ اسباب مہیا فرماتا ہے جن سے انہیں دنیا اور آخرت کی بھلائی نصیب ہو جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: **مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا وَمَا يُمْسِكْ فَلَا مُرْسِلَ لَهٗ مِنْۢ بَعْدِهٖ** (فاطر:۲) اللہ لوگوں کے لیے جو رحمت کھولتا ہے اسے کوئی روک نہیں سکتا اور جسے روک لے اس کے بعد اس (رحمت) کو کوئی نہیں بھیج سکتا۔"

فتح، مفتاح، افتتاح مشہور الفاظ اسی نام سے ہیں، فتح کا معنیٰ کامیابی بھی ہوتا ہے، فتاح اللہ کی صفت حاکم کے معنیٰ کا بھی احتمال رکھتی ہے، یہی وہ ذات ہے جسے فتاح کہا جاتا ہے جو دو دشمنوں، دو مخالفوں کے درمیان پیچیدگیوں کو کھولتا ہے، حق کو واضح کر دیتا ہے اور نتار دیتا ہے۔ مددگار کے معنیٰ کا بھی اس

میں احتمال پایا جاتا ہے، وہی ہے جو اپنے بندوں پر خیر کے دروازے کھول دیتا ہے اور ان کے دین و دنیا کے مشکل کاموں کو آسان کر دیتا ہے، اسی کی عنایت اور اسی کی مہربانی سے ہر مشکل کھل جاتی ہے، اسی کی راہنمائی سے ہر پیچیدگی دور ہو جاتی ہے، وہ اپنے نبیوں کے لیے ملکوں کے دروازے کھول دیتا ہے اور ان کے دشمنوں کے ہاتھوں سے ان کو نکال دیتا ہے، وہ اپنے ولیوں کے دلوں سے پردے اٹھا دیتا ہے، وہ ان کے لیے اپنے آسمانوں کے دروازے کھول دیتا ہے، اسی لیے تو فرمایا

مَا يَفْتَحِ اللّٰهُ لِلنَّاسِ مِنْ رَّحْمَةٍ فَلَا مُمْسِكَ لَهَا (فاطر ۲) یہ بھی کہا گیا ہے کہ فتاح وہ ہے جس کے ہاتھ میں غیب کی چابیاں ہیں، اور رزق کی کنجیاں ہیں۔ مشائخ کرام فرماتے ہیں کہ فتاح وہ ذات ہے جو دلوں پر توفیق کے دروازے کھول دیتی ہے، بعض یہ فرماتے ہیں کہ فتاح وہ ہے جس کا فیصلہ حتمی اور یقینی ہوتا ہے، جس کے فیصلے میں پختگی ہوتی ہے۔ علامہ بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس اسم کے ساتھ تعلق کا طریقہ یہ ہے کہ حاجت مندوں کی مدد کی جائے، ضرورت مندوں کی ضروریات کو پورا کرنے لیے ہمدردی کے ساتھ اعانت میں حصہ لیا جائے۔

اَلعَلِیمُ: بہت زیادہ جاننے والا، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا یہ اسم مبارک ایک سو ترپن مرتبہ آیا ہے، اسی نام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اسم مبارک حکیم چھتیس مرتبہ آیا ہے، یہی نام مبارک سمیع کے ساتھ اکتیس بار آیا ہے، یہی نام مبارک واسع کے ساتھ سات مقامات پر آیا ہے، یہی نام مبارک عزیز کے ساتھ چھ مقامات پر آیا ہے، خبیر اور قدیر کے ساتھ چار مقامات پر آیا ہے، حلیم اور خلاق کے ساتھ دو مقامات پر آیا ہے، اسی طرح یہ نام مبارک شاکر، فتاح اور حفیظ کے ساتھ ملا کر استعمال کیا گیا ہے۔

اللہ عالم بھی ہے علیم بھی ہے، وہ ہر چیز کو جانتا ہے، وہ اپنے کمال علم سے ہر اس چیز کو جانتا ہے جو مخلوق کے سامنے ہوتی ہے یا اس کے پیچھے، کائنات ارضی کے درختوں پر موجود پتوں کو جانتا ہے، ٹہنیوں سے جدا کر ہو کر بکھر جانے والے پتوں کو بھی جانتا ہے، کائنات کا کوئی ذرہ حرکت کرتا ہے تو

اس کے علم میں ہوتا ہے، بلکہ اس کی اجازت کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، وہ دلوں کے اوپر سے گزرنے والے وساوس اور خیالات تک کو جانتا ہے، کوئی فرشتہ تک ان خیالات سے آگاہ نہیں ہوتا، اللہ کا علم اس درجہ کمال کا علم ہے کہ ابھی دل پر خیالات آتے بھی نہیں تو اسے پتا ہوتا ہے کہ اب اس دل پر کون سے خیالات گزریں گے۔ رحمت دو عالم ﷺ سے لوگوں کے دلوں میں چھپائے جانے والے خیالات کے بارے میں پوچھا گیا کہ کیا انہیں اللہ جانتا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں اللہ ان خیالات کو جانتا ہے۔ (اعلام الموقعین بحوالہ مسلم)

سورۃ الطلاق میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اللہ وہ ذات ہے جس نے سات آسمانوں اور سات زمینوں کو پیدا فرمایا، ان کے درمیان اللہ اپنا امر اتارتا ہے، تاکہ تمہیں معلوم ہو جائے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور تمہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اللہ نے علم کے لحاظ سے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ (آیت ۱۲) علامہ ابن قیم جوزی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسا علیم ہے جو ہر علیم کو پسند کرتا ہے، اور وہ اپنا علم اسے دیتا ہے جسے وہ پسند کرتا ہے (مفتاح دارالسعادہ)

اللہ تعالیٰ وہ عظیم ذات ہے جس نے انسان کو تعلیم دے کر اس پر احسان عظیم فرمایا ہے، انسان کو اس نے وہ کچھ سکھایا ہے جو وہ نہیں جانتا تھا، سورہ علق میں اللہ تعالیٰ نے علم کی فضیلت بیان فرمائی ہے، انسان کو علم دینے کی بدولت اس کی برتری کا ذکر فرمایا ہے، یہ بات تعلیمی شرف اور علم کی فضیلت پر دلالت کرتی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے، وہ اس بات کو بھی جانتا ہے کہ پیغام رسالت پہنچانے کی ذمہ داری کس کے سپرد کی جائے، قرآن کریم میں پندرہ مقامات ایسے ہیں جہاں اعلم کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کا معنیٰ ہے بہت زیادہ جاننے والا، عالم الغیب کا لفظ قرآن میں ہے جس کا معنیٰ ہے پوشیدہ چیزوں کو جاننے والا، قرآن میں علام الغیوب بھی آیا ہے کہ پوشیدہ چیزوں کو بہت زیادہ جانتا ہے، وہ دلوں کے بھیدوں

کو جانتا ہے، وہ انسانی کارکردگیوں سے بھی خوب واقف ہے، وہ ہر چیز کو خوب جانتا ہے۔

انسان جو کچھ پوشیدہ رکھتا ہے جو کچھ ظاہر کرتا ہے اس اسے بھی جانتا ہے، وہ آسمانوں کی پوشیدہ چیزوں کو جانتا ہے، کل کلاں کوئی کیا کرے گا وہ اسے بھی جانتا ہے، زمین میں جانے والی چیزوں کو وہ جانتا ہے، زمینوں سے کیا نکل رہا ہے، کیا نکلے گا اور کیا نہیں نکلے گا وہ سب کو خوب جانتا ہے، آنکھوں کی خیانت کو وہ جانتا ہے، شکم مادہ میں کیا ہے وہ اسے بھی جانتا ہے، وہ ایسا علیم ہے جو ذرہ برابر وزن، اس سے بڑی یا اس سے چھوٹی چیز جو آسمانوں میں ہے یا زمینوں میں ہے وہ سب کو جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا وسیع ہے کہ وہ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے، اس کا علم وسیع ہے، زمین مردہ اجسام میں جو کمی کرتی ہے اللہ کے علم میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں فرمایا کہ وہ صاحب علم تھا، کیونکہ ہم نے اس کو سکھایا تھا۔ اللہ تعالیٰ پہلوں کو جانتا ہے اور بعد والوں کو بھی جانتا ہے، کوئی اس کے علم سے پوشیدہ اور مخفی نہیں ہے۔

اَلْقَابِضُ، اَلْبَاسِطُ: محدود کرنے والا، وسیع کرنے والا، وہ رزق کو تنگ کرتا ہے، روحوں کو قبض کرتا ہے، رزق کو وسیع کرتا ہے، دلوں کو کھولتا ہے اور یہ سب کچھ اس کی رحمت اور حکمت کے تحت ہے۔

اَلْخَافِضُ: جھکانے والا، اللہ کا یہ اسم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ کافروں کو ان کی بدبختی کی بدولت نیچا دکھاتا ہے، اپنے دشمنوں کو جھکاتا ہے، ان کو اس قدر جھکاتا اور گراتا ہے کہ انہیں اسفل السافلین سے بھی نیچے کر دیتا ہے، اور یہ کام اللہ ہی کر سکتا ہے کوئی اور نہیں کر سکتا، اسی لیے اسے خافض کہتے ہیں۔

اَلرَّافِعُ: اٹھانے والا، یہ اللہ تعالیٰ کا ایسا نام ہے جس کا تقاضا ہے کہ وہ ایمان والوں کو ان کی نیک بختی کی بدولت اٹھاتا ہے، بلندی عطا کرتا ہے، وہ اپنے دوستوں کو بلندی عطا کرتا ہے، انہیں اپنے قریب لاتا ہے، اپنے دوستوں کو وہ اس قدر بلند کرتا ہے کہ ملائکہ مقربین کے درجہ تک پہنچا دیتا ہے۔

جو بندہ چاہتا ہے کہ اللہ کے اسم الرافع سے حظ وافر حاصل کرے تو اسے چاہیے کہ وہ حق کی سربلندی کے لیے اٹھ کھڑا ہو، وہ باطل کو جھکانے کی کاوش کرے، رب تعالیٰ اِحقاق حق اور اِبطال

باطل کرنے والوں کی مدد کرتا ہے، جو شخص اللہ کے دشمنوں کو پست وذلیل کرنے کے لیے اٹھ کھڑا ہوتا ہے اللہ اس سے خوش ہوتا ہے، وہ اپنے دوستوں کو بلند کرتا ہے۔

قرآن کریم میں لفظی اعتبار سے کسی جگہ الرافع اور الخافض نام استعمال نہیں ہوا ہے، البتہ معنوی اعتبار سے بہت سی آیات سے یہ مفہوم ملتا ہے کہ رب ہی بلندی عطا کرتا ہے اور وہی رب پستی عطا کرتا ہے۔

اَلْمُعِزُّ: عزت دینے والا، قرآن کریم میں کہیں بھی معز بطور نام استعمال نہیں ہوا ہے، ہاں قرآن کریم کی سورۃ آل عمران میں تُعِزُّ مَن تَشَآءُ سے یہ نام مستخرج سمجھا جاتا ہے، عزت دینے والا اللہ ہی ہے، وہ جسے چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے۔

اَلْمُذِلُّ: ذلیل کرنے والا، یہ نام بھی قرآن کریم میں بطور نام نہیں آیا، ہاں اسی سورۃ آل عمران کی آیت جس میں تُذِلُّ مَن تَشَآءُ آیا ہے اس سے مستخرج ہے، کوئی کسی کو ذلیل نہیں کر سکتا، اللہ ہی وہ ذات ہے جو جس کو چاہے ذلیل کر سکتا ہے۔

اَلسَّمِیعُ: بہت زیادہ سننے والا، اللہ ہی جو تمام مسموعات کو سنتا ہے، اللہ ہی جو تمام آوازوں کو سنتا ہے، وہی ہے جو تمام اقوال، تمام الفاظ، تمام کلمات، تمام عبادات کو سنتا ہے، اللہ انتہائی آہستہ آوازوں کو سنتا ہے، اللہ سرگوشیوں کو سنتا ہے، اللہ اشاروں کی زبان کو سنتا ہے، وہ آہستہ اور اونچی آواز میں مانگی جانے والی دعاؤں کو سنتا ہے، وہ خوب سنتا ہے، خوب علم رکھتا ہے، قرآن کریم میں کہیں اسے سمیع علیم کہا گیا ہے، کہیں السمیع علیم کہا گیا ہے، وہ سمیع بھی ہے اور علیم بھی ہے، وہ بصیر بھی ہے۔ سنتا بندہ بھی ہے مگر اس کے سننے کو اللہ کے سننے سے کوئی نسبت نہیں ہے، اللہ چرند، پرند، وحوش ودرندوں کی آوازیں سنتا ہے، یہاں تک کہ رات کی تاریکی میں کالے پتھر پر چلنے والی چیونٹی کے رینگنے کی آواز بھی اللہ سنتا ہے۔ اللہ پتوں کی سرسراہٹ، سمندر اور دریاؤں کے پانی کا شور بھی سنتا ہے، ہواؤں کے جھونکوں میں کس قدر آواز ہے وہ اسے بھی سنتا ہے۔

اہل علم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی سماعت کی دو قسمیں ہیں، پہلی قسم: اللہ تعالیٰ کا تمام ظاہر و باطنی اور پوشیدہ و علانیہ آوازوں کو سننا اور ان کا مکمل احاطہ کرنا، دوسری قسم: اللہ تعالیٰ کا سوال کرنے والوں، دعا کرنے والوں اور عبادت گزاروں کی دعائیں سننا، انہیں قبول کرنا اور انہیں اجر و ثواب دینا، اسی قبیل سے اللہ کا فرمان ہے ان ربی لسمیع الدعاء (ابراہیم ۳۹) 'کچھ شک نہیں کہ میرا پالنہار اللہ دعاؤں کا سننے والا ہے۔ اسی طرح نمازی کی یہ دعا بھی سَمِعَ اللّٰهُ لِمَن حَمِدَهُ اللہ نے سنا جس نے اس کی حمد و ثناء کی، یعنی قبول فرمالیا۔ (شرح اسماء الحسنیٰ مؤلفہ ڈاکٹر سعید بن علی قحطانی)

اَلبَصِیرُ: بہت زیادہ دیکھنے والا، جو ہر چھوٹی سے چھوٹی اور باریک سے باریک چیز کو دیکھتا ہے، وہ تاریک رات میں ٹھوس چٹان پر چلتی ہوئی سیاہ چیونٹی کو بھی دیکھتا ہے، وہ سات زمینوں کے نیچے کی چیزوں کو بھی اسی طرح دیکھتا ہے جس طرح سات آسمانوں کے اوپر کی چیز کو نیز وہ یہ بھی سنتا اور دیکھتا ہے کہ کون اس کی حکمت کے مطابق جزا کا مستحق ہے، یہ آخری معنی صفت حکمت ہی کا ایک پہلو اجاگر کرتا ہے۔

اَلحَکَمُ: فیصلہ کرنے والا، قرآن کریم کی سورۃ الاعراف میں مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے جس کا معنیٰ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے درمیان فیصلہ کردے، اور وہی خَیرُ الحَاکِمِینَ (بہترین فیصلہ کرنے والا) ہے۔

حضرت نبی کریم ﷺ نے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الحَکَمُ وَاِلَیهِ الحُکمُ (ابوداؤد) اللہ تعالیٰ ہی فیصلہ کرنے والا ہے اور فیصلہ کا مرجع وہی ہے۔ سورۃ الانعام کی آیت ۱۱۴ میں ہے کہ کیا اللہ کے سوا کسی اور کو فیصلہ کرنے والا تلاش کروں، حالانکہ وہ ایسا ہے کہ اس نے ایک کتاب کامل تمہارے پاس بھیج دی ہے، اس کے مضامین خوب صاف صاف بیان کیے گئے ہیں اور جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس بات کو یقین کے ساتھ جانتے ہیں کہ یہ آپ کے رب کی طرف سے حق کے ساتھ بھیجی گئی ہے، سو آپ شبہ کرنے والوں میں سے نہ ہوں۔

اللہ تعالیٰ ہی اپنے بندوں کے درمیان دنیا میں اپنے عدل و انصاف سے فیصلہ فرماتا ہے اور آخرت میں بھی فرمائے گا، چنانچہ وہ ایک ذرہ بھی ظلم نہیں کرتا ہے نہ کرے گا نہ کسی پر کسی دوسرے کا بوجھ

ڈالے گا، نہ ہی بندے کو اس کے گناہ سے زیادہ سزا دے گا، حق داروں کو ان کا حق ادا کر دے گا، کسی حق دار کو حق پہنچائے بغیر نہیں چھوڑے گا، وہ اپنی تدبیر وانتظام اور تقدیر ونوشت میں سراپا عدل ہے، اللہ سبحانہ کی ذات اپنے فعل میں بھی عدل کی صفت سے متصف ہے، اس کے سارے افعال عدل واستقامت کی سنتوں پر جاری ہیں، ان میں سرے سے کسی ظلم وزیادتی کا شائبہ تک نہیں ہے بلکہ تمام افعال اللہ کے فضل ورحمت اور عدل وحکمت کے درمیان ہیں۔

اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ گناہ گاروں اور جھٹلانے والوں پر دنیا میں جو مختلف قسم کی ہلاکت ورسوائی اتارتا ہے اور آخرت میں ان کے لیے جو رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے وہ دراصل اللہ تعالیٰ کا وہ کام ہے جس کے مستحق ہیں کیونکہ وہ گناہ کے بغیر کسی کو نہیں پکڑتا، نہ ہی حجت قائم کیے بغیر کسی کو عذاب دیتا ہے اور اس کے تمام اقوال وفرمودات بھی سراپا عدل ہیں، چنانچہ وہ بندوں کو اسی بات کا حکم دیتا ہے جس میں خالص مصلحت ہو یا جس میں مصلحت غالب ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ کا فیصلہ کے دن اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرنا اور ان کے اعمال تولنا بھی عدل وانصاف ہے، اس میں کوئی ظلم وجور نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنے وصف فعل، قول اور فیصلہ میں عدل وانصاف سے فیصلہ کرنے والا ہے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ قحطانی)

اَلعَدلُ: انصاف کرنے والا، وہ دنیا اور آخرت میں عدل و انصاف کے ساتھ بندوں کے فیصلے کرتا ہے۔ وہ کسی پر ذرہ برابر بھی ظلم نہیں کرتا، نہ کسی پر کسی اور کا بوجھ لادتا ہے، نہ بندے کو اس کے گناہوں سے زیادہ سزا دیتا ہے۔ وہ ہر حق دار کو اس کا حق پہنچاتا ہے چنانچہ وہ تدبیر میں بھی اور تقدیر میں بھی (العدل) انصاف کرنے والا ہے۔ {اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ} (ھود: ۵۶) میرا رب سیدھی راہ پر قائم ہے۔

اَللَّطِیفُ: باریکی سے دیکھنے والا، باریک بین، مہربانی کرنے والا، اس کا علم تمام خفیہ معاملات اور اسرار کو محیط ہے۔ وہ پوشیدہ اشیاء، ہر کسی کے باطن اور باریک معاملات سے باخبر ہے۔ علاوہ ازیں وہ

اپنے مومن بندوں پر لطف و کرم کرنے والا ہے۔ اس لطف واحسان کی وجہ سے وہ ان تک ان کے فائدے کی اشیاء اس انداز سے پہنچا دیتا ہے کہ انہیں معلوم بھی نہیں ہوتا۔ گویا اللہ کا یہ نام مبارک (الخبیر) کا معنی بھی رکھتا ہے اور (الرؤوف) کا معنی بھی۔

اَلْخَبِیْرُ: بہت زیادہ خبر رکھنے والا، جس کا علم ظاہر اور باطن کو محیط ہے۔ وہ چھپائی ہوئی باتیں بھی جانتا ہے اور ظاہر کی ہوئی بھی، واجبات سے بھی باخبر ہے اور ممکنات و محالات سے بھی، وہ ماضی سے بھی واقف ہے، حال سے بھی اور مستقبل سے بھی چنانچہ اس سے کچھ بھی مخفی نہیں۔

اَلْحَلِیْمُ: بہت زیادہ بردبار، جو اپنی مخلوقات پر ظاہری اور باطنی نعمتیں نازل فرماتا رہتا ہے حالاں کہ وہ گناہ اور بے شمار لغزشوں کا ارتکاب بھی کرتے ہیں۔ وہ نافرمانوں کو فوری سزا دینے کے لیے بردباری کرتے ہوئے انھیں موقع دیتا ہے کہ توبہ کرلیں اور انھیں مہلت دیتا ہے کہ اس کی طرف رجوع کرلیں۔

اَلْعَظِیْمُ: بہت عظمت والا، اہل دنیا کی زبان میں لفظ عظمت کا اطلاق طول، عرض و عمق پر ہوتا ہے اور جب ابعاد ثلٰثہ میں ایک شے کی بڑائی دوسری پر بیان کرنی ہو تب لفظ عظمت کا استعمال کیا جاتا ہے، سورۃ نمل میں ملکہ سبا بلقیس کے تخت کو عرش عظیم کہا گیا ہے جو لمبائی، چوڑائی، اونچائی میں بہت بڑا تھا، سورۃ شعراء میں سمندری پانی کے ہر ایک ٹکڑے کو بڑے پہاڑ جیسا بتایا گیا ہے، وہاں بھی کالطود العظیم استعمال ہوا ہے۔ قرآن کریم کے مختلف مقامات اور سورتوں میں اللہ کے لیے رب العرش العظیم فرمایا گیا ہے، اللہ کو فضل عظیم کا مالک فرمایا گیا ہے۔ سورۃ الاعلیٰ میں ربک العظیم فرمایا گیا ہے، نماز میں مسلمان سبحان ربی العظیم پڑھتا ہے، ازروئے حدیث شریف جس نے رکوع میں تین بار یہ پڑھا اس کا رکوع مکمل ہو جاتا ہے۔

اَلْغَفُوْرُ: بہت زیادہ معاف کرنے والا، بہت زیادہ بخشنے والا، اللہ تعالیٰ جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اسے معاف کر دیتا ہے، غفور اور غفار دونوں نام غفر ان سے بطور مبالغہ استعمال ہوتے ہیں، غفور کے معنیٰ میں مغفرت کا زائد از مقدار ہونا واضح ہوتا ہے، یعنی غفور وہ ہے جس کی عطا و بخشائش لا انتہاء

ہے۔(شرح اسماء الحسنیٰ)

غافر وہ ہے جو بروز محشر گناہوں پر پردہ ڈال دے گا اور غفار وہ ہے جو بندوں کے گناہوں کو ملائکہ کی بھی آنکھوں سے چھپادے اور غفور وہ ہے جو بندوں کے دل سے بھی گناہوں کی یاد اور ان کا الم اور احساس وانفعال کھودے۔(شرح اسماء الحسنیٰ)

قرآن کریم میں اسم غفور اسم رحیم کے ساتھ پچھتر بار، اسم عزیز کے ساتھ دوبار، اسم عفو کے ساتھ پانچ بار، اسم شکور کے ساتھ دوبار، اسم حلیم کے ساتھ ایک بار، اسم ودود کے ساتھ ایک بار، صفت ذوالرحمۃ کے ساتھ ایک بار، مفرد غفور پانچ بار، کل تعداد بانوے ہے۔

علامہ منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس اسم سے تخلق حاصل کرنے والے کو لازم ہے کہ اپنے بے شمار گناہوں کا تصور کرے اور پھر اللہ تعالیٰ کی مغفرت پر جو مقدار و تعداد اور اندازہ و شمار سے بڑھ کر ہے، یقین رکھے اور جان لے کہ غفران الٰہی سب کو مٹادینے والا، پردہ ڈال دینے والا، دھو دینے والا ہے۔ بندہ کا جتنا زیادہ مضبوط یقین غفران ربانی پر ہو گا، اسی قدر زیادہ وہ غفران سے بہرہ یاب ہو گا، یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ یہ اسم ارتکاب گناہان کے لیے جرات آموز مستقبل نہیں بلکہ آئندہ کے لیے شرم دلانے والا اور ماضی کو مزکی کر دینے والا ہے۔(شرح اسماء الحسنیٰ)

الشکور: بہت زیادہ قدردان، جو تھوڑے سے عمل کی قدر کرتے ہوئے اسے بھی شرف قبولیت سے نوازتا ہے اور بے شمار لغزشوں کو معاف کر دیتا ہے اور اہل اخلاص کے اعمال کا ثواب بے حساب بڑھا دیتا ہے۔ جو شکر کرنے والوں کی قدر کرتا ہے اور ذکر کرنے والوں کو یاد فرماتا ہے۔ بندہ کوئی نیکی کر کے اس کا جس قدر تقرب حاصل کرنا چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ اس سے زیادہ قرب عطا فرماتا ہے۔

اَلعَلِیُّ: بہت بلند، سب سے بلند، اسے ہر لحاظ سے مطلق بلندی حاصل ہے، ذاتی طور پر بھی علو اور صفات اور قدر و منزلت کا علو، غلبہ و اقتدار کا علو، وہی عرش پر مستوی ہے اور اقتدار کا مالک ہے۔ وہ عظمت، کبریائی، جلال اور کمال کی تمام تر صفات سے بہرہ ور ہے جن کے آگے کمال کا کوئی درجہ نہیں۔

اَلْکَبِیْرُ: بہت ہی بڑا، اللہ تعالیٰ کبیر ہے اور جملہ موجودات زمانی و غیر زمانی پر اسے سبقت حاصل ہے، اللہ تعالیٰ کبیر ہے اور اس کی کبریائی کے سامنے ہر ایک اکبر الکبیر ادنیٰ ترین صغیر ہے، اللہ تعالیٰ کبیر ہے وہ کامل الصفات اور شامل الصفات ہے، اللہ تعالیٰ کبیر ہے اور کبریائی اس کی ردا ہے۔ (شرح اسماء الحسنیٰ)

اللہ ہی کبیر ہے جس کے حکم میں طامۃ الکبریٰ ہے، اللہ ہی کبیر ہے جس کا اقتدار نار کبریٰ پر ہے، اللہ تعالیٰ ہی کبیر ہے جو یوم کبیر میں اپنی کبریائی کا شکوہ دکھلائے گا، اللہ تعالیٰ ہی کبیر ہے جو اپنے عباد پر فضل کبیر بذل فرماتا جو مخلصین کو فوز کبیر تک پہنچاتا اور اہل طاعت کو خیر کبیر سے شاد کام فرماتا ہے، اللہ تعالیٰ ہی کبیر ہے جو اہل ایمان کو نعیم اور ملک کبیر عطا فرمائے گا۔ (شرح اسماء الحسنیٰ)

سورۃ رعد میں اللہ تعالیٰ کے لیے کبیر المتعال فرمایا گیا، سورۃ حج اور سورۃ لقمان میں علی الکبیر فرمایا گیا ہے، سورۃ المومن میں علی الکبیر فرمایا گیا ہے، سورۃ بنی اسرائیل میں بھی اللہ تعالیٰ کے لیے کبیر فرمایا گیا ہے۔

اَلْحَفِیْظُ: حفاظت کرنے والا" جو اپنی مخلوقات کی حفاظت کرتا ہے، اس کا علم اس کی تخلیق کردہ تمام اشیاء کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ گناہوں اور ہلاکت کے کاموں سے اپنے دوستوں کی حفاظت کرتا ہے، حرکات و سکنات میں ان پر لطف و کرم فرماتا ہے۔ وہ بندوں کے تمام اعمال اور ان کی جزا و سزا کی تفصیلات سے باخبر ہے۔

اَلْمُقِیْتُ: روزی رساں، جو ہر موجود کو اس کی غذا پہنچاتا ہے اور انھیں رزق بہم پہنچاتا ہے۔ اپنی حکمت اور حمد کے ساتھ جس طرح چاہتا ہے روزیاں تقسیم کرتا ہے۔

اَلْحَسِیْبُ: حساب لینے والا، کافی ہو جانے والا، وہ اپنے بندوں (کے حالات) سے باخبر ہے، توکل کرنے والوں کو کافی ہو جاتا ہے، اپنے بندوں کو اپنی حکمت اور اپنے علم کے مطابق ان کے چھوٹے بڑے اعمال کی جزا و سزا دیتا ہے۔

اَلْجَلِیْلُ: بہت اونچی شان والا، قرآن کریم میں یہ نام نہیں ہے، اس کا ایک معنیٰ آزمودہ کار ہے، ایک معنیٰ بزرگ بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ نام بطور علم اس لیے ہے کہ وہ عظمت ذاتی کا مالک ہے اور

جلالت نفسی اسی کے لیے ہے۔(شرح اسماء)

علامہ منصور پوری رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ جو شخص اسم جلیل سے تخلق پیدا کرنا چاہیے، اسے لازم ہے کہ جلال الٰہی کے تصور میں خود کو مستہلک و مضمحل سمجھے، رب العالمین کے نام اور ذات کی عزت کرنے کا خوگر بنائے اور اپنے اقوال وافعال میں تمکین وو قار سے رہے، ادنیٰ لوگوں سے شفقت اور پیار کا معاملہ کرے۔(شرح اسماء)

اَلکَرِیمُ: بہت زیادہ کرم کرنے والا، امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ کریم وہ ہے جو وعدہ کرے تو پورا کرے، جب کسی کو کچھ دے تو امیدوں سے بڑھ کر دے، اس کے باوجود بھی اسے کوئی پرواہ نہ ہو کہ کتنا دیا اور کس کو دیا(المقصد الاسنیٰ)

اَلرَّقِیبُ: نگہبان، دلوں میں پوشیدہ خیالات سے باخبر، ہر کسی کے اعمال ملاحظہ فرمانے والا، جو مخلوقات کی حفاظت کرتا ہے اور انھیں بہترین نظام کے ساتھ اور مکمل نظم وضبط کے ساتھ چلاتا ہے۔

اَلمُجِیبُ:(قبول کرنے والا، یعنی وہ ہر کسی سے قریب ہے۔ اس کا قرب دو انداز کا ہے۔ ایک عمومی قرب اس لحاظ سے کہ اللہ اس کا علم رکھنے والا، اس (کے حالات و اعمال) سے باخبر، اس کی نگرانی کرنے والا، اسے دیکھنے والا اور اس کا احاطہ کرنے والا ہے۔ دوسرا خاص قرب جو اس کی عبادت کرنے والوں، اس سے سوال کرنے والوں اور اس سے محبت رکھنے والوں کو حاصل ہوتا ہے، یہ قرب ایسا ہے کہ اس کی حقیقت کا ادراک ممکن نہیں البتہ اس کے اثرات معلوم ہو سکتے ہیں مثلاً بندے پر لطف و کرم، اس پر عنایتیں، توفیق وہدایت وغیرہ۔

دعا کی قبولیت اور عبادت پر ثواب بھی اس قرب کا ایک مظہر ہے۔ اس کی قبولیت بھی ایک عام ہے ایک خاص۔ وہ تمام دعا کرنے والوں کی دعا عمومی طور پر قبول کرنے والا ہے، وہ جو بھی ہوں، جہاں بھی ہوں، جس حال میں بھی ہوں۔ ان سے اس نے وعدہ بھی مطلق کیا ہے۔ اس کی خصوصی قبولیت ان کے لیے ہے جو اس کے احکام تسلیم کرتے اور اس کی شریعت کی پابندی کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں وہ

ان لاچار اور مجبور بندوں کی دعا بھی قبول کرتا ہے جنھیں مخلوق سے کوئی امید نہ رہی ہو اور ان کا اللہ کے ساتھ طلب، امید اور خوف کا تعلق مضبوط ہو چکا ہو۔

اَلوَاسِعُ: وسعت والا، جس کی صفات اور صفات کے متعلقات بے حد وسیع اور لا محدود ہیں۔ کوئی اس کی حمد و ثنا کما حقہ ادا نہیں کر سکتا۔ بس وہ ویسے ہی ہے جیسے اس نے اپنی تعریف خود فرمائی ہے۔ اس کی عظمت اور سلطنت بھی بے انتہا وسیع ہے، اس کا فضل واحسان بھی وسیع ہے۔ اس کے جود و کرم کی بھی انتہا نہیں۔

اَلحَکِیمُ: بہت زیادہ حکمت والا، حکمت و دانائی والا، اس کی تخلیق میں اور اس کے احکام میں اعلیٰ ترین حکمت پوشیدہ ہے۔ اس نے ہر چیز کو بہترین انداز سے پیدا فرمایا: {وَمَن اَحسَنُ مِنَ اللّٰہِ حُکمًا لِّقَومٍ یُّوقِنُونَ} (المائدہ:۵۰) یقین رکھنے والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے؟

وہ کسی چیز کو بے مقصد پیدا کرتا ہے، نہ بے فائدہ کوئی قانون جاری فرماتا ہے۔ دنیا و آخرت میں اسی کا فیصلہ نافذ ہے، تینوں طرح کے حکم اسی کے لیے ہیں۔ ان میں اس کا کوئی شریک نہیں یعنی شریعت (اور احکام نافذ کرنے) میں بھی بندوں کے درمیان وہی فیصلہ کرتا ہے۔ تقدیر میں بھی اور جزا و سزا میں بھی۔ حکمت کا مطلب ہے، ہر چیز کو اس کے مقام و مرتبہ پر رکھنا۔

اَلوَدُودُ: محبت کرنے والا اور محبوب، وہ اپنے نبیوں، رسولوں اور ان کی اتباع کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے اور وہ اس کی محبت سے سرشار ہیں، وہ انھیں ہر شے سے زیادہ پیارا ہے، ان کے دل اس کی محبت سے لبریز ہیں، ان کی زبانیں اس کی حمد و ثنا میں مصروف رہتی ہیں، ان کے دل ہر لحاظ سے انابت، اخلاص اور محبت سے اس کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔

اَلمَجِیدُ: بہت زیادہ بزرگی والا، اللہ تعالیٰ کا اسم مجید بہت سی صفات پر دلالت کرتا ہے، کسی معین صفت کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ اس کے کئی معانی ہیں، یہ اسم وسعت، کثرت اور زیادت کے لیے بنایا گیا ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کو رب العرش المجید اسی معنیٰ کے لحاظ سے فرمایا گیا کیونکہ

عرش وسیع اور عظیم ہے۔ مجید مجد سے ہے جو لغت عرب میں اوصاف کمال کی کثرت کے لیے وضع ہوا ہے، کثرت افعال خیر کے لیے وضع ہوا ہے۔ مجد بلند پایہ، مرتبت عالی، شرف واسع، شرف نسب اور شرف افعال کا مجموعہ ہے، مجید میں یہ ساری صفات پائی جاتی ہیں، مجید میں مجد نفسی، شرف ذاتی، سلامت افعال، کرامت افضال، جزالت عطا اور کثرت نوال پائی جائے۔ (معارف اسماء الحسنیٰ) قرآن مجید میں مجید اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے یا قرآن کریم کے لیے استعمال ہوا ہے، (شرح اسماء الحسنیٰ)

اَلْبَاعِثُ: اٹھانے والا، یہ بعث سے ہے، بعث کا معنیٰ اٹھانا، جگانا، کسی کو کسی جگہ بھیجنا، آمادہ کرنا، زندہ کرنا، اللہ تعالیٰ کا نام باعث ہے، اسی نے عدم محض سے نفوس کو اٹھایا، وہی ہے جو غافلین کو خواب غفلت سے بیدار کرتا ہے، وہی ہے جو انسانوں میں حوصلہ ہمت اور بلندی عزم پیدا کرتا ہے، وہی ہے جو انبیاء ومرسلین کو مخلوق کی طرف بھیجتا رہا ہے، حتی کہ اس سلسلہ کا خاتمہ سیدنا ومولانا محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم فرمادیا، وہی ہے کہ انصاف کے دن اجساد کو زمین سے اٹھائے گا۔ (معارف اسماء الحسنیٰ)

اَلشَّهِيدُ: گواہ، حاضر ناظر، جوہر چیز سے باخبر ہے، وہ تمام آوازیں سنتا ہے خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ، وہ تمام موجودات کو دیکھتا ہے خواہ وہ چھوٹی ہوں یا بڑی۔ اس کا علم ہر شے کو محیط ہے۔ وہ بندوں کے اعمال کے مطابق ان کے حق میں یا ان کے خلاف گواہ ہے۔

اَلْحَقُّ: سچا، حقیقت، سچا، وہ اپنی ذات وصفات میں حق ہے، وہ واجب الوجود ہے، کامل صفات سے متصف ہے، موجود ہونا اس کی ذات کے لوازم میں سے ہے، اس کے بغیر کسی چیز کا وجود ممکن نہیں، وہ ہمیشہ سے جلال، جمال اور کمال کی صفات سے متصف ہے اور ہمیشہ ان صفات سے موصوف رہے گا۔ وہ ازل سے احسان کے ساتھ معروف ہے اور ہمیشہ یوں ہی رہے گا، اس کا قول بھی حق ہے، اس کا فعل بھی حق ہے، اس کی ملاقات (اور قیامت) بھی حق ہے، اس کے رسول حق ہیں، اس کی کتابیں حق ہیں، اس کا دین حق (اور سچا) ہے، اس اکیلے کی عبادت حق ہے، اس کا کوئی شریک نہیں، اس سے جس چیز کی بھی نسبت ہے وہ حق ہے۔

{ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدعُونَ مِن دُونِهٖ هُوَ البَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ العَلِيُّ الكَبِيرُ} (الحج:۶۲) یہ اس لیے ہے کہ اللہ ہی حق ہے اور اس کے سوا جس جس کو پکارتے ہیں، وہ سراسر باطل ہے اور اللہ ہی بلندیوں والا اور بڑا ہے۔ وَقُلِ الحَقُّ مِن رَّبِّكُم فَمَن شَآءَ فَلیُؤمِن وَّمَن شَآءَ فَلیَكفُر فرمادیجیے! حق تمھارے رب کی طرف سے ہے لہٰذا جو شخص چاہے ایمان لے آئے اور جو چاہے کفر اختیار کرلے۔ (سورۃ الکہف ۲۹) {فَمَاذَا بَعدَ الحَقِّ اِلَّا الضَّلٰلُ} (یونس:۳۲) حق کو چھوڑ کر گمراہی کے سوا کیا رہ جاتا ہے۔ {وَقُلِ جَآءَ الحَقُّ وَزَهَقَ البَاطِلُ اِنَّ البَاطِلَ كَانَ زَهُوقاً} (الاسراء:۸۱) فرمادیجیے، حق آگیا اور باطل مٹ گیا، یقیناً باطل کو مٹنا ہی تھا"

اَلوَكِيلُ: کارساز، کام بنانے والا، مشکل کشا، جو اپنے علم، کامل قدرت اور کامل حکمت کے ساتھ مخلوقات کے کام سنوارتا ہے، جو اپنے اولیاء سے محبت رکھتا ہے انھیں آسانیاں مہیا فرماتا اور مشکلات سے بچاتا ہے جو اسے اپنا کارساز مان لے، اسے کسی اور کی محتاجی نہیں رہتی۔ ارشاد ہے، اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ اٰمَنُوا يُخرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّورِ (البقرہ:۲۵۷) اللہ مومنوں کا دوست ہے، انھیں اندھیروں سے نکال کر روشنی میں لے جاتا ہے۔

اَلقَوِيُّ: مضبوط، یہ قوت سے ہے، قرآن کریم میں قوت کا لفظ کئی بار استعمال ہوا ہے، اللہ تعالیٰ قوی ہے اور تمام قوتیں اسی سے حاصل ہوتی ہیں، اللہ تعالیٰ قوی ہے اور اسی نے جملہ مظاہر کو قوت ربانی سے ظہور بخشا ہے، اللہ تعالیٰ قوی ہے اسی کا نام ضعیفوں کے لیے توانائی بخشنے والا ہے، دل کو قوت ایمان بخشتا ہے، روح کو قوت عرفان عطا کرتا ہے، قوی کو قوی بناتا ہے، جسم کو مضبوط بناتا ہے۔ (معارف اسماء)

اَلمَتِينُ: زبردست، عربی زبان میں متن کا معنیٰ صلب اور اشتد اور قوی ہے، جس کا معنیٰ مضبوط ہوا، متین کا معنیٰ وہ ذات قوی ہے جسے اپنے افعال میں مشقت و کلفت اور تعب لاحق نہیں ہوتی، قوی اور متین میں تھوڑا سا فرق ہے، قدرت میں بالغ و تام کو قوی کہتے ہیں اور قدرت میں مضبوط و شدید کو

متین بولتے ہیں۔ (معارف اسماء الحسنیٰ)

اَلوَلِیُّ: دوست، یہ ولا سے ہے، ولا کے معنیٰ محبت، صداقت، قرب، قرابت اور ملک کے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے کہ کیا لوگ اوروں کو اللہ کے سوا اولیاء پکڑ رہے ہیں، ولی تو صرف اللہ تعالیٰ ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ اللہ اہل ایمان کا ولی ہے، اللہ اہل تقویٰ کا ولی ہے، اللہ کے سوا تمہارے لیے کوئی ولی نہیں ہے۔ ولایت صرف اللہ حق کے لیے ہے۔

اَلحَمِیدُ: تعریفوں والا، وہ اپنی ذات کے لحاظ سے، اپنے اسماء کے لحاظ سے، صفات کے لحاظ سے اور افعال کے لحاظ سے (ہر طرح) قابل تعریف ہے۔ اس کے نام بہترین، اس کی صفات اور اس کے افعال کامل ترین اور بہترین ہیں کیوں کہ اس کے افعال اس کے فضل کے مظہر ہیں یا اس کے عدل کے۔

اَلمُحصِیُ: شمار کرنے والا، یہ احصاء سے ہے، اس کا معنیٰ شمار کرنا ہے، دریافت کرنا نگہداشت کرنا۔ قرآن کریم میں بطور نام محصی استعمال نہیں ہوا ہے، احصاہ اللہ استعمال ہوا ہے، جس کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ نے ان کے عملوں کو شمار کر رکھا ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر آیا کہ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو شمار کر رکھا ہے۔

اَلمُبدِیُ: ابتدا میں پیدا کرنے والا۔ **الم عج د:** لوٹانے والا، ابتدا کرنے والا، دہرانے والا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: {هُوَ الَّذِی یَبدَؤُا الخَلقَ ثُمَّ یُعِیدُہٗ} (الروم:۲۷) وہی ہے جو پہلی بار پیدا کرتا ہے پھر دوبارہ پیدا کرے گا۔ اس نے اپنی مخلوق کو پہلی بار اس لیے پیدا کیا ہے کہ ان کو آزمائے کہ کون بہترین عمل کرتا ہے پھر دوبارہ پیدا کرے گا تاکہ نیکی کرنے والوں کو نیکیوں کی جزا دے اور برے کام کرنے والوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دے۔ اسی طرح وہ اپنی مخلوقات کو ایک تدریج کے ساتھ ابتداً پیدا کرتا ہے اور پھر اس کا ہر وقت اعادہ کرتا رہتا ہے۔

اَلمُحیِ: زندہ کرنے والا، یہ حیاء سے ہے، جس کا معنیٰ زندگی دینا، اللہ تعالیٰ کا نام محی ہے جس نے زندگی دی، جس نے زندگی کو پیدا کیا، جس نے روح کو پیدا کیا، جس نے روح کو اجسام کے ساتھ پیوند کیا،

ارواح مجردہ، نفوس ناطقہ، قوائے نامیہ، اجسام متوالدہ میں جو زندگی ہے وہ اسی کی بخشی ہوئی ہے۔ وہی ہے جو قلوب کو حیات بخشتا ہے، وہی ہے جو نسمہ سے نسمہ کو نکالتا ہے، وہی ہے جو حیات علمی، حیات ایمانی، حیات عرفانی عطا فرماتا ہے (معارف اسماء)

اَلْمُمِیْتُ: مارنے والا، جو اللہ انسان کو عدم سے وجود میں لایا وہی اس پر موت بھیجنے والا بھی ہے، قرآن کریم میں ہے کہ تم اللہ کا انکار کیسے کرسکتے ہو جب کہ تم کچھ بھی نہیں تھے اس نے تمہیں زندگی دی پھر وہ تمہیں موت دے گا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ محیی ہے وہ ممیت بھی ہے، وہ جس طرح زندگی کا مالک ہے اسی طرح موت کا بھی مالک ہے، موت اس کی مخلوق ہے، وہ ممیت ہے ملک الموت اس کے حکموں کی تعمیل کرتا ہے۔

اَلْحَیُّ، اَلْقَیُّوْمُ: زندہ، قائم رہنے اور رکھنے والا، اس کی حیات کامل اور ذاتی طور پر قائم ہے اور آسمان اور زمین والوں کو قائم رکھنے والا ہے۔ ان کے تمام انتظامات، رزق اور تمام حالات اس کے ہاتھ میں ہیں۔ "اَلْحَیُّ" صفات ذاتیہ کا جامع نام ہے اور "اَلْقَیُّوْمُ" صفات افعال کا جامع ہے

اَلْوَاجِدُ: پانے والا، اہل علم کہتے ہیں کہ واجد بمعنیٰ اوجد کے ہے، واجد کے معنیٰ پانے اور دریافت کے ہیں، اللہ تعالیٰ کا نام اس معنیٰ میں نہیں ہو سکتا، قرآن میں جہاں کہیں اس مصدر کے افعال آئے ہیں وہاں انسان فاعل ہے اللہ تعالیٰ نہیں، صاحب قاموس کہتے ہیں کہ وجدہ اللہ تعالیٰ کہنا درست نہیں ہاں اوجدہ اللہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ اسم وجود سے بن سکتا ہے، وجود کے معنیٰ ہستی ہیں، اس معنیٰ میں بھی یہ اسم قرآن مجید میں نہیں آیا اور نہ لفظ وجود کا استعمال قرآن میں ہوا ہے۔ (معارف) اللہ تعالیٰ اس لیے واجد ہے کہ وجود حقیقی اور ہستی مطلق اسی کو حاصل وزیبا ہے، اللہ تعالیٰ اس لیے واجد ہے کہ جملہ موجودات پر اسے احاطت حاصل ہے، وہ واجد ہے اور جملہ مطلوبات و کمالات ذاتیہ کا وجود اسے ہمیشہ سے حاصل ہے۔ (معارف اسماء)

اَلْمَاجِدُ: بزرگی والا، یہ مجد سے ہے، مجید بھی مجد سے ہے، مجید میں مبالغہ ہے، یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ

تعالیٰ کا ہر ایک نام بوجہ علمیت خود کمال تام ربانی پر دلالت کرتا ہے، اقتضائے لفظی کے ساتھ شامل ہو یا نہ ہو، لہٰذا الماجد اللہ تعالیٰ کی بزرگی و عظمت پر دلالت قوی رکھتا ہے، یہ تلون صفات ہے کہ کبھی فعیل کی شکل میں اور کبھی فاعل کی شکل میں جلوہ آرائی ہوتی ہے اور ہر شکل میں دلربائی کی شان الگ الگ نظر آتی ہے۔

اَلوَاحِدُ: اکیلا، الاحد، یکتا، وہ تمام صفات کمال میں یکتا ہے، ان میں اس کے ساتھ کوئی شریک نہیں، بندوں کا فرض ہے کہ اسے عقلی طور پر، زبانی طور پر اور عملی طور پر ایک مانیں یعنی اس کے کمال مطلق کا اعتراف کریں، وحدانیت صرف اسی کے لیے تسلیم کریں اور ہر قسم کی عبادت صرف اکیلے اللہ کے لیے خاص کر دیں۔

اَلصَّمَدُ: بے نیاز، یعنی وہی ذات ہے جس کی طرف تمام مخلوقات اپنی تمام ضرورتوں، تمام مجبوریوں اور تمام حالات میں متوجہ ہوتی ہیں کیوں کہ وہ اپنی ذات میں، اسماء میں، صفات میں اور افعال میں لامحدود کاملیت سے متصف ہے۔

اَلقَادِرُ، اَلقَدِیرُ: قدرت رکھنے والا، جس کی قدرت کامل ہے۔ اس نے اپنی قدرت سے تمام اشیاء کو وجود بخشا، اپنی قدرت سے ان کی تدبیر کی، اپنی قدرت سے انھیں درست اور محکم بنایا۔ وہ اپنی قدرت سے زندہ کرتا اور موت دیتا ہے اور اپنی قدرت سے بندوں کو جزا و سزا کے لیے اٹھائے گا پھر نیکی کرنے والے کو نیکی کا انعام دے گا اور برائی کرنے والے کو برائی کی سزا۔ وہ جب کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو (کن) کہتے ہی وہ چیز ہو جاتی ہے۔ وہ اپنی قدرت سے دلوں کو پلٹتا اور اپنی مشیت کے مطابق ان کو پھیرتا ہے۔

اَلمُقتَدِرُ: قدرت والا، اللہ تعالیٰ کے اسم قادر سے المقتدر میں زیادہ مبالغہ پایا جاتا ہے، اس کا مطلب اور مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو قدرت تامہ اور کاملہ حاصل ہے، دائمی کمالات پر اسے کلی اقتدار حاصل ہے، اسے قرآن کریم میں ملیک مقتدر کہا گیا ہے، جس کا معنیٰ قدرت والا بادشاہ، اسی طرح

دوسرے مقام پر عزیز مقتدر کہا گیا ہے، جس کا معنیٰ قدرت والا، غلبے والا، المقتدر لازم اور متعدی دو معانی کے لیے آتا ہے۔

اَلْمُقَدِّمُ: سب سے پہلے، اَلْمُؤَخِّرُ: سب سے آخر، یہ دونوں نام قرآن کریم میں نہیں ہیں ہاں البتہ حدیث شریف میں نبی کریم ﷺ کی ایک دعا میں مقدم اور مؤخر اللہ تعالیٰ کے دو ناموں کا ذکر موجود ہے۔

اَلْاَوَّلُ: پہلا، اَلْآخِرُ: مخلوقات کے فنا ہونے کے بعد باقی رہنے والا، اللہ تعالیٰ اول ہے تمام موجودات پر اس کی ہستی کو اولیت حاصل ہے، جس قدر اوائل کا ذکر ہے وہ اوائل اضافیہ ہیں، سب کے سب اوائل کا وجود اللہ کے بعد ہے، بدایات کی ابتدا اسی کی اولیت سے ہے، اس کی اولیت ہر ایک ابتدا سے برتر و بعید ہے۔ ذہنی و خارجی، فرضی و عقلی موجودات کی ابتدا اسی کی اولیت سے ہے۔ (معارف اسماء)

اللہ تعالیٰ آخر ہے یعنی فناء مخلوقات کے بعد اسی کی بقاء کو تاخر ہے، اور جس قدر اواخر اعتباری ہیں ان سب کے بعد اسی کا قیام ہے، وہی ابدی الابدی ہے، وہی ادوم بلانہایت ہے، ہر ایک نہایت کی انتہاء اسی کی اخرویت کے تحت میں ہے، اسی کی ذات سب کی منتہا و مرجع ہے۔ (معارف اسماء)

اَلظَّاهِرُ: عیاں، اَلْبَاطِنُ: پوشیدہ، نبی ﷺ نے ان اسمائے حسنیٰ کی ایک واضح اور جامع تشریح فرما دی ہے۔ ارشاد نبوی ہے {اَنْتَ الْاَوَّلُ فَلَيْسَ قَبْلَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْآخِرُ فَلَيْسَ بَعْدَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الظَّاهِرُ فَلَيْسَ فَوْقَكَ شَيْءٌ وَاَنْتَ الْبَاطِنُ فَلَيْسَ دُوْنَكَ شَيْءٌ} تو ہی اول ہے، تجھ سے پہلے کچھ نہیں تھا۔ تو ہی آخر ہے تیرے بعد کچھ نہیں۔ تو ظاہر ہے تجھ سے بلند تر کوئی چیز نہیں، تو باطن ہے تجھ سے قریب تر کوئی چیز نہیں۔

اَلْوَالِي: اللہ تعالیٰ والی ہے، اسے کاموں کی تولیت حاصل ہے، سب چیزوں پر اسی کا تصرف اور اختیار چلتا ہے، والی کا مفہوم یہ ہے جس کو ساری چیزوں پر تصرف کا حق حاصل ہو۔

اَلْمُتَعَالِي: بہت بلند، قرآن کریم کی سورۃ رعد میں الکبیر المتعال آیا ہے، متعال یہ علو کے مادہ سے ہے، علو کا مبالغہ اس میں پایا جاتا ہے، اللہ متعال ہے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر ایک سے عالی اور بلند ہے، ایک

مسلمان روزانہ نماز میں تَعَالٰی جَدُّ رَبِّنَا کا اعلان اور اقرار کرتا ہے کہ ہمارے رب کی ذات اونچی ہے۔

اَلْبَرُّ: احسان کرنے والا، اللہ تعالیٰ کا نام بر اس لیے ہے کہ وہ اپنے بندوں پر گوناگوں احسان فرماتا ہے، دنیا کی نعمتیں عطا فرماتا ہے، نعمائے آخرت ایثار کرتا ہے، وہی ہے جس نے انواع احسان کو بیان فرمایا، اور ورع و تقویٰ کی پابندی کا حکم دیا، لہٰذا نیکی کنندہ، نیکی دہندہ وہی ہے۔ (معارف)

اَلتَّوَّابُ: بہت زیادہ توبہ قبول کرنے والا، جو ہمیشہ سے توبہ کرنے والوں کی توبہ قبول کرنے والا اور رجوع کرنے والوں کے گناہ معاف کرنے والا ہے لہٰذا جو بھی اللہ کے دربار میں سچے دل سے توبہ کرے، اللہ اس کی توبہ قبول فرماتا ہے۔ وہ بندوں پر پہلے تو اس انداز سے التفات فرماتا ہے کہ انھیں توبہ کی توفیق دیتا اور ان کے دل اپنی طرف پھیر لیتا ہے پھر اس انداز سے التفات فرماتا ہے کہ ان کی توبہ قبول کرکے ان کی غلطیوں سے درگزر فرماتا ہے۔

اَلْمُنْتَقِمُ: انتقام لینے والا، یہ نقم سے بنا ہے جس کا معنیٰ ناپسندیدگی ہے، کسی برے فعل کو دیکھ کر اس پر انکار کرنا، خواہ زبان سے ہو یا عقوبت سے ہو، منتقم بطور اسم کے قرآن کریم میں نہیں آیا ہے، البتہ ذوانتقام استعمال ہوا ہے، جس سے منتقم سمجھا گیا ہے۔

اَلْعَفُوُّ: معاف کرنے والا، اس کا لفظی معنیٰ چھوڑ دینا ہے، عفو کا معنیٰ ہے بہت چھوڑ دینے والا، قرآن کریم میں پانچ مقامات پر عفو آیا ہے، چار جگہ میں اسم غفور کے ساتھ اور ایک جگہ اسم قدیر کے ساتھ آیا ہے۔

اَلرَّؤُوْفُ: رافت سے ہے، رافت وہ مہربانی جس کا مقصد ازالہ ضرر اور دفع مکروہات ہو، قرآن کریم میں اسم رؤوف ۹ مقامات پر آیا ہے، دو مقامات پر رؤوف بالعباد انفرادی حالت میں اور سات مقامات پر رؤوف الرحیم مرکب حالت میں، لہٰذا رؤوف الرحیم بھی رحمٰن الرحیم کے معنیٰ میں برابر ہو جاتا ہے۔ (معارف اسماء الحسنیٰ)

مَالِكُ الْمُلْكِ: شہنشاہ، دنیا میں بادشاہی کے دعویدار بہت لوگ ہوئے ہیں اور قیامت تک ہوتے رہیں گے، مگر حقیقی شہنشاہ اور بادشاہ اللہ ہی ہے، جو ساری کائنات ہستی کو چلا رہا ہے، قیامت کے دن

سب بادشاہوں کی بادشاہی ختم ہو جائے گی ایک رب العالمین کی بادشاہی کا سکہ چلے گا۔

ذُوالجَلَالِ: اَلاِ کرَامُ: عظمت والا اور عزت افزائی کرنے والا، وہ عظمت و کبریائی سے متصف ہے، رحمت اور سخاوت والا ہے، اس کا عمومی احسان بھی ہے اور خصوصی احسان بھی، وہ اپنے دوستوں اور مقربین کو عزت بخشتا ہے، وہ اس کی عظمت وجلالت شان کو پیش نظر رکھتے اور اس سے محبت رکھتے ہیں۔

اَلمُقسِطُ: انصاف کرنے والا، قرآن کریم میں مقسط اللہ کے نام کے طور پر استعمال نہیں ہوا ہے، ایک مقام پر ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ مقسطین کو پسند کرتا ہے، بہت سی آیات میں اللہ تعالیٰ نے قسط وانصاف کرنے کا حکم دیا ہے، اس سے اہل علم وعرفاں نے اللہ کا نام مقسط سمجھا ہے۔

اَلجَامِعُ: جمع کرنے والا، وہ لوگوں کو اس دن جمع کرے گا جس کے وقوع میں کوئی شک نہیں۔ وہ ان کے عملوں اور رزقوں کو بھی جمع کرنے والا ہے چنانچہ ہر چھوٹا بڑا عمل اس کے شمار میں ہے۔ وہ پہلے اور پچھلے مردوں کے بکھر جانے والے اور تبدیل ہو کر مٹی بن جانے والے اعضاء کو بھی اپنی کامل قدرت وعلم کے ساتھ جمع کرلے گا)

اَلغَنِیُ: بے پرواہ، **اَلمُغنِی:** مالدار کرنے والا، وہ غنی ہے، جسے ہر پہلو اور ہر اعتبار سے مکمل اور لامحدود غنا واستغنا حاصل ہے کیوں کہ وہ خود بھی کمال سے متصف ہے اور اس کی صفات بھی اس قدر کامل ہیں کہ ان میں کسی لحاظ سے کسی نقص کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کا غناء کے برعکس کیفیت میں ہونا ممکن نہیں کیوں کہ غناء اس کی ذاتی لازمی صفات میں سے ہے، آسمان وزمین کے خزانے بلکہ دنیا اور آخرت کے خزانے اس کے ہاتھ میں ہیں۔ وہ اپنی تمام مخلوقات کو عمومی غناء عطا فرماتا ہے اور اپنے خاص بندوں کے دلوں پر ربانی معارف اور ایمانی حقائق کو فیض پہنچا کر غنی کر دیتا ہے۔

اَلمُعطِی: عطا کرنے والا، **اَلمَانِعُ:** روکنے والا، دینے والا، روک لینے والا، وہ جو کچھ دینا چاہے، کوئی اس میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا اور جس چیز کو وہ روک لے، کوئی عطا نہیں کر سکتا لہٰذا تمام نعمتیں اور فوائد

اس سے مانگنا چاہئیں، ان کے لیے اس کی طرف رغبت کرنا چاہیے۔ وہی اپنی حکمت ورحمت کی بنا پر جسے چاہتا ہے، وہ نعمتیں اور فوائد عطا فرماتا ہے اور جس سے چاہتا ہے روک لیتا ہے۔

اَلضَّارُ: نقصان دینے والا، **اَلنَّافِعُ:** نفع دینے والا، انسان اپنی آنکھوں کے سامنے دنیا میں زندگی کے کاروبار چلتے ہوئے دیکھتا ہے، کاروبار، تجارت اور سوداگری میں کسی کو خوب نفع حاصل ہو رہا ہے اور کسی کی اصل پونجی بھی تباہ ہو جاتی ہے، یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، انسان تو اپنی ذات میں نافع ہے اور نہ ہی ضار۔

اَلنُّوْرُ: روشنی۔ روشنی عطا کرنے والا، وہ آسمانوں اور زمین کو روشن کرنے والا ہے۔ اس نے عارفین کے دل معرفت اور ایمان کے ساتھ منور فرما دیے اور ان کے دلوں کو ہدایت کے نور سے روشن فرمایا۔ اس نے آسمان اور زمین کو اپنے پیدا کیے ہوئے انوار سے روشن کر رکھا ہے۔ اس کا پردہ بھی نور ہے اگر وہ اسے ہٹا دے تو اس کے چہرہ انور کے جلووں سے تمام مخلوق فنا ہو جائے۔

اَلْهَادِیُ: راہنمائی کرنے والا، ھدی یھدی ھدایت کا معنٰی راستہ دکھانا اور منزل مقصود تک پہنچانا ہے، دنیا میں جتنے بھی لوگ ہدایت پانے والے ہیں وہ سب اللہ کی راہنمائی اور توفیق سے راہ ہدایت پر گامزن ہوئے، اللہ کی چاہت اور مرضی سے ہدایت ملتی ہے، کسی کو اپنی منشاء اور مرضی سے ہدایت نہیں ملتی، حقیقی ہادی اللہ ہی کی ذات ہے، جو انسان کو راہ ہدایت پر ڈال دیتا ہے۔

اَلْبَدِیْعُ: بغیر نمونے کے بنانے والا، آسمان اور زمین کا موجد، جس نے انھیں کسی سابقہ مثال کے بغیر پیدا فرمایا، ان کی تخلیق انتہائی حسن وجمال اور تخلیق بے مثال اور عجیب وغریب پختہ نظام پر قائم ہے۔

اَلْبَاقِیُ: ہمیشہ رہنے والا، اللہ جل شانہ اس وقت بھی تھا جب کچھ بھی نہیں تھا، اور جب کچھ بھی نہیں رہے گا اللہ اس وقت بھی باقی رہے گا، سب کو فنا ہے مگر اس ذات عالی کو فنا نہیں ہے، اسی لیے اسے الباقی کہا جاتا ہے۔

اَلوَارِثُ: ورثہ کسی ایک کے پاس دوسرے کی چیز کا اس کی موت کے بعد منتقل ہونا ہے، اللہ تعالیٰ کے لیے وارث کا اطلاق اس لیے ہے کہ ہر ایک سلطنت کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کسی لاوارث کی کوئی جائیداد رہ جاتی ہے تو اس کی ملکیت سلطنت کی طرف منتقل ہوتی ہے، ایسے حالات میں جبکہ کوئی قوم ساری کی ساری تباہ کر دی گئی ہو تو اس کی وراثت سلطنت الٰہیہ کی طرف منتقل ہو گی، اور جب کل عالم کے عارضی مالک اپنی اپنی ملکیتوں کو چھوڑ کر خاکِ فنا میں سو رہے ہوں گے تو ظاہر ہے کہ رب العالمین ہی کو ان کی وراثت حاصل ہو گی۔ (معارف الاسماء)

اَلرَّشِیدُ: ہدایت دینے والا، حکمت والا، وہ ہر فائدے کے حصول اور ہر ضرر سے بچاؤ کے لیے اپنے بندوں کی رہنمائی فرماتا ہے اور انھیں وہ کچھ سکھاتا ہے جسے وہ نہیں جانتے، وہ انھیں ہدایت نصیب فرماتا ہے، ان کے دلوں میں تقویٰ ڈالتا ہے، ان کے دلوں کو اپنی طرف رجوع کرنے والے اور اپنے احکامات کی تعمیل کرنے والے بناتا ہے۔ رشید کے ایک معنی حکیم کے بھی ہیں۔ وہ اپنے ارشادات و افعال میں صاحب حکمت ہے۔ اس کی شریعت کے تمام احکام خیر، ہدایت اور حکمت پر مشتمل ہیں۔ اس کی تمام مخلوقات میں حکمت پائی جاتی ہے۔

اَلصَّبُورُ: صبر کا لغوی معنیٰ حبس اور امساک ہے، شرعی معنیٰ مصیبت کے وقت شکوہ و شکایت نہ کرنا صبر کہلاتا ہے، قرآن کریم میں بے شمار مقامات پر صبر کا لفظ آیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے صبر کرنے والوں کی تعریف کی ہے، بلکہ واضح کیا کہ اللہ تعالیٰ کی معیت صبر کرنے والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

یہ اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے، مگر قرآن کریم میں نہیں آیا ہے، ہاں البتہ حدیث شریف میں حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ کی روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان میں اللہ تعالیٰ کے لیے **اَصبَر** کا لفظ آیا ہے، جو کہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے جس کا معنیٰ بہت زیادہ صبر کرنے والا، اسی **اَصبَر** سے **صَبُور** سمجھا گیا ہے، اس کے ہم معنیٰ ایک اور نام قرآن کریم میں حلیم آیا ہے۔

آیت کا آخری حصہ: آسمان وزمین کی کل چیزیں اس کی تسبیح بیان کرتی ہیں۔ جیسے فرمان ہے تُسَبِّحُ لَهُ السَّمَاوَاتُ السَّبْعُ وَالأَرْضُ وَمَنْ فِيهِنَّ وَإِنْ مِنْ شَيْءٍ إِلا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهِ وَلَكِنْ لا تَفْقَهُونَ تَسْبِيحَهُمْ إِنَّهُ كَانَ حَلِيمًا غَفُورًا (الاسراء: ۴۴) اس کی پاکیزگی بیان کرتے ہیں، ساتوں آسمان اور زمینیں اور ان میں جو مخلوق ہے اور کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی تسبیح حمد کے ساتھ بیان نہ کرتی ہو لیکن تم ان کی تسبیح کو سمجھ نہیں سکتے بیشک وہ بردبار اور بخشش کرنے والا ہے۔

سورۃ الحشر کے اختتام پر سورۃ الحشر کی فضیلت بھی ملاحظہ فرمایئے، حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص صبح کو تین بار أَعُوذُ بِاللهِ السَّمِيعِ الْعَلِيمِ مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ، پڑھ کر پھر سورۃ الحشر کی آخری تین آیات کی تلاوت کرے گا تو وَكَّلَ اللهُ بِهِ سَبْعِينَ أَلْفَ مَلَكٍ يُصَلُّونَ عَلَيْهِ حَتَّى يُمْسِيَ، وَإِنْ مَاتَ فِي ذَلِكَ الْيَوْمِ مَاتَ شَهِيدًا، وَمَنْ قَالَهَا حِينَ يُمْسِي كَانَ بِتِلْكَ الْمَنْزِلَةِ، اللہ تعالیٰ اس کے لئے ستر ہزار فرشتے مقرر کرتا ہے جو شام تک اس پر رحمت بھیجتے ہیں اور اگر اسی دن اس کا انتقال ہو جائے تو شہادت کا مرتبہ پاتا ہے اور جو شخص ان کی تلاوت شام کے وقت کرے وہ بھی اسی حکم میں ہے۔ (مسند احمد،)

الحمد للہ ثم الحمد للہ آج سورۃ الحشر کی تفسیر اختتام پذیر ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ اس کاوش کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول اور منظور فرمائے، اس متواضع کوشش کو اللہ تعالیٰ میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے مشائخ کے لیے، میرے اساتذہ کرام کے لیے، میرے رفقاء اور معاونین مساعدین کے لیے ذریعہ نجات بنائے، جو جو دوست اس کار خیر کی اشاعت میں شریک ہیں اللہ انہیں بھی اس کا وافر حصہ عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ اس تفسیری کاوش کو ہم سب کے لیے صدقہ جاریہ بنائے۔ آمین بحرمۃ النبی الکریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی (جامعہ رشیدیہ غوث گارڈن، مناواں لاہور)

یکم دسمبر ۲۰۱۸ء بروز ہفتہ، ۲۳ ربیع الاول ۱۴۴۰ھ بوقت چھ بجے شام

تعارف سورۃ الممتحنہ

سوال سورۃ الممتحنہ کا تعارف کروائیے۔

جواب سورۃ الممتحنہ مدنی سورت ہے، اس کی آیات کی تعداد ۱۳ ہے، اس کے رکوع ۲ ہیں۔ یہ قرآن مجید کی ۶۰ ویں سورت ہے، ترتیب نزولی کے اعتبار سے سورۃ الممتحنہ کا نمبر ۹۱ ہے اور اس کا نزول صلح حدیبیہ کے بعد ہوا۔ اس سورت کو "سورۃ الممتحنہ" کے علاوہ "سورۃ المودۃ" بھی کہا جاتا ہے۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام "الممتحنہ" ہے، جس کے معنی ہیں "آزمائش والی" یا "امتحان لینے والی"۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سورت میں مہاجر عورتوں کے ایمان کے امتحان کا حکم دیا گیا ہے، فَامْتَحِنُوْهُنَّ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ(۱۰) اگر "الممتحنہ" کو کسرہ کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا مطلب ہے "آزمائش لینے والی سورت" یعنی سورت خود امتحان لینے والی ہے۔ اگر فتحہ کے ساتھ پڑھا جائے تو اس کا مطلب ہے "آزمائی گئی عورت" یعنی وہ عورت جس کے ایمان کا امتحان لیا گیا، جیسے کہ ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط، جن کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

شان نزول: اس سورت کے نزول کا پس منظر دو اہم واقعات ہیں: ① حاطب بن ابی بلتعہ کا واقعہ: جب رسول اللہ ﷺ نے فتح مکہ کا ارادہ کیا تو حاطب بن ابی بلتعہ (جو کہ بدری صحابی تھے) نے قریش کو ایک خفیہ خط لکھا جس میں مسلمانوں کے ارادے کی اطلاع دی، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو اس کی خبر دی اور خط پکڑوالیا، اس پر یہ آیات نازل ہوئیں کہ مسلمانوں کو کفار کے ساتھ خفیہ دوستی اور راز داری سے منع کیا گیا۔

② مہاجر عورتوں کا امتحان: صلح حدیبیہ کے بعد جب مسلمان عورتیں مکہ سے مدینہ ہجرت کر کے آئیں تو ان کے ایمان کے بارے میں امتحان لینے کا حکم دیا گیا کہ کہیں وہ محض دنیاوی فائدے یا کسی اور وجہ سے نہ آئی ہوں، بلکہ سچے ایمان کی بنیاد پر ہجرت کی ہو۔

اہمیت وافادیت: اس سورت میں مسلمانوں کو واضح ہدایت دی گئی ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی نہ کریں، چاہے وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ اس سورت میں "حب فی اللہ وبغض فی اللہ" (اللہ کے لیے محبت اور اللہ کے لیے دشمنی) کا اصول بیان کیا گیا ہے، جو اسلامی معاشرت اور تعلقات کی بنیاد ہے۔ اس سورت میں مہاجر عورتوں کے ایمان کے امتحان اور ان کے حقوق و احکام کو بیان کیا گیا ہے، جو اسلامی معاشرت میں عورتوں کے مقام اور ان کے حقوق کی وضاحت کرتا ہے۔ اس سورت کی تلاوت کی فضیلت بھی روایات میں آئی ہے کہ جو شخص اس سورت کی تلاوت کرے گا، قیامت کے دن مومن مرد وعورت اس کے لیے شفاعت کریں گے۔

سورۃ الممتحنہ کے اہم ترین مضامین: ① کفار ومشرکین سے دوستی کی ممانعت: سورت کی ابتدا میں مسلمانوں کو کفار ومشرکین سے دوستی اور رازداری سے سختی سے منع کیا گیا ہے، چاہے وہ ان کے قریبی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں۔ میرے استاذ مولانا خادم حسین شجاعبادی فرماتے ہیں کہ کفار سے عدم مؤدت کی سات وجوہات ہیں۔ {۱} وہ تمہارے دشمن ہیں۔ {۲} حق کا انکار کرتے ہیں۔ {۳} رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو تنگ کر کے مکہ سے نکالا۔ {۴} وہ تمہارے ایمان کو پسند نہیں کرتے۔ {۵} وہ تمہیں ہاتھوں اور زبانوں سے تکلیف دینے کے درپے رہتے ہیں۔ {۶} وہ تمہارے کفر یعنی مرتد ہونے کو پسند کرتے ہیں۔ {۷} جن رشتہ داروں کی خاطر تم مشرکین پر احسان کر رہے ہو قیامت کے دن وہ بھی کام نہیں آئیں گے، یہ سات وجوہات کفار سے مؤدت کی ممانعت میں ہیں۔ (عقد الجواہرات)

② حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی مثال: مسلمانوں کو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی مثال دی گئی ہے کہ انہوں نے اللہ کے دشمنوں سے براءت کا اعلان کیا اور صرف اللہ کے لیے محبت و دشمنی رکھی۔ میرے استاذ مولانا خادم حسین شجاعبادی فرماتے ہیں کہ ابراہیم نے اپنے تمام مشرک رشتہ داروں کو چھوڑ دیا اور اعلان فرمایا ہم تم سے اور تمہارے معبودان باطلہ سے بیزار ہیں۔

③ امید اور حکمت: سورت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہے تو آج کے دشمنوں کے دلوں میں بھی محبت ڈال سکتا ہے، اس لیے مایوسی نہیں ہونی چاہیے۔

④ مہاجر عورتوں کے ایمان کا امتحان: آیت ۱۰ میں مہاجر عورتوں کے ایمان کے امتحان کا حکم دیا گیا ہے، اور بتایا گیا ہے کہ اگر وہ سچی مومنہ ہوں تو انہیں واپس نہ کیا جائے۔

⑤ عورتوں کے حقوق اور نکاح کے احکام: سورت میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ اگر کسی مسلمان کی بیوی کافرہ ہو کر چلی جائے تو اس کے نکاح کے احکام کیا ہوں گے، اور اگر کوئی مومنہ عورت ہجرت کر کے آئے تو اس کے نکاح کے احکام کیا ہوں گے۔

⑥ بیعت النساء: سورت کے آخر میں عورتوں سے بیعت لینے کے آداب اور شرائط بیان کی گئی ہیں، کہ وہ شرک، چوری، زنا، قتل اولاد، بہتان اور نافرمانی سے باز رہیں گی۔

میرے استاذ مولانا خادم حسین شجاعبادی فرماتے ہیں کہ بیعت کی چار اقسام ہیں، بیعت اسلام، بیعت خلافت، بیعت جہاد اور بیعت تزکیہ۔ (عقد الجواہرات)

سورۃ الممتحنہ کی آیت ۱۳ میں مومنوں پر زجر کی گئی ہے، يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ اے اہل ایمان تم لوگ ان لوگوں کو اپنا دوست نہ بناؤ جن پر اللہ تعالیٰ نے اپنا غضب اور غصہ نازل کیا ہے، دشمنان خدا اور دشمنان دین کے ساتھ مودت و دوستی تعلق قائم نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں، جب اللہ ناراض ہو جائیں تو پھر دنیا اور عقبیٰ دونوں جہان برباد اور تباہ ہو جاتے ہیں، ساری زندگی کی محنت رائیگاں چلی جاتی ہے، اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے اور ہمیں اپنا خصوصی تعلق نصیب فرمائے۔

المختصر: سورۃ الممتحنہ مسلمانوں کو ایمان کی بنیاد پر تعلقات بنانے، کفار و مشرکین سے دوستی سے بچنے، مہاجر عورتوں کے ایمان کے امتحان اور اسلامی معاشرت کے اہم اصولوں کی تعلیم دیتی ہے۔ اس میں حب فی اللہ و بغض فی اللہ، عورتوں کے حقوق، اور معاشرتی تعلقات کے اسلامی اصولوں کو واضح کیا گیا ہے۔

سورۃ الممتحنہ

اغیار سے دوستانہ تعلقات

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے اور شان نزول بھی بیان کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا عَدُوِّيْ وَعَدُوَّكُمْ اَوْلِيَآءَ تُلْقُوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ وَقَدْ كَفَرُوْا بِمَا جَآءَكُمْ مِّنَ الْحَقِّ يُخْرِجُوْنَ الرَّسُوْلَ وَاِيَّاكُمْ اَنْ تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ رَبِّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ خَرَجْتُمْ جِهَادًا فِيْ سَبِيْلِيْ وَابْتِغَآءَ مَرْضَاتِيْ ۚ تُسِرُّوْنَ اِلَيْهِمْ بِالْمَوَدَّةِ ۚ وَاَنَا اَعْلَمُ بِمَآ اَخْفَيْتُمْ وَمَآ اَعْلَنْتُمْ وَمَنْ يَّفْعَلْهُ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ {۱} الممتحنة.

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! اگر تم میرے راستے میں جہاد کرنے کی خاطر اور میری خوشنودی حاصل کرنے کے لیے (گھروں سے) نکلے ہو تو میرے دشمنوں اور اپنے دشمنوں کو ایسا دوست مت بناؤ کہ ان کو محبت کے پیغام بھیجنے لگو، حالانکہ تمہارے پاس جو حق آیا ہے، انہوں نے اس کو اتنا جھٹلایا ہے کہ وہ رسول کو بھی اور تمہیں بھی صرف اس وجہ سے (مکے سے) باہر نکالتے رہے ہیں کہ تم اپنے پروردگار اللہ پر ایمان لائے ہو۔ تم ان سے خفیہ طور پر دوستی کی بات کرتے ہو، حالانکہ جو کچھ تم خفیہ طور پر کرتے ہو، اور جو کچھ علانیہ کرتے ہو، میں اس سب کو پوری طرح جانتا ہوں۔ اور تم میں سے کوئی بھی ایسا کرے، وہ راہ راست سے بھٹک گیا۔

حضرت حاطب بن ابو بلتعہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں اس سورت کی شروع کی آیتیں نازل ہوئی ہیں، واقعہ یہ ہوا کہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ مہاجرین میں سے تھے بدر کی لڑائی میں بھی آپ نے مسلمانوں کے لشکر میں شرکت کی تھی ان کے بال بچے اور مال و دولت مکہ میں ہی تھا اور یہ خود قریش سے نہ تھے صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حلیف تھے اس وجہ سے مکہ میں انہیں امن حاصل تھا۔

اب یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ مدینہ شریف میں تھے یہاں تک کہ جب اہل مکہ نے عہد توڑ دیا اور رسول اللہ ﷺ نے ان پر چڑھائی کرنا چاہی تو آپ کی خواہش یہ تھی کہ انہیں اچانک دبوچ لیں تاکہ خونریزی نہ ہونے پائے اور مکہ شریف پر قبضہ ہو جائے اسی لئے آپ نے اللہ تعالیٰ سے دعا بھی کی کہ باری تعالیٰ ہماری تیاری کی خبریں ہمارے پہنچنے تک اہل مکہ کو پہنچیں۔

ادھر آپ نے مسلمانوں کو تیاری کا حکم دیا حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر ایک خط اہل مکہ کے نام لکھا اور ایک قریشیہ عورت کے ہاتھ اسے چلتا کیا جس میں رسول اللہ ﷺ کے اس ارادے اور مسلمانوں کی لشکر کشی کی خبر موجود تھی، آپ کا ارادہ اس سے صرف یہ تھا کہ میرا کوئی احسان قریش پر رہ جائے جس کے باعث میرے بال بچے اور مال دولت محفوظ رہیں۔

چونکہ حضور ﷺ کی دعا قبول ہو چکی تھی ناممکن تھا کہ قریشیوں کو کسی ذریعہ سے بھی اس ارادے کا علم ہو جائے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو اس پوشیدہ راز سے مطلع فرما دیا اور آپ نے اس عورت کے پیچھے اپنے سوار بھیجے راستہ میں اسے روکا گیا اور خط اس سے حاصل کر لیا گیا۔

مسند احمد میں ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں مجھے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ نے بلوا کر فرمایا تم یہاں سے فوراً کوچ کر و روضہ خاخ میں جب تم پہنچو گے تو تمہیں ایک سانڈنی سوار عورت ملے گی جس کے پاس ایک خط ہے تم اسے قبضہ میں کر کے یہاں لے آؤ، ہم تینوں گھوڑوں پر سوار ہو کر بہت تیز رفتاری سے روانہ ہو گئے روضہ خاخ میں جب پہنچے تو فی الواقع ہمیں ایک سانڈنی سوار عورت دکھائی دی ہم نے اس سے کہا کہ جو خط تیرے پاس ہے وہ ہمارے حوالے کر۔

اس نے صاف انکار کر دیا کہ میرے پاس کوئی خط نہیں ہم نے کہا غلط کہتی ہے تیرے پاس یقیناً خط ہے لَتُخْرِجِنَّ الْكِتَابَ أَوْ لَنُلْقِيَنَّ الثِّيَابَ، اگر تو راضی خوشی نہ دے گی تو ہم جامہ تلاشی کر کے جبراً وہ خط تجھ سے چھینیں گے۔

اب تو وہ عورت سٹ پٹائی اور آخر اس نے اپنی چٹیا کھول کر اس میں سے وہ پرچہ نکال کر ہمارے حوالے کیا ہم اسی وقت وہاں سے واپس روانہ ہوئے اور حضور ﷺ کی خدمت میں اسے پیش کر دیا۔ یہ خط پڑھنے پر معلوم ہوا کہ حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے اسے لکھا ہے اور یہاں کی خبر رسانی کی ہے۔ حضور ﷺ کے ارادوں سے کفار مکہ کو آگاہ کیا ہے، آپ ﷺ نے کہا حاطب یہ کیا حرکت ہے؟

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ جلدی نہ کیجئے میری بھی سن لیجئے، میں قریشیوں میں ملا ہوا تھا، خود قریشیوں میں سے نہ تھا پر آپ پر ایمان لا کر آپ ﷺ کے ساتھ ہجرت کی جتنے اور مہاجرین ہیں ان سب کے قرابت دار مکہ میں موجود ہیں جو ان کے بال بچے وغیرہ مکہ میں رہ گئے ہیں وہ ان کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن میرا کوئی رشتہ دار نہیں جو میرے بچوں کی حفاظت کرے اس لئے میں نے چاہا کہ قریشیوں کے ساتھ کوئی سلوک و احسان کروں جس سے میرے بچوں کی حفاظت وہ کریں اور جس طرح اوروں کے نسب کی وجہ سے ان کا تعلق ہے میرے احسان کی وجہ سے میرا تعلق ہو جائے۔ یا رسول اللہ ﷺ میں نے کوئی کفر نہیں کیا نہ اپنے دین سے مرتد ہوا ہوں نہ اسلام کے بعد کفر سے راضی ہوا ہوں بس اس خط کی وجہ سے صرف اپنے بچوں کی حفاظت کا حیلہ تھا۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا لوگو! تم سے جو واقعہ حاطب رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں وہ بالکل حرف بہ حرف سچا ہے کہ اپنے نفع کی خاطر ایک غلطی کر بیٹھے ہیں نہ کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا یا کفار کی مدد کرنا ان کے پیش نظر ہو۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ اس موقع پر موجود تھے اور یہ واقعات آپ کے سامنے ہوئے آپ کو بہت غصہ آیا اور فرمانے لگے یا رسول اللہ ﷺ مجھے اجازت دیجئے کہ اس منافق کی گردن اڑا دوں۔

آپ ﷺ نے فرمایا إِنَّهُ قَدْ شَهِدَ بَدْرًا، مَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ اللهَ اطَّلَعَ إِلَى أَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ: اعْمَلُوا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ غَفَرْتُ لَكُمْ، تمہیں کیا معلوم نہیں؟ کہ یہ بدری صحابی ہیں اور بدر والوں

پر اللہ تعالیٰ نے جھانکا اور فرمایا جو چاہو عمل کرو میں نے تمہیں بخش دیا۔ یہ بات سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رو دیئے اور فرمانے لگے اللہ کو اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو ہی کامل علم ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرمان میں یہ بھی ہے کہ آپ نے فرمایا یہ بدر میں موجود تو ضرور تھے لیکن عہد شکنی کی اور دشمنوں میں ہماری خبر رسانی کی اور روایت میں ہے کہ یہ عورت قبیلہ مزینہ کی عورت تھی، بعض کہتے ہیں اس کا نام سارہ تھا اور دشمنوں میں ہماری خبر رسانی کی۔ یہ عورت اولاد عبد المطلب کی آزاد کردہ لونڈی تھی۔

حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے اسے کچھ دینا کیا تھا اور اس نے اپنے بالوں تلے کاغذ رکھ کر اوپر سے سر گوندھ لیا تھا آپ نے اپنے گھوڑ سواروں سے فرمادیا تھا کہ اس کے پاس حاطب کا دیا ہوا اس مضمون کا خط ہے، آسمان سے اس کی خبر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی تھی بنو ابو احمد کے خلیفہ میں یہ عورت پکڑی گئی تھی، اس عورت نے ان سے کہا تھا کہ تم منہ پھیر لو میں نکال دیتی ہوں انہوں نے منہ پھیر لیا پھر اس نے نکال کر حوالہ کیا۔

اس روایت میں حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کے جواب میں یہ بھی ہے کہ اللہ کی قسم میں اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان رکھتا ہوں کوئی تغیر تبدل میرے ایمان میں نہیں ہوا، اور اسی بارے میں اس سورت کی آیتیں حضرت ابراہیم کے قصہ کے ختم تک اتریں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس عورت کو اس کی اجرت کے دس درہم حضرت حاطب رضی اللہ عنہ نے دیئے تھے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خط کے حاصل کرنے کے لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا تھا اور حجفہ میں یہ ملی تھی۔

مطلب آیتوں کا یہ ہے کہ اے مسلمانو! مشرکین اور کفار کو جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور مومن بندوں سے لڑنے والے ہیں، جن کے دل تمہاری عداوت سے پر ہیں تمہیں ہرگز لائق نہیں کہ ان سے دوستی اور محبت میل ملاپ اور اپنایت رکھو تمہیں اس کے خلاف حکم دیا گیا ہے ارشاد ہے

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى أَوْلِيَاءَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَتَوَلَّهُمْ مِنْكُمْ فَإِنَّهُ مِنْهُمْ} (الْمَائِدَة: ۵۱) اے ایماندار و یہود و نصاریٰ سے دوستی مت گانٹھو وہ آپس میں ہی ایک دوسروں کے دوست ہیں تم میں سے جو بھی ان سے موالات و محبت کرے وہ انہی میں سے شمار ہو گا۔ اس میں کس قدر ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ ممانعت فرمائی ہے۔

دوسرے مقام پر ارشاد ہے {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَكُمْ هُزُوًا وَلَعِبًا مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ أَوْلِيَاءَ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ} [الْمَائِدَة: ۵۷) مسلمانو! ان اہل کتاب اور کفار سے دوستیاں نہ کرو جو تمہارے دین کا مذاق اڑاتے ہیں اور اسے کھیل کود سمجھ رہے ہیں اگر تم میں ایمان ہے تو ذات باری سے ڈرو۔

ایک اور مقام ارشاد ہے {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ أَتُرِيدُونَ أَنْ تَجْعَلُوا لِلَّهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَانًا مُبِينًا} (النِّسَاء: ۱۴۴) مسلمانو! مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستیاں نہ کرو کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کا کھلا الزام ثابت کر لو۔

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا {لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ فِي شَيْءٍ إِلَّا أَنْ تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقَاةً وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ} (آلِ عِمْرَان: ۲۸) مسلمانوں کو چاہیے کہ اپنوں کے علاوہ کافروں سے دوستانہ نہ کریں جو ایسا کرے گا وہ اللہ کی طرف سے کسی چیز میں نہیں ہاں بطور دفع الوقتی اور بچاؤ کے ہو تو اور بات ہے اللہ تعالیٰ تمہیں اپنے آپ سے ڈرا رہا ہے۔ اسی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت حاطب رضی اللہ عنہ کا عذر قبول فرما لیا کہ اپنے مال و اولاد کے بچاؤ کی خاطر یہ کام ان سے ہو گیا تھا۔

کافروں کی خواہش

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز آیت میں يَثْقَفُوكُمْ کا کیا مطلب ہے؟

إِن يَثْقَفُوكُمْ يَكُونُوا لَكُمْ أَعْدَاءً وَيَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ أَيْدِيَهُمْ وَأَلْسِنَتَهُم بِالسُّوءِ وَوَدُّوا لَوْ تَكْفُرُونَ{۲}الممتحنة

جواب ترجمہ: اگر تم ان کے ہاتھ آجاؤ تو وہ تمہارے دشمن بن جائیں گے اور اپنے ہاتھ اور زبانیں پھیلا پھیلا کر تمہارے ساتھ برائی کریں گے، اور ان کی خواہش یہ ہے کہ تم کافر بن جاؤ۔

اگر ان کو تم پر دسترس ہو جائے تو اظہار عداوت کرنے لگیں گے، تم پر دست درازی کریں گے اور برائی کے ساتھ تم پر زبانیں چلائیں گے وہ متمنی ہیں کہ تم کافر ہو جاؤ۔

اِنْ یثقفو کم: یعنی اگر وہ تم پر قابو پالیں گے اور فتح یاب ہو جائیں گے، قاموس میں ہے: **ثقفه بروزن منعه**۔ اس کو پالیا، لے لیا، کامیاب ہو گیا، اس پر پہنچ گیا۔

یَکُوْنُوْا لَکُمْ اَعْدَآءً: یعنی تم جو ان کو اپنی طرف سے دوستی کی پیش کش کرو گے اس سے تم کو کوئی فائدہ نہ ہو گا وہ اس پیش کش کے بعد بھی اگر قابو پالیں گے تو تمہارے دشمن ہی رہیں گے۔

یَبْسُطُوْآ اِلَیْکُمْ: تم پر دست درازی کریں گے یعنی قتل کریں گے اور ماریں گے اور زبان درازی کریں گے، گالیاں دیں گے، برا کہیں گے۔

وَوَدُّوْا لَوْ تَکْفُرُوْنَ: لَوْ تمنائی ہے۔ وَدُّوْا، اِن شرطیہ کی جزاء ہے جس کا ظہور آئندہ ہو گا۔ اِن کی وجہ سے ماضی بمعنی مستقبل ہے۔ صیغۂ ماضی استعمال کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان کی طرف سے گویا یہ فعل واقع ہو گیا اور تمہارے کافر ہو جانے کی تمنا جو وہ کریں گے وہ حاصل ہو ہی گئی۔ (تفسیر مظہری) اس میں اشارہ ہے کہ جب تم ان سے دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ گے تو ان کی دوستی صرف تمہارے ایمان کی قیمت پر ہو گی، جب تک تم کفر میں مبتلا نہ ہو جاؤ، وہ کبھی تم سے راضی نہ ہوں گے۔ (معارف القرآن)

وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم کسی طرح کافر ہو جاؤ، صحیح مومنین کے لیے یہ تمام اذیتوں سے بڑی اذیت ہے، ہر جسمانی، لسانی اور روحانی اذیت سے ان کے لئے یہ بڑی اذیت ہے، کیونکہ اس کے ذریعہ ان

کے ہاتھ سے نہایت ہی قیمتی خزانہ چلا جائے گا۔ ایمان کا خزانہ اور وہ مرتد ہو جائیں گے اور یہ ان کے ساتھ سب سے بڑی دشمنی ہو گی۔

اس خزانے کی قدر و قیمت اسی شخص کو معلوم ہے، جو کفر کے بعد مومن ہوا ہے، جس نے گمراہی کے بعد نور ہدایت دیکھا ہو اور اب وہ اپنے تصورات، اپنے افکار، اپنے شعور کے ساتھ ایمانی زندگی بسر کر رہا ہو، نہایت اطمینان کے ساتھ۔ ایسا شخص کسی صورت میں بھی اپنی سابقہ حالت کی طرف نہیں لوٹ سکتا۔ ایسا شخص کفر کو اس طرح ناپسند کرتا ہے جس طرح وہ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ اسے آگ میں ڈال دیا جائے۔ پس مومنین کا دشمن وہ ہے جو انہیں دوبارہ کفر کی جہنم میں ڈال دینا چاہتا ہے جبکہ اللہ نے ان کو توفیق دے دی ہے کہ وہ جنت ایمانی میں زندگی بسر کریں۔ یہ ایمانی زندگی کو بھرپور اور بامعنی بنا دیتا ہے جبکہ کفر کی زندگی خالی اور بے معنی ہوتی ہے۔ یوں قرآن کریم تدریج کے ساتھ بتاتا ہے کہ مسلمانوں اور اللہ کے دشمن اہل ایمان کو دوبارہ کافر بنانا چاہتے ہیں، یہ ان کی اصولی اسکیم ہے اور اسی لئے تو تم مکہ سے بھاگ نکلے ہو۔ (تفسیر ظلال القرآن)

بروز محشر رشتہ داری کام نہیں آئے گی

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

لَنْ تَنْفَعَكُمْ اَرْحَامُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ ۚ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ يَفْصِلُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ {۳} الممتحنة.

جواب ترجمہ: قیامت کے دن نہ تمہاری رشتہ داریاں ہر گز تمہارے کام آئیں گی، اور نہ تمہاری اولاد۔ اللہ ہی تمہارے درمیان فیصلہ کرے گا، اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے پوری طرح دیکھتا ہے۔

یہ آیتیں ایک قصہ کے متعلق ہیں اور وہ قصہ یہ ہے کہ جب آپ ﷺ نے فتح مکہ کے لئے جہاد کرنے کا ارادہ کیا تو حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ نے جو کہ اہل بدر سے ہیں اور رہنے والے یمن کے ہیں اور

مکہ میں آرہے تھے اور ان کے بھائی اور والدہ اور اولاد واہل عیال واموال اب بھی مکہ میں تھے اہل مکہ کے نام ایک خط لکھا کہ رسول اللہ ﷺ تم پر چڑھائی کرنے والے ہیں اور یہ خط ایک عورت کو دیدیا کہ مکہ والوں کو پہنچادے، آپ ﷺ کو وحی سے یہ بات معلوم ہوگئی، آپ نے حضرت علی اور چند صحابہ کو حکم دیا کہ فلاں جگہ وہ عورت ملے گی اس سے وہ خط لے آؤ، یہ گئے اور وہ عورت ملی، اور ان کے دھمکانے سے وہ خط اس نے دیا اور یہ لائے، آپ ﷺ نے حاطب سے پوچھا، انہوں نے کہا کہ واقعی خط میرا ہی لکھا ہوا ہے لیکن خدانہ کرے میں نے مخالفت اسلام کے سبب یہ خط نہیں لکھا، بلکہ میں جانتا تھا کہ اسلام کو اس سے کوئی ضرر نہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ اس کو ضرور غالب کرنے والا ہے، اور آپ کو ضرور فتح ہوگی، اور میرا نفع ہوجاوے گا کہ اہل مکہ اس کا احسان مان کر میرے اہل وعیال واموال کی حفاظت کریں گے اور ان کو ایذا وضرر نہ پہنچاویں گے۔ حضرت عمر کو غصہ آیا اور آپ سے ان کی گردن مارنے کی اجازت چاہی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ اہل بدر سے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کے گناہ معاف فرمادیئے ہیں، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ (تفسیر بیان القرآن للشیخ تھانوی)

اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمادی کہ جس اولاد کی خاطر، جن قریبی رشتہ داروں کی خاطر تم لوگ اللہ تعالیٰ کو ناراض کرتے ہو، لوگ جن مشرک اولادوں کی خاطر اسلام دشمنوں کو مسلمانوں کی مخبریاں کرتے ہیں جیسے حضرت حاطب بن بلتعہ نے کی تھی تو جن کو بچانے کے یہ سب کچھ کیا جارہا ہے وہ لوگ تو قیامت کے دن کچھ کام نہیں آئیں گے، بروز محشر اللہ تعالیٰ ہی تمہارے اور ان کے درمیان درست فیصلہ فرمائے گا، تم مسلمان جنت میں جاؤ گے جب کہ وہ کفار کے ہمراہ دوزخ میں جائیں گے، مدار نجات نیک اعمال اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور رضاجوئی ہے۔

ڈاکٹر اسلم صدیقی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ بات تو عمومی انداز میں فرمائی جارہی ہے لیکن اشارہ حضرت حاطب کی طرف ہی ہے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے اہل وعیال کو بچانے کے لیے قریش کو خط لکھا

تھا۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کے وسیع تر مفاد پر اپنے اہل وعیال کے مفاد کو ترجیح دی تھی۔ اس لیے ارشاد فرمایا گیا کہ جن اہل قرابت اور جس اولاد کی خاطر تم نے اتنے بڑے قصور کا ارتکاب کیا وہ اہل قرابت اور وہ اولاد تمھیں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی عدالت سے بچا نہیں سکے گی۔ کوئی شخص وہاں آگے بڑھ کر یہ کہنے کی ہمت نہیں کرے گا کہ ہمارے باپ یا ہمارے بیٹے یا ہمارے بھائی نے ہماری خاطر یہ گناہ کیا تھا، ان کو ہماری خاطر چھوڑ دیا جائے۔ وہاں ہر شخص کو اپنی پڑی ہو گی۔

سورۃ عبس میں پروردگار کا ارشاد ہے يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ، اس دن کو یاد رکھو جس دن آدمی اپنے بھائی، اپنے ماں باپ اور اپنی بیوی اور اپنے بیٹوں سے بھاگے گا۔ یعنی ہر ایک اپنے ہی حال میں ایسا گرفتار ہو گا کہ جس میں اسے کسی کا ہوش نہ ہو گا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ ہر ایک کو دوسرے سے بیگانہ کر دے گا۔ ہر شخص اپنی ذاتی حیثیت میں اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو گا اور ہر شخص کو اپنا ہی حساب دینا پڑے گا۔ اور وہاں وہی اعمال کام آئیں گے جو دنیا میں ہر شخص نے کیے اور جسے برابر اللہ تعالیٰ کی نگاہیں دیکھ رہی ہیں۔ (تفسیر روح القرآن)

اسوہ ابراہیمی

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ {۴} الممتحنة

جواب ترجمہ: تمہارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے، جب انہوں نے

اپنی قوم سے کہا تھا کہ: ہمارا تم سے اور اللہ کے سوا تم جن جن کی عبادت کرتے ہو، ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں، اور ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور بغض پیدا ہو گیا ہے جب تک تم صرف ایک اللہ پر ایمان نہ لاؤ۔ البتہ ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ ضرور کہا تھا کہ: میں آپ کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا ضرور مانگوں گا، اگرچہ اللہ کے سامنے میں آپ کو کوئی فائدہ پہنچانے کا کوئی اختیار نہیں رکھتا۔ اے ہمارے پروردگار آپ ہی پر ہم نے بھروسہ کیا ہے، اور آپ ہی کی طرف ہم رجوع ہوئے ہیں، اور آپ ہی کی طرف سب کو لوٹ کر جانا ہے۔

فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرمانبرداروں میں تمہارے لئے لائق اقتدا اسوہ ہے۔ غور کرو کہ جب وہ مبعوث ہوئے ہیں، ان کے گرد و پیش کی فضا کیسی تھی؟ کس درجہ شرک کا دور دورہ تھا، پوری قوم بت پرست تھی اور حکومت ان کی پشت پر مگر انہوں نے پوری جرات کے ساتھ کہہ دیا کہ میں تمہارے ان عقائد سے کاملاً بیزار ہوں اور اعلان توحید کے بعد اب میں تمہارا کھلا دشمن ہوں، مجھ سے کسی رعایت کی توقع نہ رکھنا۔ چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زندگی اس بات کا ثبوت ہے کہ انہوں نے کبھی باطل کے سامنے اور قوت کے مقابلہ میں اپنا سر نہیں جھکایا اور کبھی مخالفت اور عناد کی پرواہ نہیں کی۔

اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ سے غرض یہ ہے کہ تم اپنی کمزوری کے لئے اس مغفرت کی سفارش کو اپنے لئے سند نہ قرار دو کیونکہ یہ محض وعدہ کی تکمیل تھی اور اس جذبہ کا اظہار تھا کہ حضرت ابراہیم اپنی طرح اپنے باپ کو بھی مسلمان دیکھنا چاہتے تھے۔

اللہ کی محبت میں غلو: حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے عقیدتمندوں میں جو بات متبع اور اقتدا کے لائق تھی وہ یہ تھی کہ یہ لوگ صرف اللہ سے محبت رکھتے تھے اور اس محبت کے باب میں اتنا غلو تھا کہ وہ عقل و خرد کے ظاہری اکتفا کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے، جب ضرورت محسوس کرتے تھے کہ اب محبوب حقیقی کو خوش کرنے کے لئے اپنے لخت جگر کے حلقوم پر چھری پھیر دینا ضروری ہے تو ان

کو قطعاً تامل نہ ہوتا، دل میں جذبات اس درجہ ہیجان میں آئے کہ عشق الٰہی پر غالب آسکیں اور نہ ارادہ وعزم میں کوئی تزلزل پیدا ہوتا۔ ہاتھ بڑھتے اور اپنے بیٹے کے گلے پر خنجر چلا دیتے۔

یہ وہ جذبہ اطاعت ہے، جو خدا مسلمانوں میں پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جب یہ معلوم ہو جائے کہ منشائے الٰہی کیا ہے، تو پھر سوچنا گناہ ہے، اس وقت ضروری ہوتا ہے کہ منشاء کی تکمیل کے سلسلہ میں اگر عزیز ترین تعلقات کو بھی چھوڑنا پڑے تو چھوڑ دیئے جائیں۔

اس کے بعد ارشاد فرمایا، کہ اگر تم میں یہ جذبہ نہیں پیدا ہوتا ہے تو یاد رکھو، اللہ کو اس بات کی بالکل ضرورت نہیں، وہ بے نیاز ہے اور لائق صد ہزار حمد وستائش ہے، یہ ایثار و قربانی خود تمہاری تعمیر کے لئے ازبس لازمی ولابدی ہے اگر اس کو اختیار کرتے ہو، تو تمہاری زندگی جاوید سراسر کامیاب ہے اور اگر نہیں اختیار کرتے ہو تو پھر اللہ کا تم کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ (تفسیر سراج البیان)

اپنے قریبی رشتہ داروں سے، اپنے بیوی بچوں سے قطع تعلق کوئی آسان کام نہیں۔ لیکن ایمان کا تقاضا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے ہو تو ایمان کو بچانے کے لیے ماں باپ سے، بہن بھائی سے، بیوی بچوں سے بھی اگر قطع تعلق کر لینا پڑے تو ذرا نہ گھبراؤ۔ سارے رشتے توڑ دو۔ سارے بندھن کاٹ ڈالو جو تمہارے ایمان میں رخنہ اندازی کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے حضرت سیدنا ابراہیم علیہ السلام اور ان کے وفا شعار امتیوں اور ساتھیوں کی مثال پیش کی کہ دیکھو انہوں نے اپنے خداوند کریم کو راضی کرنے کے لیے کس طرح ان تعلقات کو پس پشت ڈال دیا اور کس جوش سے برملا اعلان کر دیا کہ ہمارا اور تمہارا اب کوئی تعلق نہیں رہا۔ ہمارا تمہارے معبودوں سے بھی کوئی سروکار نہیں۔ بیشک حکومت واقتدار تمہارے پاس ہے۔ جاگیریں اور زمینیں تمہارے قبضہ میں ہیں اور دولت و ثروت کے انبار تمہارے ہاں لگے ہیں۔ لیکن تمہاری حیثیت ہماری نظروں میں خس وخاشاک سے بھی کم ہے۔ ہمیں تمہاری اور تمہارے جاہ وجلال کی ذرا پروا نہیں (ضیاء القرآن)

یقیناً اس بیان کردہ ضابطہ میں اے مسلمانو! ایک بہترین نمونہ ہے ہر اس شخص کے لیے اس میں ایک عظیم سامان ہدایت و استقامت ہے جو امید رکھتا ہے اللہ کی اور قیامت کے روز کی تو بیشک ایسے لوگ ابراہیم علیہ السلام کی روش اختیار کریں گے اور ان کو اس بات کی ذرہ برابر پرواہ نہ ہو گی کہ دنیا ایسے لوگوں کو متعصب اور تنگ نظر کہے وہ دنیا کے مؤحد اعظم ہی کے نقش قدم پر چلیں گے اور اپنے ایمان و اعتقاد سے اسی بات پر یقین واعتماد رکھیں گے کہ مستقبل کی کامیابی اور عزت و عظمت کفر اور کافروں سے اعلان براءت وبیزاری ہی میں ہے۔

وقتی مفاد اور عارضی منفعت کی خاطر کافروں سے دوستی گانٹھنا کوئی اچھی بات نہیں بلکہ مسلمان قوم کے لیے مہلک اور خطرناک ہے، یہ ہے وہ ضابطہ جس پر مسلمان کی فلاح وکامیابی اور عظمت وترقی موقوف ہے جو اس نعمت کو اختیار کرے گا وہ اس نعمت سے سرفراز ہو گا اور جو شخص اس سے منہ موڑے گا وہ خود ہی کو ذلیل وناکام بنائے گا بس اللہ تو ہر حال میں بے نیاز قابل تعریف ہے اس کو نہ کسی کو اطاعت کی ضرورت ہے اور نہ کسی کی روگردانی سے اس کو کچھ نقصان ہے۔ (معارف القرآن مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ)

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک عراق میں رہے تکالیف برداشت کرتے رہے حتیٰ کہ آپ کو آگ میں پھینک دیا گیا مگر آپ کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی اور آپ توحید خداوندی پر جمے رہے۔ آپ کو سات سال تک قید وبند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں، ساری قوم دشمن ہو گئی۔ باپ نے دھکے دے کر گھر سے نکال دیا مگر آپ نے ایمان پر کبھی سودے بازی نہیں کی۔ اسی لئے اللہ نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی کو اپنے لئے نمونہ پکڑو، جب وہ عراق سے نکلے تھے تو پھر واپس نہیں گئے۔ مگر تم بیوی بچوں کی خاطر کافروں کے ساتھ دوستی کرتے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ مومن اور کافر کے درمیان کوئی قدر مشترک نہیں ہے۔ قوم برادری، رشتہ داری، وطن سب ثانوی چیزیں ہیں اور ایمان کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ (معالم العرفان للسواتی رحمہ اللہ)

ابراہیم علیہ السلام اور ان کے سچے پیروکار یہی کہتے ہیں رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا ، اے ہمارے پروردگار! ہم تیری ہی ذات پر بھروسہ کرتے ہیں کیونکہ اہل ایمان اللہ تعالیٰ کی مدد پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔ وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا اور تیری ہی طرف رجوع کرتے ہیں وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ اور سب کو تیری طرف پلٹ کر آنا ہے، یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ اگر تم نے مکہ سے ہجرت کی ہے تو ابراہیم علیہ السلام نے بھی بابل سے ہجرت کی تھی اور پھر انہوں نے کبھی اپنی قوم کی طرف رخ نہیں کیا، اب وہی کام تم بھی کرو، اب مدینہ کو ہی مستقل ٹھکانا بنالو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس وقت تک باپ کے لئے دعا کی جب تک ان پر حقیقت حال واضح نہیں تھی۔ پھر جب معلوم ہو گیا کہ اس کا خاتمہ کفر پر ہی ہو گا۔ تو پھر آپ نے بخشش کی دعا نہیں کی۔ لہٰذا تمہیں بھی چاہیے کہ اپنے مشرک والدین یا عزیز و اقارب کے لئے بخشش کی دعا نہ کرو، کہ اسوہ ابراہیمی یہی ہے۔ (معالم العرفان فی دروس القرآن)

کافروں کا تختہ مشق بننے سے پناہ کی دعا

سوال اس دعا کا ترجمہ کیجیے، نیز یہ بتائیے کہ اہل ایمان کافروں کے لیے فتنہ اور آزمائش کس طرح ہیں؟

رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلَّذِينَ كَفَرُوا وَاغْفِرْ لَنَا رَبَّنَا إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ {۵} الممتحنة

جواب ترجمہ: اے ہمارے پروردگار! ہمیں کافروں کا تختہ مشق نہ بنائیے اور ہمارے پروردگار! ہماری مغفرت فرما دیجیے۔ یقیناً آپ، اور صرف آپ کی ذات وہ ہے جس کا اقتدار بھی کامل ہے، جس کی حکمت بھی کامل۔

مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے رب! ہمیں کافروں کے لئے فتنہ نہ بنادے" ان کافروں کو ہم پر مسلط نہ کر، کہ یہ تسلط ان کافروں کے لئے فتنہ ہو جائے، وہ یہ کہیں کہ اگر مسلمان حق پر ہوتے اور ان کا ایمان ان کو بچا سکتا، تو ہم ان پر کس طرح غالب ہو جاتے۔ اور یہی شبہات ہر دور میں اہل ایمان کے

دلوں میں بھی پیدا ہوتے ہیں، جب اہل باطل اور اہل کفر اہل ایمان پر غالب ہو جاتے ہیں۔ اور باغی اور سرکش اہل ایمان پر غالب ہوتے ہیں اور اس میں بھی اللہ کی حکمت ہوتی ہے۔ اور یہ غلبہ ایک وقت کے لئے ہوتا ہے۔ مومن ان ابتلاؤں پر صبر کرتا ہے۔ لیکن ایسے حالات میں بھی اہل ایمان کو دعا کرنا چاہیے کہ وہ ان کو ایسی آزمائشوں میں نہ ڈالے۔

حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کافروں کے ہاتھ سے عذاب نہ دے۔ شیخ محمد عبدہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کو ہم پر غلبہ نہ دے، حضرت ابن عباس اس کا مطلب یہ بیان کرتے ہیں کہ کافروں کو ہم پر مسلط نہ فرمایئے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم کو کافروں کے واسطے محل آزمائش اور تختہ مشق نہ بنا۔ اور ایسے حال میں مت رکھ جس کو دیکھ کر کافر خوش ہوں، اسلام اور مسلمانوں پر آوازیں کسیں اور ہمارے مقابلہ میں اپنی حقانیت پر استدلال کرنے لگیں۔

صاحب تدبر قرآن کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو تیری توحید کی غیرت و حمیت میں ان مشرکوں سے اعلان برأت و عداوت کر دیا۔ اب ان کی طرف سے جو کچھ پیش آئے ہم اس کے لیے سینہ سپر ہیں۔ لیکن ہمارا بھروسہ تیری مدد پر ہے۔ ان کو اتنی ڈھیل نہ دینا کہ وہ ہم کو اپنے مظالم کا تختہ مشق بنالیں۔

کافروں کے لیے اہل ایمان کے فتنہ بننے کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں جن سے ہر مومن کو خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔ مثال کے طور پر اس کی ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کافر ان پر غالب آجائیں اور اپنے غلبہ کو اس بات کی دلیل قرار دیں کہ ہم حق پر ہیں اور اہل ایمان بر سر باطل، ورنہ کیسے ہو سکتا تھا کہ ان لوگوں کو خدا کی رضا حاصل ہوتی اور پھر بھی ہمیں ان پر غلبہ حاصل ہوتا۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اہل ایمان پر کافروں کا ظلم و ستم ان کی حد برداشت سے بڑھ جائے اور آخر کار وہ ان سے دب کر اپنے دین و اخلاق کا سودا کرنے پر اتر آئیں۔ یہ چیز دنیا بھر میں

مومنوں کی جگ ہنسائی کی موجب ہو گی اور کافروں کو اس سے دین اور اہل دین کی تذلیل کا موقع ملے گا۔

تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دین حق کی نمائندگی کے مقام بلند پر فائز ہونے کے باوجود اہل ایمان اس اخلاقی فضیلت سے محروم رہیں جو اس مقام کے شایان شان ہے، اور دنیا کو ان کی سیرت و کردار میں بھی وہی عیوب نظر آئیں جو جاہلیت کے معاشرے میں عام طور پر پھیلے ہوئے ہوں۔ اس سے کافروں کو یہ کہنے کا موقع ملے گا کہ اس دین میں آخر وہ کیا خوبی ہے جو اسے ہمارے کفر پر شرف عطا کرتی ہو؟ (تفہیم القرآن)

یہ بھی اوپر والی دعا کا حصہ ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے یہ دعا مانگی ہے کہ یا اللہ! ہمیں کافروں کے لیے فتنہ نہ بنا۔ یہاں فتنہ سے مراد ہدف فتنہ ہے۔ اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کافر ہم پر غالب آجائیں اور اپنے غلبہ کو اس بات کی دلیل قرار دیں کہ ہم حق پر ہیں ورنہ ہمیں غلبہ نصیب کیوں ہوتا۔

اور اس فتنہ سے مراد وہ اذیتیں اور تکلیفیں بھی ہو سکتی ہیں جو کفار مسلمانوں کو پہنچاتے ہیں۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی کہ اے ہمارے رب! کفار کا ظلم و ستم ہماری حد برداشت کے لیے چیلنج نہ بننے پائے، جس سے ہو سکتا ہے کہ ہم کبھی حوصلہ ہار دیں اور کفار کی وہ باتیں ماننے پر مجبور ہو جائیں جو ایمان کے سراسر خلاف ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ اس سے ایمان اور اہل ایمان کی رسوائی ہو گی۔ یعنی اب جبکہ ہم نے تجھ پر ایمان اور تجھ سے تعلق کو اپنی منزل بنالیا ہے تو اے ہمارے رب! ایسے حالات پیدا فرما کہ ہم اس منزل کے حصول میں کامیاب ٹھہریں، اور ہم میں ایسی کوئی کمزوری پیدا نہ ہو جو دین کی رسوائی کا باعث بنے۔ اور مزید یہ دعا مانگی کہ یقیناً ہم سے چھوٹی موٹی کمزوریاں سرزد ہوں گی تو ہماری ان کمزوریوں سے درگزر فرما۔ کیونکہ تو ہی ہر طرح کے حالات پر غالب اور تائید و نصرت میں حکمت رکھنے والا ہے۔ (روح القرآن)

اہل ایمان کے لیے اسوہ اور نمونہ

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کریں، نیز یہ بتائیے کہ اس میں کیا بیان کیا گیا؟

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْهِمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ {٦} (الحشر)

جواب ترجمہ: (مسلمانو) یقیناً تمہارے لیے ان لوگوں کے طرز عمل میں بہترین نمونہ ہے، ہر اس شخص کے لیے جو اللہ اور روز آخرت سے امید رکھتا ہو۔ اور جو شخص منہ موڑے تو (وہ یاد رکھے کہ) اللہ سب سے بے نیاز ہے، بذات خود قابل تعریف۔

ڈاکٹر اسلم صدیقی تفسیر روح القرآن میں اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یہ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ سے بدل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کے اس اعلان برأت وعداوت میں نمونہ تو بیشک نہایت بہترین ہے لیکن اس نمونہ سے فائدہ اٹھانا اور اس اسوہ کی پیروی کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ کہنے کو یہ بات آسان ہے لیکن اس پر عمل کرنے کے لیے قربانیوں کا ایک سلسلہ ہے جسے سر کرنا پڑتا ہے۔ اپنے افکار کی قربانی، قومی تشخصات کی قربانی، اعزہ واقرباء کی قربانی، زندگی بھر کے دوستوں کی قربانی، کاروبار کی قربانی، اپنے گھر اور وطن کی قربانی، ایک لامتناہی سلسلہ ہے جسے سوچتے بھی پتّہ پھٹنے لگتا ہے، اس لیے ایسے اسوہ کی پیروی صرف وہی شخص کرے گا جو اللہ تعالیٰ کی نصرت و تائید کی امید رکھتا ہو اور وہ آخرت کو دنیا پر ترجیح دے چکا ہو، دنیا کے نقصانات میں اگر اسے آخرت کی کامیابیاں نظر آتی ہوں تو وہ اسے حقیقی کامیابی سمجھتا ہو۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں اِک جان کازیاں ہے سو ایسازیاں نہیں

ہجرت کے راستے کا یہی زادراہ ہے، جو شخص اس کے علاوہ کسی اور زادراہ پر اعتماد کرتا ہے وہ چند قدم کے بعد حوصلہ ہار دیتا ہے، اس لیے جس شخص کو بھی اس اسوہ کی پیروی کا خیال پیدا ہو اسے سب

سے پہلے اپنے اندر وہ قوت پیدا کرنی چاہیے جو ان صفات میں مضمر ہے جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں۔ اقبال نے ٹھیک کہا:

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ پہلے اپنے پیکر خاکی میں جاں پیدا کرے

اور آخر میں فرمایا کہ جو اسوہ ابراہیم علیہ السلام کی پیروی سے اعراض کرے انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی پرواہ نہیں، اور نہ اسے ان سے کوئی سروکار ہے، وہ کسی کا محتاج نہیں بلکہ وہ سب سے مستغنی اور اپنی ذات میں ستودہ صفات ہے۔ اس کی حکمرانی کسی کے سہارے سے نہیں بلکہ خود اپنے بل پر قائم ہے۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ پہلے کلام کی تاکید ہے، مفسر قرآن مولانا عاشق الٰہی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ پھر دوبارہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیروکاروں کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کا حکم دیا، تاکہ بات اور پختہ ہو جائے اور خوب تاکید ہو جائے اسی لئے اس کو مصدر کی صورت میں قسم کے ساتھ ذکر کیا۔ کیونکہ یہ تاکید کا انتہائی طریقہ ہے البتہ یہاں لَكُم کی بجائے لِمَن كَانَ يَرجُوا اللّٰهَ کو لائے۔ يَرجُو اللّٰهَ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے والا ثواب مراد ہے، یا اس کا معنی يَخشَى اللّٰهَ وہ اللہ تعالیٰ سے ڈرا۔

اور اس کے معًا بعد فرمایا، وَمَنْ يَّتَوَلَّ (جو ہمارے حکم سے اعراض کرے گا۔ اور کفر سے موالات برتے گا) فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (اللہ تعالیٰ بالکل بے نیاز اور سزاوار حمد ہیں) اَلْغَنِيُّ مخلوق سے بے نیاز، اَلْحَمِيْدُ حمد کے حقدار ہیں۔ تاکید کی کوئی قسم ایسی نہیں جو یہاں ذکر نہ کر دی ہو۔ (انوار البیان)

اللہ دشمنی کو دوستی میں بدل دیتا ہے

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ کیجیے، نیز بتائیے کہ اس آیت میں کیا بیان ہے؟

عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً ۭ وَاللّٰهُ قَدِيْرٌ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۷} الحشر

جواب ترجمہ: عنقریب اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان دوستی پیدا فرمادیگا جن سے تمہاری عداوت ہے اور اللہ کو بڑی قدرت ہے اور اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔

انسان دنیا کے کسی بھی خطے میں رہتا بستا ہوا اپنے گھر والوں اور رشتہ داروں کی محبت کو دل سے نہیں نکال سکتا۔ مکہ مکرمہ سے ہجرت کے بعد ان اہل ایمان سے جو اپنا سب کچھ چھوڑ کر محض اللہ کی رضا اور رسول اللہ ﷺ کی اطاعت و محبت میں مدینہ منورہ آگئے تھے ان سے فرمایا گیا کہ تم کافر رشتہ داروں سے قطع تعلق کرلو۔ ان کے ساتھ حسن سلوک سے نہیں بلکہ قلبی محبت رکھنے کو منع فرمادیا گیا تھا۔

اہل ایمان اس حکم پر پوری طرح عمل نہایت صبر و برداشت سے کر رہے تھے لیکن ان پر کیا گزر رہی ہوگی اس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں ہے، اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تسلی دیتے ہوئے فرمایا ہے کہ یہ لوگ جو آج تمہارے دشمن بنے ہوئے ہیں بہت جلد تمہارے دوست بن جائیں گے، یہ ارشاد ایک تسلی بھی تھی اور فتح مکہ کی خوش خبری بھی چنانچہ چند ہفتے نہیں گزرے تھے کہ مکہ مکرمہ بغیر جنگ کے فتح ہوگیا اور وہی قریش مکہ اور مشرکین جو پہلے دشمن تھے انہوں نے دین اسلام کو قبول کرلیا، دشمنی دوستی میں بدل گئی۔

اسی بات کو زیر مطالعہ آیات میں ارشاد فرمایا گیا ہے۔ ارشاد ہے کہ اللہ جو ہر طرح کی قدرت رکھنے والا اور اپنے بندوں کی مغفرت کرنے والا ہے ممکن ہے کہ وہ تم میں اور ان لوگوں میں جن سے تمہاری دشمنی ہے دوستی پیدا کردے۔

اس جگہ ایک اصولی بات بھی بتائی گئی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور عدل و انصاف کرنے سے نہیں روکتا جو نہ تو تمہارے دین کے بارے میں تم سے جھگڑتے ہیں اور نہ انہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالنے میں حصہ لیا ہے۔

ان کے ساتھ عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کیا جانا چاہیے کیونکہ اللہ کو ایسے لوگ بہت پسند ہیں جو انصاف سے کام لیتے ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں کی دوستی سے منع کرتا ہے جو تمہارے دین کے بارے میں تم سے جنگ کرتے ہیں۔ جنہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا یا ان لوگوں کی مدد کی جنہوں نے تمہیں تمہارے گھروں سے نکالنے کی کوشش کی، ان جیسے لوگوں سے دوستی کرنا بڑے ظلم کی بات ہے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو وہ یقیناً ظالموں میں سے ہو گا۔ (بصیرت قرآن)

مفسر قرآن علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر کے ذیل میں اس آیت کریمہ سے متعلق بہت سی روایات پیش کی ہیں، ابن ابی حاتم نے ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ سے روایت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوسفیان بن حرب کو یمن کے ایک علاقہ پر عامل بنایا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے۔ تو وہ آرہے تھے کہ چادر لپٹے ہوئے ایک مرتد سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اس سے لڑائی کی، یہ پہلا آدمی ہے جس نے مرتد ہونے کے سبب کسی سے قتال کیا اور دین کے لیے جہاد کیا۔

ابن شہاب رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً، امید ہے کہ اللہ تمہارے اور ان لوگوں کے درمیان جو تمہارے دشمن ہیں دوستی پیدا کر دے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جس نے سب سے پہلے مرتدین کے ساتھ قتال کیا اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے وہ ابوسفیان بن حرب تھے اور اس بارے میں یہ آیت نازل ہوئی۔

حضرت سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے عَسَى اللّٰهُ أَنْ يَّجْعَلَ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ عَادَيْتُمْ مِّنْهُمْ مَّوَدَّةً، کے بارے میں روایت ہے کہ وہ محبت جو اللہ تعالیٰ نے ان کے درمیان پیدا فرمادی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ام حبیبہ بنت ابوسفیان سے نکاح کرنا ہے اس کے سبب وہ مومنین کی ماں بن گئی اور معاویہ رضی اللہ عنہ مومنین کے ماموں بن گئے۔ (ابن عساکر)

بے ضرر کافروں سے تعلقات

سوال کن لوگوں کا اکرام کیا جائے اور کن کا نہیں؟ درج ذیل آیات کا ترجمہ و تفسیر کیجیے۔

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَيْهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ {۸} اِنَّمَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قٰتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَاَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ وَظٰهَرُوْا عَلٰٓي اِخْرَاجِكُمْ اَنْ تَوَلَّوْهُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ {۹} الممتحنة.

جواب ترجمہ: اللہ تمہیں اس بات سے منع نہیں کرتا کہ جن لوگوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی، اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا، ان کے ساتھ تم کوئی نیکی کا یا انصاف کا معاملہ کرو، یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تو تمہیں اس بات سے منع کرتا ہے کہ جن لوگوں نے تمہارے ساتھ دین کے معاملے میں جنگ کی ہے، اور تمہیں اپنے گھروں سے نکالا ہے، اور تمہیں نکالنے میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے، تم ان سے دوستی رکھو۔ اور جو لوگ ان سے دوستی رکھیں گے، وہ ظالم ہیں۔

کفار اور دیگر ملتوں کے وہ لوگ جو مسلمانوں کے درمیان میں رہتے ہیں، مسلمان کسی اچھائی کے ساتھ ان کا اکرام کرسکتے ہیں، ان سے حسن سلوک کرسکتے ہیں، یہ سلسلہ اس وقت تک ہے جب تک وہ مسلمانوں کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہیں کرتے، مسلمانوں کو پریشان نہیں کرتے، مسلمانوں کو گھروں سے بے گھر نہیں کرتے، تو ان کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جائے۔

ایسے کفار اور ایسے وہ لوگ جو مسلمان تو نہیں ہیں مگر وہ مسلمانوں کو پریشان بھی نہیں کرتے، مسلمانوں سے لڑائی بھی نہیں کرتے، انہیں گھروں سے بے گھر، خانماں سے بے خانماں بھی نہیں کرتے تو ان کا اکرام کیا جاسکتا ہے۔

ان آیتوں میں دو باتوں کی وضاحت فرمائی گئی ایک تو یہ بات کہ مسلمانوں کو جن کفار سے ترک تعلق کی ہدایت کی گئی ہے اس کا تعلق ان کے کفر سے نہیں بلکہ ان کی ظالمانہ روش سے ہے۔ یعنی اسلام ان سے ترک تعلق کا حکم دیتا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ کافر ہیں اور کافر ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ اگر اسلام ایسا کوئی حکم دیتا تو یہ معاشرتی، سماجی بلکہ ریاستی زندگی کے لیے بڑی تباہی کا باعث بنتا۔ اس لیے کہ جس دین نے اپنی ریاست میں غیر مسلموں کو پناہ دی اور ایک معمولی ٹیکس کے بدلے میں نہ صرف ان کی جان و مال اور عزت کی حفاظت کی بلکہ ان کی مذہبی آزادی کو بھی باقی رکھا وہ ایسا حکم کیونکر دے سکتا تھا اور مزید یہ بات بھی اس دین کے بھیجنے والے کو خوب معلوم تھی کہ آئندہ بین الاقوامی زندگی کے طور اطوار کیا ہوں گے۔

اگر اس میں صرف مذہب کی تفریق کی وجہ سے خلیج حائل کر دی گئی تو اس کا نقصان بنیادی طور پر انسانوں کو پہنچے گا اور مذہب ایک قابل نفرت چیز ہو کر رہ جائے گی۔ اس لیے اس بات کو واضح فرمایا کہ تمہیں جن لوگوں سے ترک تعلق کا حکم دیا گیا ہے اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ انھوں نے محض دین کی وجہ سے تم سے لڑائی کی، تمہارے خون کو مباح کر دیا اور تمہارے لیے ہر زیادتی کو جائز ٹھہرایا اور پھر انھوں نے ایسے حالات پیدا کیے یا ایسے مظالم توڑے کہ تمہیں تمہارے گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ تو ایسے لوگوں کو ان کی دشمنی اور عداوت کے باعث کسی طرح بھی اپنا قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تم ان کے قریب آنے کی کوشش کرتے ہو لیکن وہ تمہیں کسی قیمت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تو عافیت اسی میں ہے کہ تم ان سے تعلقات منقطع کر دو۔

دوسری اس بات کی وضاحت فرمائی گئی ہے کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے بِر اور اقساط سے منع نہیں فرمایا۔ بِر کا معنی ہے صلۂ رحمی، احسان اور ادائے حقوق۔ اور اَقسَاط کا معنی عدل و انصاف کرنا ہے۔ یعنی جس کا جو حق واجب ہے وہ پورا پورا ادا کیا جائے اور اس میں کوئی کمی بیشی نہ کی جائے۔ کسی کافر کے سلسلے میں اسلام ان دونوں باتوں سے منع نہیں کرتا۔ بشرطیکہ کفار مسلمانوں کو برداشت کرنے کے

لیے تیار ہوں۔ وہ دشمن کافر اور غیر دشمن کافر میں فرق کرتا ہے۔ وہ ترک تعلق کا حکم دشمن کافر کے بارے میں دیتا ہے صرف کافر کے بارے میں نہیں دیتا۔ اس کی بہترین تشریح حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہا کا واقعہ ہے۔ ان کی کافر ماں صلح حدیبیہ کے بعد حضرت اسماء رضی اللہ عنہا سے ملنے کے لیے آئیں۔ حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کیا میں اپنی ماں سے مل سکتی ہوں اور کیا میں ان سے صلہ رحمی بھی کر سکتی ہوں؟

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا، ان سے صلہ رحمی کرو۔ چنانچہ وہ ان سے ملیں اور جو ان کی مدد کر سکتی تھیں ان کی مدد کی۔ مکہ میں جب قحط پھیلا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجوروں کے لدے ہوئے اونٹ بھیج کر ان کی مدد کی۔ جس علاقے سے اہل مکہ کو غلہ پہنچتا تھا جب اس علاقے کا سردار مسلمان ہو گیا تو اس نے اہل مکہ کے لیے غلہ کی ترسیل بند کر دی۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ایسا نہ کیا جائے۔ چنانچہ غلہ کی ترسیل بحال کر دی گئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان کافروں کے ساتھ نہ صرف یہ کہ ادائے حقوق اور عدل و انصاف کرنے سے روکتا نہیں بلکہ اس کا حکم دیتا ہے۔ البتہ وہ جس بات سے روکتا ہے وہ یہ ہے کہ کفار کو دوست بنایا جائے یعنی ان سے قلبی تعلق قائم کیا جائے اور ملت کے مفاد سے قطع نظر ہر معاملے میں ان کی طرف دست تعاون بڑھایا جائے جس سے اس بات کا امکان ہے کہ وہ مسلمانوں کے اجتماعی مفاد کو نقصان پہنچائیں۔ یعنی جس بات سے روکا گیا ہے وہ کفار کو دوست اور کارساز بنانا ہے نہ کہ ان کے ساتھ نیکی اور انصاف کرنا۔ (تفسیر روح القرآن للدکتور اسلم)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ سورۃ الحشر کی آیت ۹ کے ذیل میں لکھتے ہیں اس آیت میں ان کفار کا بیان ہے جو مسلمانوں کے مقابلہ میں جنگ و قتال کر رہے ہوں اور مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالنے میں کوئی حصہ لے رہے ہوں، ان کے بارے میں ارشاد یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ موالات اور دوستی سے منع فرماتا ہے، اس میں برو احسان کا معاملہ کرنے کی ممانعت نہیں، بلکہ صرف

قلبی دوستی اور دوستانہ تعلقات کی ممانعت ہے اور یہ ممانعت کچھ ان میں بر سر پیکار دشمنوں کے ساتھ نہیں بلکہ اہل ذمہ اور اہل صلح کافروں کے ساتھ بھی قلبی موالات اور دوستی جائز نہیں۔

اس سے تفسیر مظہری میں یہ مسئلہ نکالا ہے کہ حربی یعنی بر سر جنگ کفار کے ساتھ عدل و انصاف تو اسلام میں ضروری ہے ہی اور ممانعت صرف موالات یعنی دوستی کی کی گئی، برو احسان کی ممانعت نہیں کی گئی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محسنانہ سلوک بر سر پیکار دشمنوں کے ساتھ بھی جائز ہے، البتہ دوسری نصوص کی بنا پر یہ شرط ہے کہ ان کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے سے مسلمانوں کو کسی نقصان و ضرر کا خطرہ نہ ہو، جہاں یہ خطرہ ہو وہاں برو احسان ان پر جائز نہیں، ہاں عدل و انصاف ہر حال میں ہر شخص کیلئے ضروری اور واجب ہے۔ (معارف القرآن)

مؤمنات مہاجرات کے احکام

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے، نیز یہ بتایئے یہ آیات کب نازل ہوئیں؟

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ ۭ لَا هُنَّ حِلٌّ لَّهُمْ وَلَا هُمْ يَحِلُّوْنَ لَهُنَّ ۡ وَاٰتُوْهُمْ مَّآ اَنْفَقُوْا ۭ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اَنْ تَنْكِحُوْهُنَّ اِذَآ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ ۭ وَلَا تُمْسِكُوْا بِعِصَمِ الْكَوَافِرِ وَاسْـَٔـلُوْا مَآ اَنْفَقْتُمْ وَلْيَسْـَٔـلُوْا مَآ اَنْفَقُوْا ۭ ذٰلِكُمْ حُكْمُ اللّٰهِ ۭ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ {۱۰} وَاِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ اِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ مُؤْمِنُوْنَ {۱۱} الممتحنة.

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! جب تمہارے پاس عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کو جانچ لیا کرو۔ اللہ ہی ان کے ایمان کے بارے میں بہتر جانتا ہے۔ پھر جب تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ وہ

مومن عورتیں ہیں تو تم انہیں کافروں کے پاس واپس نہ بھیجنا۔ وہ ان کافروں کے لیے حلال نہیں ہیں، اور وہ کافر ان کے لیے حلال نہیں ہیں۔ اور ان کافروں نے جو کچھ (ان عورتوں پر مہر کی صورت میں) خرچ کیا ہو، وہ انہیں ادا کرو۔ اور تم پر ان عورتوں سے نکاح کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے، جب تک کہ تم نے ان کے مہر ادا نہیں کر دیے ہوں۔ اور تم کافر عورتوں کی عصمتیں اپنے قبضے میں باقی نہ رکھو، اور جو کچھ تم نے (ان کافر بیویوں پر مہر کی صورت میں) خرچ کیا تھا، وہ تم (ان کے نئے شوہروں سے) مانگ لو۔ اور انہوں نے جو کچھ (اپنی مسلمان ہو جانے والی بیویوں پر) خرچ کیا تھا، وہ (ان کے نئے مسلمان شوہروں سے) مانگ لیں۔ یہ اللہ کا فیصلہ ہے، وہی تمہارے درمیان فیصلہ کرتا ہے، اور اللہ بڑے علم والا، بڑی حکمت والا ہے۔ اور اگر تمہاری بیویوں میں سے کوئی کافروں کے پاس جا کر تمہارے ہاتھ سے نکل جائے، پھر تمہاری نوبت آئے تو جن لوگوں کی بیویاں جاتی رہی ہیں ان کو اتنی رقم ادا کر دو جتنی انہوں نے (اپنی ان بیویوں پر) خرچ کی تھی، اور اللہ سے ڈرتے رہو، جس پر تم ایمان لائے ہو۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول ہے کہ مکہ کے مشرکوں نے حدیبیہ کے سال رسول اللہ کے ساتھ صلح کا معاہدہ کیا اور شرط یہ تھی کہ مکہ سے جو شخص ان کے پاس آئے گا وہ اسے لوٹا دیں گے اور آپ کے صحابہ میں سے جو شخص اہل مکہ کے پاس آئے گا وہ اسے واپس نہیں کریں گے اس معاہدے کو تحریری شکل دی گئی اسے سر بمہر کر دیا گیا پھر سعیدہ بنت الحارث الاسلمیہ یہ تحریر لکھے جانے کے بعد آئی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ابھی حدیبیہ میں ہی تھے اس کا سامنا اپنے خاوند سے ہوا جو ابھی تک کافر تھا اس نے رسول اللہ سے کہا کہ یا رسول اللہ میری بیوی مجھے لوٹا دیجیے آپ نے یہ شرط منظور کر لی کہ آپ کے پاس ہمارا جو آدمی آئے گا اسے واپس لوٹا دیں گے یہ معاہدہ ہے اس کی سیاہی ابھی تک خشک بھی نہیں ہوئی تھی اس پر اللہ نے آیت نازل کی۔ (اسباب النزول)

اللہ تعالیٰ ان ایمان والوں سے مخاطب ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کی

اور شریعت پر عمل کیا، ان سے اللہ فرمارہے ہیں کہ جب تمہارے پاس ایمان والی عورتیں دارالکفر سے ہجرت کر کے دارالاسلام میں آئیں تو انہیں جانچ لیا کرو تا کہ ان کے ایمان کا پتہ چل سکے، اللہ تعالیٰ تو ان کے ایمان وایقان کی حقیقت جانتا ہے۔

اگر تم لوگوں کو علامات ودلائل سے یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ تو واقعی ایمان والیاں ہیں تو پھر انہیں ان کے کافر شوہروں کی طرف واپس نہ کرو، اس لیے کہ ایمان والی عورتیں کافر مردوں کے لیے حلال نہیں ہیں ایمان والی عورتیں کافروں کے نکاح میں نہیں جاسکتیں، اور نہ ہی کافر مردوں کے لیے حلال ہے کہ وہ مومن عورتوں سے نکاح کریں۔

پھر جو عورتیں مسلمان ہوئیں اور ان سے مسلمانوں نے نکاح کر لیے ہیں تو انہیں اتنا ہی مہر دینا چاہیے جتنا انہیں ان کے پہلے کافر خاوندوں نے دیا تھا، جب مسلمان انہیں مہر دے دیں تو ان کے لیے ان سے نکاح کرنے میں گناہ نہیں ہے۔

مفسر قرآن مولانا محمد آصف قاسمی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں ان آیات کو سمجھنے کے لئے بنیادی طور پر ان کے پس منظر پر نظر ڈالنا ضروری ہے۔ اصل میں صلح حدیبیہ میں جو شرائط طے کی گئی تھیں ان میں سے ایک شرط یہ تھی کہ اگر کوئی شخص مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آئے گا تو اس کو واپس کر دیا جائے گا اس کے برخلاف اگر کوئی مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ چلا جائے گا تو کفار قریش اس کو واپس کرنے کے پابند نہیں ہیں۔

یہ ایک ایسا معاہدہ تھا جس میں بظاہر عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے لیکن پے در پے کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن میں کچھ عورتوں نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کی تو ان کے متعلقین نے حضور اکرم ﷺ سے درخواست کی کہ معاہدہ کے تحت ان عورتوں کو واپس کیا جائے۔ لیکن نبی کریم ﷺ نے یہ کہہ کر ان مسلمان عورتوں کو مکہ واپس بھیجنے سے انکار کر دیا کہ یہ معاہدہ مردوں کے لئے تھا عورتوں کے لئے نہیں۔ (بصیرت قرآن)

چنانچہ مختلف روایات سے بعض خواتین کے مدینہ آنے کا ثبوت ملتا ہے جس پر یہ احکامات نازل ہوئے۔ سعیدہ بنت الحارث الاسلمیہ، ام کلثوم عمرو ابن عاص اور ام کلثوم عتبہ ابن ابی معیط ان تینوں کا ذکر ملتا ہے کہ یہ مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ آگئیں۔ سعیدہ بنت الحارث جو صفی ابن اخطب کے نکاح میں تھیں جب وہ مسلمان ہو کر مدینہ منورہ آگئیں تو ان کے شوہر صفی بھی ان کے پیچھے پیچھے مدینہ منورہ آگئے اور انہوں نے معاہدہ صلح حدیبیہ کے تحت آپ سے اپنی بیوی کی واپسی کے لئے درخواست کی تو آپ نے سعیدہ سے تمام حالات معلوم کئے اور جب آپ ﷺ کو یقین ہو گیا کہ سعیدہ نے دل سے اسلام کو قبول کر لیا ہے تب آپ نے صفی ابن اخطب سے کہا کہ ہمارا معاہدہ مردوں کے لئے تھا عورتوں کے لئے نہیں۔

اسی طرح دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ ام کلثوم عمرو ابن عاص کے نکاح میں تھیں۔ ام کلثوم نے تو اسلام قبول کر لیا تھا لیکن عمرو ابن عاص نے ابھی تک اسلام قبول نہ کیا تھا، ام کلثوم کے ساتھ دو بھائی بھی بھاگ کر مدینہ منورہ آگئے تھے، جب عمرو ابن عاص نے ان سب کی واپسی کا مطالبہ کیا تو آپ نے دونوں بھائیوں کو تو مکہ مکرمہ واپس بھیج دیا لیکن ام کلثوم کو یہ کہہ کر واپس کر دینے سے انکار کر دیا کہ یہ شرط مردوں کے لئے تھی عورتوں کے لئے نہیں۔

اگرچہ نبی کریم ﷺ نے پہلے ہی اس فیصلے کا اعلان کر دیا تھا لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کے اس فیصلے کی تصدیق فرمادی، مہر کی ادائیگی کے لئے کچھ اصولی باتیں بھی ارشاد فرمادیں۔ فرمایا کہ ① جن عورتوں نے مدینہ منورہ ہجرت کر لی ہے اور وہ مومن ہیں تو ان کے کافر شوہروں نے ان کو جو ابھی مہر ادا کیا ہو وہ ان کے شوہروں کو واپس کر دیا جائے۔ چونکہ ہجرت کرنے والی مومن عورت کا نکاح کافر شوہر سے فسخ ہو چکا ہے، اب وہ مشرک مرد پر حرام ہو چکی ہے، لہٰذا وہ عورت کسی بھی مسلمان مرد سے نکاح کر سکتی ہے۔

② مشرک اور کافر مرد اگرچہ زندہ ہو جب کسی عورت نے اسلام قبول کر لیا اور وہ مدینہ آگئی تو اس

کا نکاح ٹوٹ گیا، اس کے شوہر نے اس کو اطلاع دی ہو یا نہ دی ہو اس کو کسی مسلمان مرد سے نکاح کرنا حلال قرار دیا گیا ہے۔

③ اگر کوئی عورت مرتد ہو کر دارالحرب کی طرف لوٹ گئی ہے تو فرمایا کہ اس سے زوجیت کا تعلق قائم نہ کرو اور تم نے جو مہر دیا ہے وہ کافروں سے واپس لے لیا جائے اور جو مہر کافروں نے مسلمان ہو جانے والی عورتوں کو دیا تھا وہ مہر مسلمانوں سے واپس لے لیں۔

④ مہر کی واپسی کا حکم مہاجر عورتوں سے نہیں کیا گیا بلکہ مسلمان مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ واپس کریں، یقیناً مہر کا جو مال انہوں نے اپنی عورتوں کو دیا ہو گا وہ ختم ہو چکا ہو گا، اب اس کی واپسی کی صورت یہی ہو سکتی ہے کہ عام مسلمان اس فرض کو ادا کریں، بیت المال سے ادا کریں یا مسلمان آپس میں چندہ کر کے ادا کریں۔

ان آیات میں ایک بات یہ فرمائی گئی کہ جب کچھ عورتیں دار الحرب سے ہجرت کر کے آئیں تو ان کے حالات کو جانچ لیا جائے۔ جب تم اس بات کو اچھی طرح جان لو کہ واقعی وہ مومن ہیں تو پھر ان کو تحفظ دیدو اور کبھی ان کو کفار کے حوالے نہ کرو کیونکہ وہ عورتیں کافر و مشرک مردوں پر حلال نہیں ہیں اور نہ کافر مرد ان کے لئے حلال ہیں۔ لہٰذا ان عورتوں کا اچھی طرح امتحان لے لیا جائے۔

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے رایت ہے کہ مہاجر عورتوں سے اس بات پر حلف لیا جاتا تھا کہ ① وہ اپنے شوہروں سے کسی بغض و حسد یا نفرت کی بنا پر نہیں آئی ہیں۔ ② نہ مدینہ کے کسی آدمی کی محبت میں وہ یہاں آئی ہیں۔ ③ اور نہ وہ کسی اور دنیاوی غرض سے آئی ہیں بلکہ خالص اللہ تعالیٰ کی رضا و خوشنودی اور رسول اللہ ﷺ کی محبت و اطاعت کے جذبے سے آئی ہیں۔

جب وہ یہ حلف کر لیتیں یعنی قسم کھا لیتیں تو رسول اللہ ﷺ ان کو مدینہ منورہ میں رہنے کی اجازت عطا فرما دیتے تھے اور ان عورتوں نے اپنے کافر شوہروں سے جو مہر وصول کیا تھا وہ ان کے شوہروں کو واپس دیدیتے تھے۔ (قرطبی، بصیرت قرآن)

آخر میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہر مومن ہر آن اللہ سے ڈرتا رہے کیونکہ اس سے ڈرنا ہی سب سے بڑی نیکی ہے۔ (بصیرت قرآن)

وَإِنْ فَاتَكُمْ شَيْءٌ مِنْ أَزْوَاجِكُمْ إِلَى الْكُفَّارِ فَعَاقَبْتُمْ: عاقبتم، معاقبہ سے مشتق ہے جس کے ایک معنی انتقام اور بدلہ لینے کے بھی ہیں، یہاں یہ معنی بھی مراد ہو سکتے ہیں (کماروی عن قتادۃ و مجاہد، قرطبی بحوالہ معارف القرآن)

اس صورت میں مطلب آیت کا یہ ہو گا کہ مسلمانوں کی کچھ عورتیں اگر کفار کے قبضہ میں آجائیں تو شرط صلح کے ماتحت اوروں پر لازم تھا کہ ان کے مسلمان شوہروں کو ان کا دیا ہوا مہر وغیرہ واپس کریں جیسا کہ مسلمانوں کی طرف سے مہاجرات کے کافر شوہروں کو ان کا مہر واپس کیا گیا، لیکن جب کفار نے ایسا نہ کیا اور مسلمان عورتوں کے مہران کو ادا نہ کئے تو ان کے اس عمل کا اگر تم انتقام اور بدلہ لے لو اس طرح کہ کفار مکہ کو جو رقم مہاجرات کے مہر کی ادا کرنا تھی تم بھی وہ اپنے حق کے مطابق روک لو تو اس کا حکم یہ ہے کہ فَاٰتُوا الَّذِيْنَ ذَهَبَتْ اَزْوَاجُهُمْ مِّثْلَ مَآ اَنْفَقُوْا، یعنی تم اس رقم میں سے جو مہاجرات کے مہر کی روک لی گئی، ان مسلمان شوہروں کے خرچ کئے ہوئے مہر وغیرہ ادا کر دو جن کی عورتیں کفار مکہ کے قبضہ میں آگئی ہیں۔

دوسرے معنی عاقبتم، عقبتم، اعقبتم کے جنگ میں مال غنیمت حاصل کرنے کے بھی ہیں اور اس آیت میں لفظ عاقبتم کی یہ تینوں قراتیں بھی مختلف قراء سے منقول ہیں اور حضرت قتادہ رحمۃ اللہ علیہ و مجاہد رحمۃ اللہ علیہ سے ان تینوں لفظوں کے معنی غنیمت کے بھی منقول ہیں، اس صورت میں معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ جن مسلمان شوہروں کی عورتیں کفار کے قبضہ میں چلی گئیں اور شرط صلح کے مطابق کفار نے ان کا مہر مسلمان شوہروں کو ادا نہیں کیا پھر مسلمانوں کو مال غنیمت حاصل ہوا تو ان شوہروں کا حق مال غنیمت سے ان کو ادا کر دیا جائے (قرطبی بحوالہ معارف القرآن)

کیا مسلمانوں کی کچھ عورتیں مرتد ہو کر مکہ چلی گئی تھیں ؟اس آیت میں جس معاملے کا حکم بیان کیا گیا ہے اس کا واقعہ بعض حضرات کے نزدیک صرف ایک ہی پیش آیا تھا کہ حضرت عیاض بن غنم قریشی کی بیوی ام الحکم بنت ابی سفیان مرتد ہو کر مکہ مکرمہ چلی گئی تھی اور پھر یہ بھی اسلام کی طرف لوٹ آئی۔(معارف القرآن)

اور حضرت ابن عباس نے کل چھ عورتوں کا اسلام سے انحراف اور کفار کے ساتھ مل جانا ذکر فرمایا ہے، جن میں سے ایک تو یہی ام الحکم بنت ابی سفیان تھیں اور باقی پانچ عورتیں وہ تھیں جو ہجرت کے وقت ہی مکہ مکرمہ میں رک گئیں اور پہلے ہی سے کافر تھیں، جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی جس نے مسلم و کافرہ کے نکاح کو توڑ دیا، اس وقت بھی وہ مسلمان ہونے کے لئے تیار نہ ہوئیں، اس کے نتیجہ میں یہ بھی ان عورتوں میں شمار کی گئیں، جن کا مہر ان کے مسلمان شوہروں کو کفار مکہ کی طرف سے واپس ملنا چاہیے تھا، جب انہوں نے نہیں دیا تو رسول اللہ ﷺ نے مال غنیمت سے ان کا یہ حق ادا کیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ مدینہ سے مکہ چلے جانے اور مرتد ہونے کا تو صرف ایک ہی کا واقعہ تھا، باقی پانچ عورتیں پہلے ہی سے کفر پر تھیں اور کفر پر قائم رہنے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے نکاح سے اس آیت کی بناء پر نکل گئیں، اس لئے ان کو بھی اس ضمن میں شمار کیا گیا ہے اور ایک عورت جس کو مرتد ہو کر مکہ چلے جانا مذکور ہوا ہے یہ بھی بعد میں پھر مسلمان ہو گئیں (قرطبی) اور بغوی نے بروایت ابن عباس نقل کیا ہے کہ باقی پانچ عورتیں جو اس میں شمار کی گئی ہیں وہ بھی بعد میں مسلمان ہو گئیں (مظہری بحوالہ معارف القرآن)

مستورات سے بیعت لینے کا حکم

سوال اللہ تعالیٰ نے ایمان والی عورتوں سے بیعت کے سلسلے میں نبی کریم ﷺ کو کیا ہدایات جاری فرمائیں کہ وہ ان سے کس طرح بیعت لیں؟ ان آیات کی روشنی میں بتائیں۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَاَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ {۱۲} الممتحنة.

جواب ترجمہ: اے نبی! جب تمہارے پاس مسلمان عورتیں اس بات پر بیعت کرنے کے لیے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی بھی چیز کو شریک نہیں مانیں گی، اور چوری نہیں کریں گی، اور زنا نہیں کریں گی، اور اپنی اولاد کو قتل نہیں کریں گی، اور نہ کوئی ایسا بہتان باندھیں گی جو انہوں نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان گھڑ لیا ہو، اور نہ کسی بھلے کام میں تمہاری نافرمانی کریں گی، تو تم ان کو بیعت کر لیا کرو، اور ان کے حق میں اللہ سے مغفرت کی دعا کیا کرو، یقیناً اللہ بہت بخشنے والا، بہت مہربان ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب نبی کریم ﷺ سے فرمایا کہ وہ ایمان والی عورتوں سے اس چیز پر بیعت لیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اس کا کسی کو شریک نہیں ٹھہرائیں گی۔ اسی طرح ان سے اس بات پر بیعت لیں کہ وہ کوئی چیز چوری نہیں کریں گی، اسی طرح ان سے اس بات پر بیعت لیں کہ وہ بدکاری نہیں کریں گی، اسی طرح اس چیز پر ان سے بیعت لیں کہ وہ بچے کی پیدائش سے پہلے اور بچے کی پیدائش کے بعد اسے قتل نہیں کریں گی، اس بات پر ان سے بیعت لیں کہ وہ اپنے خاوندوں کی طرف اپنی اولاد کو منسوب نہیں کریں گی جو ان سے نہیں ہو گی، اسی طرح ان سے اس بات پر بیعت لیں کہ نبی کریم ﷺ کی نیکی کے کاموں میں دیے جانے والے احکامات کی مخالفت نہیں کریں گے۔

یہ فتح مکہ کے دن کا واقعہ ہے، جب نبی ﷺ مردوں کو بیعت کرنے سے فارغ ہو گئے تو آپ ﷺ نے عورتوں کو بیعت کرنا شروع کیا، اس وقت آپ ﷺ صفا پہاڑی پر بیٹھے ہوئے تھے اور حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس پہاڑی کے نیچے تھے، نبی ﷺ نے فرمایا: میں تم سے اس پر بیعت لیتا ہوں کہ تم

اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گی، اس وقت ابوسفیان کی بیوی ھند بنت عتبہ نقاب کیے ہوئے خواتین کے ساتھ کھڑی تھی۔

اس نے سر اٹھا کر کہا، اللہ کی قسم! آپ ہم سے اسی چیز پر بیعت لے رہے ہیں جس پر آپ ﷺ نے مردوں سے بیعت لی ہے، ہم نے آپ سے اس پر بیعت کرلی، پھر نبی ﷺ نے فرمایا: اور تم چوری بھی نہیں کرو گی، ھند نے کہا، اللہ کی قسم! میں ابوسفیان کے مال سے خرچ کرتی ہوں، مجھے نہیں معلوم کہ وہ مال میرے لئے حلال ہے یا نہیں، ابوسفیان نے کہا، ہاں! **مَا أَصَبْتِ مِنْ شَيْءٍ مَضَى أَوْ قَدْ بَقِيَ، فَهُوَ لَكِ حَلَالٌ**، اس سے پہلے تم نے میں میرا جو مال لیا ہے وہ حلال ہے اور اس کے علاوہ بھی۔

نبی ﷺ نے پوچھا، تم ھند بنت عتبہ ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! آپ میرے گزشتہ قصور معاف فرما دیں، اللہ آپ کو معاف فرمائے گا۔

آپ ﷺ نے فرمایا: اور تم زنا بھی نہیں کرو گی، ھند نے کہا، کیا آزاد عورت زنا کرتی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا **لَا وَاللهِ مَا تَزْنِي الْحُرَّةُ**، نہیں اللہ کی قسم! آزاد عورت زنا نہیں کرتی،

آپ ﷺ نے فرمایا اور تم اپنی اولاد کو قتل بھی نہیں کرو گی، ھند نے کہا، **رَبَّيْنَاهُمْ صِغَارًا فَقَتَلْتُمُوهُمْ كِبَارًا**، ہم نے اپنی اولاد کو بچپن میں پالا اور جب وہ بڑے ہوگئے تو تم نے ان کو قتل کر دیا، یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہت ہنسے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہوگئے۔ (ابن ابی حاتم)

آپ ﷺ نے فرمایا: اور نہ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے سامنے کسی پر بہتان لگاؤ گی، بہتان یہ ہے کہ عورت کسی اور کے بچے کو اپنے خاوند کی طرف منسوب کرے اور کہے کہ یہ تمہارا بچہ ہے حالانکہ وہ اس کا بچہ نہ ہو۔ ھند نے کہا، اللہ کی قسم بہتان بہت بری چیز ہے اور آپ اچھے اخلاق اور اچھی خصلتوں کا حکم دیتے ہیں۔

پھر آپ ﷺ نے فرمایا: اور تم دستور کے موافق کسی کام میں نافرمانی نہیں کرو گی، یعنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اور نبی ﷺ نے عورتوں کو نوحہ کرنے سے اور کپڑے پھاڑنے اور بال نوچنے سے منع کیا۔

اور فرمایا: تم شہر میں کسی مسافر کے ساتھ خلوت میں نہیں رہو گی اور بغیر محرم کے تین دن سے زیادہ سفر نہیں کرو گی۔ ھند نے کہا، ہم ان چیزوں میں سے کسی کی مخالفت نہیں کریں گی، تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا: آپ ان کی بیعت کر لیجیے اور اللہ سے ان کے لئے مغفرت طلب کیجیے، بیشک اللہ بہت مغفرت فرمانے والا، بے حد رحم فرمانے والا ہے۔

جب مکہ فتح ہوا تو قریش کے لوگ جوق در جوق حضور ﷺ سے بیعت کرنے کے لئے آنے لگے آپ ﷺ نے مردوں سے کوہ صفا پر خود بیعت لی، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف سے مامور فرمایا کہ وہ عورتوں سے بیعت لیں اور ان باتوں کا اقرار کرائیں جو اس آیت میں بیان ہوئی ہیں (ابن جریر) پھر مدینہ واپس لے جا کر آپ ﷺ نے ایک مکان میں انصار کی خواتین کو جمع کرنے کا حکم دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان سے بیعت لینے کے لئے بھیجا۔ (ابن جریر)

ان مواقع کے علاوہ بھی مختلف اوقات میں عورتیں فرداً فرداً بھی اور اجتماعی طور پر بھی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر بیعت کرتی رہیں۔ صحیح بخاری شریف میں ہے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا ہے جو مسلمان عورتیں آنحضرت ﷺ کے پاس ہجرت کر کے آتی تھیں ان کا امتحان اسی آیت سے ہوتا تھا جو عورت ان تمام باتوں کا اقرار کر لیتی اسے حضور ﷺ زبانی فرما دیتے کہ قَدْ بَايَعْتُكِ میں نے تم سے بیعت کی۔

حضرت عائشہ نے اس بیعت کی کیفیت بھی بیان فرمادی کہ كَلَامًا، وَلَا وَاللّٰهِ مَا مَسَّتْ يَدُهُ يَدَ امْرَأَةٍ قَطُّ فِي الْمُبَايَعَةِ، مَا يُبَايِعُهُنَّ إِلَّا بِقَوْلِهِ، آپ ﷺ کی عورتوں سے بیعت زبانی کلامی ہوا کرتی تھی، اللہ کی قسم! آپ ﷺ کے دست مبارک نے کبھی بھی کسی عورت کا ہاتھ بیعت کے دوران نہیں چھوا، آپ ﷺ ان سے بیعت کرتے تو زبانی کلامی کرتے تھے۔ (بخاری)

ترمذی، نسائی ابن ماجہ مسند احمد وغیرہ میں ہے کہ حضرت امیمہ بنت رقیقہ فرماتی ہیں کئی ایک عورتوں کے ساتھ میں بھی آنحضرت ﷺ سے بیعت کرنے کے لئے حاضر ہوئی تو قرآن کی اس آیت

کے مطابق آپ نے ہم سے عہد و پیمان لیا اور ہم بھلی باتوں میں حضور ﷺ کی نافرمانی نہ کریں گی کے اقرار کے وقت فرمایا یہ بھی کہہ لو کہ جہاں تک تمہاری طاقت ہے، ہم نے کہا اللّٰهُ وَرَسُولُهُ أَرْحَمُ بِنَا مِنْ أَنْفُسِنَا، قُلْنَا: يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَلَا تُصَافِحُنَا؟ قَالَ "إِنِّي لَا أُصَافِحُ النِّسَاءَ، إِنَّمَا قَوْلِي لِامْرَأَةٍ وَاحِدَةٍ كَقَوْلِي لِمِائَةِ امْرَأَةٍ، اللہ کو اور اس کے رسول ﷺ کو ہمارا خیال ہم سے بہت زیادہ ہے اور ان کی مہربانی بھی ہم پر خود ہماری مہربانی سے بڑھ چڑھ کر ہے پھر ہم نے کہا یا رسول اللہ! آپ ہم سے مصافحہ نہیں کرتے؟ فرمایا نہیں میں غیر عورتوں سے مصافحہ نہیں کیا کرتا میرا ایک عورت سے سے کچھ کہہ دینا یوں ہی ہے جیسا کہ میں سو عورتوں کے لیے کچھ کہوں۔

مسند احمد میں اتنی زیادتی اور بھی ہے کہ وَلَمْ يُصَافِحْ مِنَّا امْرَأَةً، ہم میں سے کسی عورت کے ساتھ حضور ﷺ نے مصافحہ نہیں کیا۔ یہ حضرت امیمہ حضرت خدیجہ کی بہن اور حضرت فاطمہ کی خالہ ہوتی تھیں۔ مسند احمد میں حضرت سلمٰی بنت قیس جو رسول اللہ ﷺ کی خالہ تھیں اور دونوں قبلوں کی طرف حضور ﷺ کے ساتھ نماز ادا کی تھی جو بنو عدی بن نجار کے قبیلہ میں سے تھیں، فرماتی ہیں انصار کی عورتوں کے ساتھ خدمت نبوی میں بیعت کرنے کے لئے میں بھی آئی تھی اور اس آیت میں جن باتوں کا ذکر ہے ان کا ہم نے اقرار کیا۔

آپ ﷺ نے فرمایا اس بات کا بھی اقرار کرو کہ اپنے خاوندوں کی خیانت اور ان کے ساتھ دھوکہ نہ کرو گی ہم نے اس کا بھی اقرار کیا بیعت کی اور جانے لگیں پھر مجھے خیال آیا اور ایک عورت کو میں نے حضور ﷺ کے پاس بھیجا کہ وہ دریافت کرلیں کہ خیانت و دھوکہ نہ کرنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا یہ کہ اس کا مال چپکے سے کسی اور کو نہ دو۔

مسند احمد کی روایت میں ہے حضرت عائشہ بنت قدامہ فرماتی ہیں میں اپنی والدہ رائطہ بنت سفیان خزاعیہ کے ساتھ حضور ﷺ سے بیعت کرنے والیوں میں تھی حضور ﷺ ان باتوں پر بیعت لے رہے تھے اور عورتیں ان کا اقرار کرتی تھیں میری والدہ کے فرمان سے میں نے بھی اقرار کیا اور بیعت

والیوں میں شامل ہوئی۔

صحیح بخاری شریف میں حضرت ام عطیہ سے منقول ہے کہ ہم نے ان باتوں پر اور اس امر پر کہ ہم کسی مرنے والے پر نوحہ نہ کریں گی حضور ﷺ سے بیعت کی اسی اثناء میں ایک عورت نے اپنا ہاتھ سمیٹ لیا اور کہا میں نوحہ کرنے سے باز رہنے پر بیعت نہیں کرتی اس لئے کہ فلاں عورت نے میرے فلاں مرنے والے پر نوحہ کرنے میں میری مدد کی ہے تو میں اس کا بدلہ ضرور اتاروں گی آنحضرت ﷺ اسے سن کر خاموش ہو رہے اور کچھ نہ فرمایا وہ چلی گئیں لیکن پھر تھوڑی ہی دیر میں واپس آئیں اور بیعت کر لی۔

بخاری کی روایت میں ہے کہ پانچ عورتوں نے اس عہد کو پورا کیا، ام سلیم، ام علاء، ابو سبرہ کی بیٹی جو حضرت معاذ کی بیوی تھیں اور دو اور عورتیں یا ابو سبرہ کی بیٹی، اور حضرت معاذ کی بیوی اور ایک عورت اور۔ نبی ﷺ عید والے دن بھی عورتوں سے اس بیعت کا معاہدہ لیا کرتے تھے، بخاری میں ہے حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ

شَهِدْتُ الصَّلَاةَ يَوْمَ الْفِطْرِ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَأَبِي بَكْرٍ وَعُمَرَ وَعُثْمَانَ، فَكُلُّهُمْ يُصَلِّيهَا قَبْلَ الْخُطْبَةِ ثُمَّ يَخْطُبُ بَعْدُ، فَنَزَلَ نَبِيُّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَكَأَنِّي أَنْظُرُ إِلَيْهِ حِينَ يُجَلِّس الرجالَ بِيَدِهِ، ثُمَّ أَقْبَلَ يَشقّهم حَتَّى أَتَى النِّسَاءَ مَعَ بِلَالٍ

رمضان کی عید کی نماز میں نے آنحضرت ﷺ کے ساتھ اور ابو بکر عمر عثمان رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ساتھ پڑھی ہے سب کے سب خطبے سے پہلے نماز پڑھتے تھے، پھر نماز کے بعد خطبہ کہتے تھے ایک مرتبہ نبی ﷺ خطبے سے اترے گویا وہ نقشہ میری نگاہ کے سامنے ہے کہ لوگوں کو بٹھایا جاتا تھا اور آپ ﷺ ان کے درمیان سے تشریف لا رہے تھے یہاں تک کہ عورتوں کے پاس آئے آپ ﷺ کے ساتھ حضرت بلال رضی اللہ عنہ تھے۔

یہاں پہنچ کر آپ نے اسی آیت کی تلاوت کی پھر آپ نے دریافت کیا کہ کیا تم اپنے اس اقرار پر ثابت قدم ہو ایک عورت نے کھڑے ہو کر جواب دیا کہ ہاں یارسول اللہ! اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہیں کسی اور نے جواب نہیں دیا۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا اچھا خیرات کرو اور حضرت بلال نے اپنا کپڑا پھیلا دیا چنانچہ عورتوں نے اس پر بے نگینہ کی اور نگینہ دار انگوٹھیاں راہ اللہ ڈال دیں۔

مسند احمد کی روایت میں حضرت امیمہ کی بیعت کے ذکر میں آیت کے علاوہ اتنا اور بھی ہے کہ نوحہ کرنا اور جاہلیت کے زمانہ کی طرح اپنا بناؤ سنگھار غیر مردوں کو نہ دکھانا۔

بخاری مسلم کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے مردوں سے بھی ایک مجلس میں فرمایا کہ مجھ سے ان باتوں پر بیعت کرو جو اس آیت میں ہیں جو شخص اس بیعت کو نبھا دے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے اور جو اس کے خلاف کر گزرے اور وہ مسلم حکومت سے پوشیدہ رہے اس کا حساب اللہ کے پاس ہے اگر چاہے بخش دے اور اگر چاہے عذاب کرے۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ عقبہ اولیٰ میں ہم بارہ شخصوں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت کی اور انہی باتوں پر جو اس آیت میں مذکور ہیں آپ نے ہم سے بیعت لی اور فرمایا اگر تم اس پر پورے اترے تو یقیناً تمہارے لئے جنت ہے، یہ واقعہ جہاد کی فرضیت سے پہلے کا ہے۔

ابن جریر کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ عورتوں سے کہیں کہ رسول اللہ ﷺ تم سے اس بات پر بیعت لیتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو ان بیعت کے لئے آنے والیوں میں حضرت ہندہ تھیں جو عقبہ بن ربیعہ کی بیٹی اور حضرت سفیان کی بیوی تھیں یہی تھیں جنہوں نے اپنے کفر کے زمانہ میں حضور ﷺ کے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا پیٹ چیر دیا تھا اس وجہ سے یہ ان عورتوں میں ایسی حالت سے آئی تھیں کہ کوئی انہیں پہچان نہ سکے۔

اس نے جب فرمان سنا تو کہنے لگی میں کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن اگر بولوں گی تو حضور ﷺ مجھے پہچان لیں گے اور اگر پہچان لیں گے تو میرے قتل کا حکم دے دیں گے میں اسی وجہ سے اس طرح آئی

ہوں کہ نہ پہچانی جاؤں مگر اور عورتیں سب خاموش رہیں اور ان کی بات اپنی زبان سے کہنے سے انکار کر دیا، آخر ان ہی کو کہنا پڑا کہ یہ ٹھیک ہے جب شرک کی ممانعت مردوں کو ہے تو عورتوں کو کیوں نہ ہو گی؟

حضور ﷺ نے ان کی طرف دیکھا لیکن آپ نے کچھ نہ فرمایا پھر حضرت عمر سے کہا ان سے کہہ دو کہ دوسری بات یہ ہے کہ یہ چوری نہ کریں اس پر ہندہ نے کہا میں ابو سفیان کی معمولی سی چیز کبھی کبھی لے لیا کرتی ہوں کیا یہ بھی چوری میں داخل ہے یا نہیں؟ اور میرے لئے یہ حلال بھی ہے یا نہیں؟

حضرت ابو سفیان بھی اسی مجلس میں موجود تھے، یہ سنتے ہی کہنے لگے میرے گھر میں جو کچھ بھی تو نے لیا ہو خواہ وہ خرچ میں آ گیا ہو یا اب بھی باقی ہو وہ سب میں تیرے لئے حلال کرتا ہوں۔

اب تو نبی ﷺ نے صاف پہچان لیا کہ یہ میرے چچا حمزہ کی قاتلہ اور اس کے کلیجے کو چبانے والی پھر اسے چبانے والی عورت ہندہ ہے، آپ انہیں پہچان کر اور ان کی یہ گفتگو دیکھ کر مسکرا دیئے اور انہیں اپنے پاس بلایا انہوں نے آ کر حضور ﷺ کا ہاتھ تھام کر معافی مانگی۔

آپ ﷺ نے فرمایا، تم وہی ہندہ ہو؟ انہوں نے کہا گزشتہ گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیئے حضور ﷺ خاموش ہو رہے ہیں اور بیعت کے سلسلہ میں پھر لگ گئے اور فرمایا تیسری بات یہ ہے کہ ان عورتوں میں سے کوئی بدکاری نہ کرے، اس پر حضرت ہندہ نے کہا کیا کوئی آزاد عورت بھی بدکاری کرتی ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا ٹھیک ہے اللہ کی قسم! آزاد عورتیں اس برے کام سے ہرگز آلودہ نہیں ہوتیں، آپ نے پھر فرمایا چوتھی بات یہ ہے کہ اپنی اولاد کو قتل نہ کریں ہندہ نے کہا آپ نے انہیں بدر کے دن قتل کیا ہے آپ جانیں اور وہ۔

آپ ﷺ نے فرمایا پانچویں بات یہ ہے کہ خود اپنی ہی طرف سے جوڑ کر بے سر پیر کا کوئی خاص بہتان نہ تراش لیں اور چھٹی بات یہ ہے کہ میری شرعی باتوں میں میری نافرمانی نہ کریں اور ساتواں عہد آپ نے ان سے یہ بھی لیا کہ وہ نوحہ نہ کریں

وَكَانَ أَهْلُ الْجَاهِلِيَّةِ يُمَزِّقْنَ الثِّيَابَ وَيَخْدِشْنَ الْوُجُوهَ، وَيُقَطِّعْنَ الشُّعُورَ، وَيَدْعُونَ بِالثُّبُورِ. وَالثُّبُورُ: الْوَيْلُ، اہل جاہلیت اپنے کسی کے مرجانے پر کپڑے پھاڑ ڈالتے تھے منہ نوچ لیتے تھے بال کٹوا دیتے تھے اور ہائے وائے کیا کرتے تھے۔ (تفسیر طبری، ابن کثیر)

مفسر قرآن علامہ ابن کثیر رحمہ اللہ نے عورتوں کی بیعت سے متعلق بہت سی روایات اپنی مایہ ناز تفسیر میں نقل فرمائی ہیں، ہندہ کے بارے میں اس روایت کو ابن کثیر کہتے ہیں کہ یہ اثر غریب ہے اور اس کے بعض حصے میں نکارت بھی ہے اس لئے کہ ابو سفیان اور ان کی بیوی ہندہ کے اسلام کے وقت انہیں حضور ﷺ کی طرف سے کوئی اندیشہ نہ تھا بلکہ اس سے بھی آپ نے صفائی اور محبت کا اظہار کر دیا تھا، واللہ اعلم

ابن ابی حاتم کی روایت میں ہے کہ جب ہندہ بیعت کرنے آئیں تو ان کے ہاتھ مردوں کی طرح سفید تھے آپ نے جب انہیں دیکھا تو فرمایا فَنَظَرَ إِلَى يَدِهَا فَقَالَ: اذْهَبِي فَغَيِّرِي يَدَكِ فَذَهَبَتْ فَغَيَّرَتْهَا بِحِنَّاءٍ، جاؤ ان کا رنگ بدل لو چنانچہ وہ گئیں پھر مہندی لگا کر حاضر ہوئیں۔

ان کے ہاتھ میں دو سونے کے کڑے تھے انہوں نے پوچھا کہ مَا تَقُولُ فِي هَذَيْنِ السُّوَارَيْنِ؟ فَقَالَ: جَمْرَتَانِ مِنْ جَمْرِ جَهَنَّمَ، ان کی نسبت کیا حکم ہے؟ فرمایا جہنم کی آگ کے دو انگارے ہیں، (یہ حکم اس وقت ہے جب ان کی زکوٰۃ نہ ادا کی جائے)

علامہ ابن کثیر اپنی تفسیر میں ایک ایسی روایت لائے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب بیعت لیتے تھے تو آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک کپڑا ہوتا تھا، جو آپ ﷺ بیعت لینے والوں کو تھما دیتے تھے، پھر بیعت لیتے تھے۔

یہ شروع شروع میں صورت بیعت کی تھی لیکن پھر اس کے بعد آپ نے یہ دستور کر رکھا تھا کہ جب بیعت کرنے کے لئے عورتیں جمع ہو جاتیں تو آپ یہ سب باتیں ان پر پیش فرماتے وہ ان کا اقرار کرتیں اور واپس لوٹ جاتیں۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان گرامی ہے کہ جو عورت ان امور پر بیعت کرنے کے لئے آئے تو اس سے بیعت لے لو کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرنا، غیر لوگوں کے مال نہ چرانا، ہاں اس عورت کو جس کا خاوند اپنی طاقت کے مطابق کھانے پینے پہننے اوڑھنے کو نہ دیتا ہو جائز ہے کہ اپنے خاند کے مال سے مطابق دستور اور بقدر اپنی حاجت کے لے گو خاوند کو اس کا علم نہ ہو اس کی دلیل حضرت ہندہ والی حدیث ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ ﷺ میرے خاوند ابو سفیان بخیل آدمی ہیں وہ مجھے اتنا خرچ نہیں دیتے جو مجھے اور میری اولادوں کو کافی ہو سکے تو کیا میں اگر ان کی بے خبری میں اور ان کے مال میں لے لوں تو مجھے جائز ہے؟

آپ ﷺ نے فرمایا خُذِی مِنْ مَالِهِ بِالْمَعْرُوفِ مَا يَكْفِيكِ وَيَكْفِي بَنِيكِ، بہ طریق معروف اس کے مال سے اتنا لے لے جو تجھے اور تیرے بال بچوں کو کفایت کرے (بخاری و مسلم)

اور زناکاری نہ کریں، جیسے اور جگہ ہے {وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا إِنَّهُ كَانَ فَاحِشَةً وَسَاءَ سَبِيلًا} (الْإِسْرَاءِ: ۳۲) زنا کے قریب نہ جاؤ وہ بے حیائی ہے اور بری راہ ہے۔

حضرت سمرہ والی حدیث میں زناکاروں کی سزا بیان کی گئی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ زناکاروں کی سزا دردناک عذاب جہنم ہے۔

مسند احمد میں ہے کہ حضرت فاطمہ بنت عقبہ جب بیعت کے لئے آئیں اور اس آیت کی تلاوت ان کے سامنے کی گئی تو انہوں نے شرم سے اپنا ہاتھ اپنے سر پر رکھ لیا آپ کو ان کی یہ حیا اچھی معلوم ہوئی۔ حضرت عائشہ نے فرمایا انہی شرطوں پر ہم سب نے بیعت کی ہے یہ سن کر انہوں نے بھی بیعت کرلی۔ اولاد کو قتل نہ کرنے کا حکم عام ہے، پیدا شدہ اولاد کو مار ڈالنا بھی اسی ممانعت میں ہے جیسے کہ جاہلیت کے زمانے والے اس خوف سے کرتے تھے کہ انہیں کہاں سے کھلائیں گے پلائیں گے، اور حمل کا گرا دینا بھی اسی ممانعت میں ہے خواہ اس طرح ہو کہ ایسے علاج کئے جائیں جس سے حمل ٹھہرے ہی نہیں یا ٹھہرے ہوئے حمل کو کسی طرح گرا دیا جائے۔ بری غرض وغیرہ سے۔

بہتان نہ باندھنے کا ایک مطلب تو حضرت ابن عباس نے یہ بیان فرمایا ہے کہ دوسرے کی اولاد کو اپنے خاوند کے سر چپکا دینا۔

ابو داؤد کی روایت میں ہے کہ ملاعنہ کی آیت کے نازل ہونے کے وقت رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

أَيُّمَا امْرَأَةٍ أدخلت عَلَى قَوْمٍ مَنْ لَيْسَ مِنْهُمْ، فَلَيْسَتْ مِنَ اللهِ فِي شَيْءٍ، وَلَنْ يُدْخِلَهَا اللهُ جَنّته، وَأَيُّمَا رَجُلٍ جَحَدَ وَلَدَهُ وَهُوَ يَنْظُرُ إِلَيْهِ، احْتَجَبَ اللهُ مِنْهُ، وَفَضَحَهُ عَلَى رُءُوسِ الْأَوَّلِينَ وَالْآخِرِينَ، جو عورت کسی قوم میں اسے داخل کرے جو اس قوم کا نہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کسی گنتی شمار میں نہیں اور جو شخص اپنی اولاد سے انکار کر جائے حالانکہ وہ اس کے سامنے موجود ہو اللہ تعالیٰ اس سے آڑ کر لے گا اور تمام اگلوں پچھلوں کے سامنے اسے رسوا و ذلیل کرے گا۔

حضور ﷺ کی نافرمانی نہ کریں یعنی آپ کے احکام بجالائیں اور آپ کے منع کئے ہوئے کاموں سے رک جایا کریں، یہ شرط یعنی معروف ہونے کی عورتوں کے لئے اللہ تعالیٰ نے لگادی ہے۔

حضرت میمون فرماتے ہیں لَمْ يَجْعَلِ اللهُ لِنَبِيِّهِ طَاعَةً إِلَّا لِمَعْرُوفٍ، اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ کی اطاعت بھی فقط معروف میں رکھی ہے اور معروف ہی طاعت ہے۔

حضرت ابن زید فرماتے ہیں أَمَرَ اللهُ بِطَاعَةِ رَسُولِهِ، وَهُوَ خِيَرَة اللهِ مِنْ خَلْقِهِ فِي الْمَعْرُوفِ، دیکھ لو کہ بہترین خلق رسول اللہ ﷺ کی فرمانبرداری کا حکم بھی معروف میں ہی ہے۔

حضرت قتادہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں ہم سے ذکر کیا گیا ہے، أَنَّ نَبِيَّ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخَذَ عَلَيْهِنَّ النِّيَاحَةَ، وَلَا تُحَدِّثْنَ الرِّجَالَ إِلَّا رَجُلًا مِنْكُنَّ مُحَرَّمًا اس بیعت والے دن آنحضور ﷺ نے عورتوں سے نوحہ نہ کرنے کا اقرار بھی لیا تھا، اس بیعت میں یہ بھی تھا کہ عورتیں غیر محرموں سے بات چیت نہ کریں۔

اس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے عرض یارسول اللہ! ﷺ بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم گھر پر موجود نہیں ہوتے اور مہمان آجاتے ہیں آپ ﷺ نے فرمایا میری مراد ان سے بات چیت کرنے کی ممانعت نہیں میں ان سے کام کی بات کرنے سے نہیں روکتا (ابن جریر) مطلب یہ ہے کہ ضرورت کے درجے میں بات کی جاسکتی ہے، بے تکلفی برتنے کی کسی لحاظ سے اجازت نہیں ہے۔

ابن ابی حاتم میں ہے کہ أَلَّا تُحَدِّثَنَ الرِّجَالَ إِلَّا أَنْ تَكُونَ ذَاتَ مَحْرَمٍ، فَإِنَّ الرَّجُلَ لَا يَزَالُ يُحَدِّثُ الْمَرْأَةَ حَتَّى يَمْذِيَ بَيْنَ فَخِذَيْهِ. نبی کریم ﷺ نے اس بیعت کے موقع پر عورتوں کو نامحرم مردوں سے باتیں کرنے سے منع فرمایا تھا اور یہ فرمایا تھا کہ بعض لوگ وہ بھی ہوتے ہیں کہ پرائی عورتوں سے باتیں کرنے میں ہی مزہ لیا کرتے ہیں یہاں تک کہ مذی ان کی رانوں کے درمیان ہی نکل جاتی ہے۔

حضرت ام سلیم جن کا نام ان عورتوں میں ہے جنہوں نے نوحہ نہ کرنے کی بیعت کو پورا کیا یہ ملحان کی بیٹی اور حضرت انس کی والدہ ہیں اور روایت میں ہے کہ جس عورت نے بدلے کے نوحے کی اجازت مانگی تھی خود حضور ﷺ نے اسے اجازت دی تھی یہی وہ معروف ہے جس میں نافرمانی منع ہے۔

بیعت کرنے والی عورتوں میں سے ایک کا بیان ہے کہ معروف میں ہم حضور ﷺ کی نافرمانی نہ کریں اس سے مطلب یہ ہے کہ مصیبت کے وقت منہ نہ نوچیں بال نہ منڈوائیں کپڑے نہ پھاڑیں ہائے وائے نہ کریں۔

ابن جریر میں حضرت ام عطیہ سے مروی ہے کہ جب حضور ﷺ ہمارے ہاں مدینہ میں تشریف لائے تو ایک دن آپ نے حکم دیا کہ سب انصاریہ عورتیں فلاں گھر میں جمع ہوں پھر حضرت عمر بن خطاب کو وہاں بھیجا آپ دروازے پر کھڑے ہوگئے اور سلام کیا ہم نے آپ کے سلام کا جواب دیا پھر فرمایا میں رسول اللہ ﷺ کا قاصد ہوں ہم نے کہا رسول اللہ کو بھی مرحبا ہو اور آپ کے قاصد کو بھی، حضرت عمر نے فرمایا مجھے حکم ہوا ہے کہ میں تمہیں حکم کروں کہ تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک نہ کرنے

پر چوری اور زناکاری سے بچنے پر بیعت کرو۔ ہم نے کہا ہم سب حاضر ہیں اور اقرار کرتی ہیں چنانچہ آپ نے وہیں باہر کھڑے کھڑے اپنا ہاتھ اندر کی طرف بڑھا دیا اور ہم نے اپنے ہاتھ اندر سے باہر اندر ہی اندر بڑھائے۔

امام تفسیر علامہ قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر میں مردوں کی بیعت میں اجمال اور عورتوں کی بیعت میں تفصیل کا نکتہ بیان فرمایا ہے کہ مردوں سے جو بیعت لی گئی وہ عموماً اسلام اور جہاد پر لی گئی ہے، عملی احکام کی تفصیل اس میں نہیں ہے، بخلاف عورتوں کی بیعت کے کہ اس میں تفصیل ہے، وجہ فرق کی یہ ہے کہ مردوں سے ایمان و اطاعت کی بیعت لینے میں یہ سب احکام داخل تھے، اس لئے تفصیل کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور عورتیں عموماً عقل و فہم میں مردوں سے کم ہوتی ہیں اس لئے ان کی بیعت میں تفصیل مناسب سمجھی گئی، یہ اس بیعت کی ابتداء ہے جو عورتوں سے شروع ہوئی مگر آگے یہ عورتوں کے ساتھ مخصوص نہیں رہی، مردوں سے بھی انہی چیزوں کی بیعت لینا روایات حدیث میں ثابت ہے۔ (کماروی عن عبادۃ بن الصامت) (قرطبی)

بیعت کی اقسام: مفسر قرآن حضرت مولانا صوفی عبد الحمید سواتی رحمہ اللہ کے دروس قرآن میں بیعت سے متعلق عمدہ مضمون بیان کیا گیا ہے۔ حضرت فرماتے ہیں، بیعت کی بہت سی قسمیں ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں ایک بیعت اسلام کہلاتی تھی۔ یہ وہ بیعت تھی جو کوئی شخص کوئی غیر مذہب چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونا چاہتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد بیعت خلافت ہوئی تھی، اس کے ذریعے لوگ احکام الٰہی کی انجام دہی اور خلیفہ کی پیروی کا اقرار کرتے تھے، ہر خلیفہ کے انتخاب پر یہ بیعت ہوتی رہی۔ اس کے علاوہ ایک بیعت بیعت ہجرت ہوتی تھی جس کے ذریعے لوگ اقرار کرتے تھے کہ وہ اللہ کے راستے ہیں ہجرت کریں گے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارکہ میں جہاد کے لئے بھی بیعت ہوتی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے تقویٰ اور سنت کی اتباع کی بیعت بھی ثابت ہے۔ اسی طرح ارکان اسلام کی پابندی کرنے کے لئے بیعت بھی نبی

علیہ السلام سے ثابت ہے۔ بعض آدمیوں سے بتکرار بیعت بھی ثابت ہے۔

حدیبیہ کے مقام پر آپ سے تین دفعہ بیعت لی گئی اور یہ بیعت بھی درست ہے کہ کوئی اقرار کرے کہ میں سنت کا اتباع اور بدعت سے اجتناب کروں گا۔ حضور ﷺ نے بعض عورتوں سے جو بیعت لی تھی اس میں یہ وعدہ بھی شامل تھا ان لا تنحن کہ وہ نوحہ نہیں کریں گی، یعنی کسی کی موت پر نہ بین کریں گی، نہ کپڑے پھاڑیں گی اور نہ چہرہ نوچیں گی۔

حضور ﷺ نے بعض فقرا مہاجرین سے یہ بیعت بھی لی تھی ان لا یسئلوا احداً یعنی وہ کسی سے سوال نہیں کریں گے۔ چنانچہ بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس قدر محتاط ہو گئے تھے کہ سواری پر سوار ہو کر جاتے وقت اگر ہاتھ سے چھڑی وغیرہ گر پڑتی تو کسی کو پکڑانے کے لئے نہیں کہتے تھے، بلکہ خود سواری سے نیچے اتر کر پکڑتے تھے۔

حضرت جریر بن عبد اللہ بجلی رضی اللہ عنہ نے حضور ﷺ سے اس بات پر بیعت کی تھی کہ میں نماز کی پابندی کروں گا زکوٰۃ احتیاط سے ادا کروں گا وَالنُّصْحُ لِكُلِّ مُسلِمٍ اور ہر مسلمان بھائی کے ساتھ غیر خواہی کا سلوک کروں گا۔ (معالم العرفان)

احادیث مبارکہ سے ثابت ہے کہ بعض لوگوں نے اس عہد پر بیعت کی اَن لَّا یَخَافُوا لَومَةَ لَائِمٍ یعنی وہ اللہ کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خوف نہیں کھائیں گے و ان یَقُولُو الحَقَّ اَینَ مَا کَانُوا اور وہ جہاں کہیں بھی ہوں گے سچی بات ہی کریں گے، خواہ اس کے لئے کتنا بھی خطرہ مول لینا پڑے۔ ایسے لوگ بڑے سے بڑے جابر کے سامنے بھی کلمہ حق کہنے سے دریغ نہیں کرتے۔

بیعت کی ایک قسم بیعت توبہ بھی ہے، اگر کوئی شخص کسی گناہ میں ملوث ہو جاتا ہے اور پھر وہ کسی مرشد برحق کے پاس جا کر اقرار کرتا ہے کہ میں اپنے کردہ گناہ سے توبہ کرتا ہوں اور آئندہ ایسا نہیں کروں گا۔ تو یہ بھی درست ہے۔ بہت سے لوگ یہ بیعت بھی کرتے ہیں جس سے انہیں فائدہ ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ایک بیعت بیعت شرک بھی ہے، بعض لوگ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کرتے تھے کہ حضور! ان کو بیعت کر لیں، آپ علیہ السلام ان کے سر پر دست شفقت پھیر دیتے تھے اور بعض سے تبرکاً بیعت بھی لے لیتے تھے۔

حضرت عبد اللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے بارے میں آتا ہے کہ ان کے والدین نے ان کو سات آٹھ سال کی عمر میں حضور ﷺ کی خدمت میں پیش کیا تو آپ نے برکت کے لئے ان سے بیعت لی۔ اس قسم کی بیعت بھی حضور ﷺ سے ثابت ہے۔ بعض بزرگان دین کے سلسلے میں شامل ہونے کے لئے بھی بیعت کی جاتی ہے۔ (معالم)

شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ نے بیعت کی چار قسمیں بیان کی ہیں۔ فرماتے ہیں کہ ایک بیعت وسیلہ ہے جو کسی سلسلہ میں منسلک ہونے کے لئے کی جاتی ہے۔

دوسری قسم کی بیعت، احکام شریعت کی پابندی اختیار کرنے کے لئے ہوتی ہے۔ تیسری قسم کی بیعت یہ ہے کہ انسان اوراد و وظائف پر پابندی اختیار کرنے کے لئے بیعت طریقت کرتا ہے۔ اور اگر انسان صاحب ہمت ہو، محنت کر سکتا ہو تو وہ مشاہدات حاصل کرنے کے لئے چوتھی قسم کی بیعت بیعت حقیقت کرتا ہے۔

مرشد کامل کے اوصاف: شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے علاوہ کوئی انسان تربیت کے بغیر خود بخود درجہ کمال تک نہیں پہنچ سکتا۔ مذکورہ تربیت اصولاً درست ہے اور اس کی بہت سی قسمیں ہیں مگر اس کے ساتھ شرائط بھی ہیں جن کا پایا جانا مرشد کامل میں ضروری ہے۔ چنانچہ بیعت اس شخص کی کرنی چاہیے جس میں یہ اوصاف پائے جائیں۔

فرماتے ہیں کہ مرشد کامل کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ وہ کتاب اللہ اور سنت رسول کا علم رکھتا ہو۔ اس نے استاذ سے تعلیم حاصل کی ہو، اور اگر یہ نوبت نہیں آئی تو کم از کم اہل علم کے پاس بیٹھ کر اور ان سے سن کر کتاب و سنت کا علم حاصل کیا ہو، اگر کسی نے ان میں سے کسی ذریعہ سے بھی علم

حاصل نہیں کیا تو اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا درست نہیں۔

فرماتے ہیں کہ دوسری شرط یہ ہے کہ بیعت کنندہ میں عدالت اور تقویٰ پائے جائیں یعنی وہ فاسق نہ ہو، تقویٰ کے خلاف کوئی کام نہ کرتا ہو۔ کبائر (بڑے گناہ) سے اجتناب کرتا ہو اور صغائر (چھوٹے گناہوں) پر مصر نہ ہو۔

تیسری شرط یہ ہے کہ بیعت کرنے والا آخرت میں رغبت رکھتا ہو اور دنیا سے بے رغبت ہو، اس کے بغیر وہ بیعت کے قابل نہیں۔ پھر فرماتے ہیں کہ چوتھی شرط یہ ہے کہ وہ شخص امر بالمعروف (نیکی کا حکم) اور نہی عن المنکر (برائی سے منع) کرتا ہو۔

اور پانچویں شرط یہ ہے کہ اس نے یہ طریقہ مشائخ اور بزرگوں سے سیکھا ہو، نہ کہ خود بخود پیر بن کر بیٹھ گیا ہو۔ یہ پانچ شرائط ہیں۔ اگر یہ کسی شخص میں پائی جائیں تو اس کے ہاتھ پر بیعت کرنا درست ہے البتہ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ اس قسم کی بیعت کو سنت کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی وجہ سے معصیت سے بچاؤ ہو گا اور ترقی جلدی نصیب ہو جائے گی۔ بایں ہمہ یہ بیعت کوئی فرض یا واجب نہیں ہے۔

بعض لوگ ظاہری شکل و صورت سے تو اچھے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ مگر وہ حقیقت سے خالی ہوتے ہیں۔ علامہ جلال الدین رومی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایسے ہی لوگوں کے متعلق کہا ہے

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست پس بہر دستے نہ باید داد دست

بعض لوگ انسان نما شیطان ہوتے ہیں لہٰذا بلا سوچے سمجھے ہر کسی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ نہیں دیا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے کہ بیعت کنندہ میں مذکورہ بالا شرائط پائی جاتی ہیں یا نہیں۔ ایسے بیعت کنندہ سے اجتناب کرنا چاہیے جو محض رسومات باطلہ اور بدعات انجام دینے کی تلقین کرتا ہو۔ (معالم العرفان)

ناقابل بیعت پیر: آج تو انحطاط کا زمانہ ہے۔ نویں صدی کے بزرگ خواجہ عبد القدوس گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مکتوبات میں اپنے دور کا شکوہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ہیہات ہیہات امروز بدروزما است کہ

جہاں از پیری و مریدی پر شدہ و ہیچ خبر مسلمانی نیست، افسوس! آج ہمارا زمانہ کتنا برا ہے کہ جہان پیری مریدی سے بھرا ہوا ہے مگر مسلمانی کی کسی کو خبر نہیں۔

کوئی نہیں جانتا کہ ایمان، اسلام اور دین کیا ہے؟ ایک اور جگہ فرماتے ہیں کہ افسوس! آج ہماری بدنصیبی کا یہ عالم ہے کہ پیری مریدی بت پرستی اور خود پرستی بن چکی ہے اور درویشی لقمہ فروشی کا نام بنا ہوا ہے۔ ہم بدنصیب لوگ دعا کریں گے کہ خدا تعالیٰ ایسی درویشی اور دین فروشی سے توبہ کی توفیق دے، اول بار مسلمانی درست کنیم بعدہ درویشی، یعنی پہلے ہم اسلام اور مسلمانی تو درست کرلیں، درویشی اور پیری مریدی تو بعد کی بات ہے۔

اس وقت جتنی گدیاں اور پیر ہیں ان میں سے اکثر خلاف شرع کام کرتے ہیں فاسق، فاجر ہیں، شرکیہ اور بدعتیہ رسوم انجام دیتے ہیں اور دوسروں کو اس کی تلقین کرتے ہیں۔ ایسے لوگ قطعاً بیعت کے لائق نہیں۔ ان سے بیعت کرنے میں فائدے کی بجائے الٹا نقصان ہوگا۔ (معالم العرفان للسواتی)

علامہ ابن جوزی رحمۃ اللہ اپنی تفسیر زادالمسیر میں رقم فرماتے ہیں کہ جن عورتوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت فرمائی تھی ان کی تعداد چار سو ستاون ہے، جسے ہم نے اپنی کتاب تلقیح میں جمع کیا ہے۔ (زادالمسیر فی علم التفسیر لابن الجوزی)

مفسر قرآن مولانا محمد احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیعت بیع سے مشتق ہے جس کے معنی فروخت کرنے کے ہیں، اصطلاح شریعت میں اپنی رضا و رغبت کے ساتھ اپنے جان اور مال کو خداوند ذوالجلال کے ہاتھ بمعاوضہ جنت فروخت کر دینے کا نام "بیعت" ہے، تو گویا اس معاملہ بیعت میں انسان بائع یعنی فروخت کرنے والا ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ مشتری یعنی خرید کرنے والے ہیں جو چیز کہ فروخت کی جاتی ہے وہ انسان کی اپنی جان ہے اور جس قیمت اور معاوضہ پر یہ خرید فروخت کی جاتی ہے وہ جنت ہے۔

تمام عقلا کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ بیع ہو جانے کے بعد جو چیز فروخت کی جاتی ہے وہ بائع یعنی بیچنے والے کی ملک سے نکل کر مشتری یعنی خریدار کی ملک میں داخل ہو جاتی ہے اور مشتری ہی تمام

تصرفات کا مالک ہو جاتا ہے، اسی طرح مومن بیعت کر لینے کے بعد اپنے نفس کا مالک نہیں رہتا اس لئے مومن کو چاہیے کہ اب نفس میں اپنی رائے سے اور اپنی خواہش سے کوئی تصرف نہ کرے۔

مگر یہ معاملہ بیعت حق جل وعلا سے براہ راست نہیں ہوتا۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کے وارثین کے توسط سے ہوتا ہے حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے جب حضور اقدس نبی مکرم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کی اصل بیعت اللہ تبارک وتعالیٰ سے تھی اور حضور اقدس نبی مکرم حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم درمیان میں وکیل اور کفیل تھے جیسا کہ حق تعالیٰ کا ارشاد ۲۶ ویں پارہ سورۃ فتح میں ہے، إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ، تحقیق جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ حقیقت میں اللہ تبارک وتعالیٰ سے بیعت کرتے ہیں۔ اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں کے اوپر ہے جن حضرات نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم) کے ہاتھ پر بیعت کی اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا جیسا کہ سورۃ فتح میں فرمایا گیا لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ، بیشک اللہ خوش ہوا ان مسلمانوں سے جب کہ وہ آپ سے بیعت کر رہے تھے۔

اور سورۃ توبہ میں بیعت کو فوز عظیم فرمایا جیسا کہ ارشاد ہے فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُمْ بِهِ وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ، سو تم خوشی مناؤ اپنی بیع پر جس کا تم نے سودا کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیعت لینا کبھی اسلام پر ہوتا تھا، اور کبھی ہجرت پر اور کبھی جہاد پر اور کبھی ترک منکرات پر۔ (درس قرآن محمد احمد)

سلسلہ بیعت میں جہاں کسی مرشد سے کسب فیض کیا جاتا ہے، ان سے تزکیہ کروایا جاتا ہے، سلوک کی راہیں طے کی جاتی ہیں وہاں آج کے دور میں کچھ نقائص اور خرابیاں بھی پائی جاتی ہیں جنہیں عارفان باللہ ساتھ ساتھ دور بھی کرتے رہتے ہیں مگر بہت سے لوگ ان خامیوں اور نقائص پر چشم پوشی کرتے ہیں اس ڈر اور خوف کی وجہ سے کہ کہیں میری نوک جھونک سے مرید ناراض ہی نہ ہو جائے، کہیں میرے ارادت مندوں کی تعداد کم نہ ہو جائے۔

اب تو اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے راہ طریقت کے علمبر داروں کی خواہش ارادت مندوں اور مریدوں کی تعداد بڑھانا ہی رہ گئی ہے، اب کہیں خال خال ہی وہ لوگ دکھائی اور سنائی دے رہے ہیں جو محض اللہ کی رضا کے لیے مخلوق کو دنیوی الجھیڑوں سے بچا کر تقویٰ اور طہارت کی زندگی اختیار کرنے پر تیار کرتے ہیں۔

مفسر قرآن مولانا محمد حنیف ندوی رحمۃ اللہ علیہ انہی خرابیوں اور نقائص کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں بیعت کا شتقاق بیع سے ہے۔ جس کے معنیٰ یہ ہیں۔ کہ مرید شیخ کے ہاتھوں بک جاتا ہے۔ اور اس کو پھر اختیار حاصل نہیں رہتا کہ وہ اس کے احکام کو سن کر ٹال اور جھجک کا اظہار کرے، اس کا فرض ہے کہ وہ ہمہ اطاعت وانقیاد بن جائے۔ اور پند، دلیل وحجت سبل کے لئے ارشاد کے لئے آمادہ ہو جائے۔ مگر یہاں چند غلط فہمیاں ہیں، جس کا دور ہونا ضروری ہے، یہ خیال کہ شیخ معصوم ہے۔ اور بقول حافظ کے رنگین کن گرت پیر مغاں گوید

غیر مشروط اطاعت کا مستحق ہے، حالانکہ اسلامی نگاہ سے ایسی بیعت ناجائز ہے لَاطَاعَةَ لِمَخلُوقٍ فِي مَعصِيَةِ الخَالِقِ حدیث ہے، جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ کوئی شخص اس قابل نہیں ہے کہ اس کی بلاشرط اطاعت کی جائے۔ پیغمبر کے بعد ہر آدمی باوجود ولایت اور زہد کے ہر آن لغزش وسہو کا شکار ہو سکتا ہے، اس لئے بیعت کے معنیٰ یہ قرار پائے کہ وہ اطاعت جو شریعت کے مطابق ہو۔

اور اس صورت میں پھر اس کی مخالفت محض ہوائے نفس کے تقاضے سے درست نہیں ہے، مرید کا فرض ہے کہ جب اس کو یقین ہو جائے کہ شیخ کا حکم منشاء الٰہی کے عین مطابق ہے، تو پھر اطاعت میں سرگرمی کے ساتھ مصروف ہو جائے اور اس کے انجام اور وجوہ واسباب پر غور نہ کرے۔

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ بیعت کے لئے ایک پیشہ ور گروہ کو متعین کر لیا گیا ہے اور سمجھ لیا گیا ہے کہ علم وعمل سے یہ عاری طبقہ محض اس لئے عقیدت ونیاز مندی کا استحقاق رکھتا ہے کہ آباؤ اجداد سے ان کا پیشہ مرید کرنا ہے، حالانکہ شیخ کے انتخاب کے لئے یہ قطعاً ضروری نہیں ہے، کیونکہ یہ کوئی

پیشہ یا فن نہیں ہے، بلکہ ہر وہ مرد مسلمان جو علم و عمل کے زیور سے آراستہ ہے، اس قابل ہے کہ آپ اس سے محبت رکھیں اور اس کے سامنے اپنی روحانی کمزوریاں بیان کریں اور پھر اس سے مداوا چاہیں۔

تیسرا مغالطہ یہ ہے کہ شیخ کو روحانی خاوند سمجھ لیا جاتا ہے۔ اور ایک شیخ کا مرید دوسرے صلحاء کے ساتھ اپنے دل میں بغض و عناد رکھتا ہے اور یہ سمجھتا ہے۔ کہ اب یہ بیعت کا سلسلہ منقطع نہیں ہو سکتا۔ اور ایک کے رابطہ عقیدت کو گلے میں ڈال لینے کے معنیٰ یہ ہیں کہ اب کسی دوسرے کی روحانیت سے استفادہ نہیں کیا جا سکتا چاہے وہ رتبہ میں اس سے بڑا کیوں نہ ہو، یہ اسلامی بیعت نہیں ہے، اسلامی زاویہ نگاہ سے متعدد شیوخ سے فیوض عمل کا استفادہ ہو سکتا ہے اور ایک مرید بیک وقت مختلف صلحاء سے عقیدت رکھ سکتا ہے۔

چوتھا مغالطہ یہ ہے کہ بیعت کی غرض و غایت یہ نہیں سمجھی جاتی کہ تزکیہ قلب ہو اور اعمال صالحہ سے محبت اور ذوق پیدا ہو بلکہ بیعت اس لئے کی جاتی ہے تاکہ شیخ سے کشائش رزق کے کچھ وظیفے معلوم ہو جائیں، یا دست غیب پر اختیار حاصل ہو جائے اور یا حب و بغض کے تعویذ حاصل کرنے میں سہولت رہے۔

حالانکہ بیعت کے معنیٰ یہ تھے کہ ایک صالح آدمی ایک صالح تر آدمی کے سامنے عہد کرتا ہے کہ وہ اس کی نیک باتوں کی اقتداء کرے گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرے گا کہ کیونکر زندگی کو خوش گوار اور کامیاب بنایا جا سکتا ہے۔

آج بیعت نام ہے جہالت کے جمود و تسفل کا۔ اندھی تقلید اور اقتداء کا اور غیر مشروع طریقوں کو رواج دینے کا، حالانکہ حضور ﷺ نے جو بیعت لی تھی، وہ زندگی کی بیعت تھی، جہاد اور ایثار نفس کی بیعت تھی۔

اسی طرح ان آیتوں میں جس بیعت کا ذکر ہے، وہ قطعاً ایک اخلاقی معاہدہ ہے۔ مکارم و فضائل کا اکتساب ہے اور پاکبازی اور پاک خیالی کا اقرار ہے، اس بیعت میں ان باتوں کا کہیں مذکور نہیں، جن کو

ہم اپنی جہالت کی وجہ سے لازمہ بیعت سمجھتے ہیں اور جن کا ترک ہم کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتا ہے۔(تفسیر سراج البیان)

حکیم الامت الشاہ محمد اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے اصلاحی رسالہ تعلیم الدین میں ارشاد فرماتے ہیں کہ عادۃ اللہ یونہی جاری ہے کہ کوئی کمال مقصود بدون استاذ کے حاصل نہیں ہوتا تو جب اس راہ میں آنے کی توفیق ہو، استاذ طریق کو ضرور تلاش کرنا چاہیے، جس کے فیض تعلیم و برکت صحبت سے مقصود حقیقی تک پہنچے

گر ہوائے ایں سفر داری دلا دامن رہبر بگیر و پس بر آ
در ارادت باش صادق اے فرید تا بیابی گنج عرفان را کلید
بے رفیقے ہر کہ شد در راہ عشق عمر بگزشت و نشد آ گاہ عشق

ترجمہ: اے دل! اگر اس (روحانی) سفر کی خواہش رکھتے ہو تو رہبر کا دامن مضبوطی سے تھام لو اور پھر آگے بڑھو۔ اے فرید! طلب اور ارادت میں سچا بن جا، تا کہ تجھے معرفت کے خزانے کی کنجی نصیب ہو جائے، جو کوئی عشق کی راہ میں بغیر رفیق کے چل پڑا، اس کی عمر گزر گئی مگر وہ عشق کے راز سے آگاہ نہ ہو سکا۔

اس زمانے میں جب کہ شعبدہ بازیاں عام ہیں، کرتب دکھا کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے، ہر طرح کا مال مارکیٹ و بازار میں دستیاب ہے، اصلی مال کو ایک نمبر مال کہا جاتا ہے، جبکہ جعلی اور نقلی مال کو دو نمبر سے لے کر دس نمبر تک بتایا جاتا ہے، بعض اوقات ایک اور دس نمبر کا مال ایک ہی جگہ رکھا ہوا ہو تو دس نمبر والے مال کی طرف نگاہ جلد مرکوز ہو جاتی ہے، ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ لیا جاتا ہے، حالانکہ عارفین کہتے ہیں کہ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی، پیری مریدی کی راہ میں اب کھرے کھوٹے کی تمیز کرنا مشکل دکھائی دیتا ہے، ایسے میں حکیم الامت، نباض ملت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ نے شیخ کامل کی پانچ علامات نقل فرمائی ہیں، جن سے کھرے کھوٹے کی تمیز کی جاسکتی ہے

اول: علم شریعت سے بقدر ضرورت واقف ہو، خواہ تحصیل سے یا صحبت علماء سے تا کہ فساد عقائد واعمال سے محفوظ رہے اور طالبین کو بھی محفوظ رکھ سکے ورنہ مصداق "اوخویشتن گم ست کرا رہبری کند" کا ہو گا، (وہ اپنے حال سے گم ہے تو دوسروں کی راہنمائی کیونکر کر سکتا ہے)

دوم: متقی ہو یعنی ارتکاب کبائر واصرار علی الصغائر سے بچتا ہو۔

سوم: تارک دنیا، راغب آخرت ہو، ظاہری وباطنی طاعات پر مداومت رکھتا ہو ورنہ طالب کے قلب پر برا اثر پڑے گا۔

چہارم: مریدوں کا خیال رکھے کہ کوئی امر ان سے خلاف شریعت وطریقت ہو جائے تو ان کو متنبہ کرے۔

پنجم: یہ کہ بزرگوں کی صحبت اٹھائی ہو، ان سے فیوض وبرکات حاصل کیے ہوں اور یہ ضروری نہیں کہ اس سے کرامات وخوارق بھی ظاہر ہوتے ہوں، نہ یہ ضروری ہے کہ تارک کسب ہو، دنیا کا حریص وطامع نہ ہو، اتنا کافی ہے۔ (قول جمیل، تعلیم الدین، مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ)

مغضوب علیہم لوگوں سے دوستی کی ممانعت

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَوَلَّوْا قَوْمًا غَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ قَدْ يَئِسُوْا مِنَ الْاٰخِرَةِ كَمَا يَئِسَ الْكُفَّارُ مِنْ اَصْحٰبِ الْقُبُوْرِ {۱۳} الممتحنه

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! ان لوگوں کو دوست نہ بناؤ جن پر اللہ نے غضب فرمایا ہے۔ وہ آخرت سے اسی طرح مایوس ہو چکے ہیں جیسے کافر لوگ قبروں میں مدفون لوگوں سے مایوس ہیں۔

آیت کچھ مسلمان فقراء کے متعلق نازل ہوئی یہ مسلمانوں کی خبریں یہود تک پہنچاتے اور ان سے اس طرح سے تعلق قائم کر کے ان سے منافع حاصل کرتے اللہ تعالیٰ نے انہیں اس سے منع فرمایا۔

(اسباب النزول) بعض روایات میں آتا ہے کہ اس قوم سے مراد یہودی ہیں، جن پر اللہ کا غضب ہوا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ دی گئی ہے کہ قرآن کریم میں کئی جگہ اس قوم کے لئے یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں، لیکن یہ آیت عام بھی ہو سکتی ہے کہ اس کے مفہوم میں وہ لوگ بھی آجائیں جو مشرکین ہیں اور جن کا تذکرہ اس پوری سورت میں ہوا ہے اور اللہ کے تمام دشمن اس سے مراد ہوں۔ کیونکہ اللہ کے سب دشمن آخرت سے مایوس ہیں اور وہ آخرت کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ اور ان کو تشبیہ ان کفار سے دی گئی ہے جو قبروں میں ہیں۔ ان کو تو معلوم ہو چکا ہے کہ انہوں نے کفر اور شرک کا ارتکاب کیا۔ اب وہ دائمی جہنمی ہیں۔ دنیا کی مہلت ختم ہے۔ اب حشر میں صرف حساب ہونا ہے اور انہوں نے جہنم میں گرنا ہے۔ (تفسیر ظلال القرآن) علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے ذیل میں جن لوگوں کی دوستی منع کیا گیا ہے ان سے مراد یہود و نصاریٰ اور عام کفار لیے ہیں، کہ ان سے دوستانہ تعلقات نہ رکھو۔

الحمد للہ ثم الحمد للہ، بفضل اللہ و بنصرۃ اللہ و بتوفیق اللہ سورۃ الممتحنہ کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچ گئی ہے، اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے کماحقہ استفادہ کی توفیق عطا فرمائے، اس تفسیر کو میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے قابل قدر و لائق تکریم اساتذہ کرام کے لیے، میرے مشائخ کے لیے، میرے معاونین و مساعدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، ہماری نجات و فوز اخروی کا ذریعہ بنائے، اس کی خوبیوں کو اپنی عالی بارگاہ میں قبول فرمالے اور اس کی خامیوں سے درگزر فرمادے۔ آمین یارب العالمین بحرمۃ النبی الکریم صلی اللہ علیہ وسلم

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

۴ دسمبر ۲۰۱۸ء بمطابق ۲۶ ربیع الاول ۱۴۴۰ھ ۷ بجے قبل العشاء

تعارف سورۃ الصف

سوال سورۃ الصف کا تعارف کروایئے۔

جواب سورۃ الصف قرآن مجید کی ۶۱ ویں سورت ہے، یہ مدنی سورت ہے اور اس کی ۱۴ آیات ہیں۔ اس سورت کا مرکزی موضوع اللہ کے دین کی نصرت، مسلمانوں کے درمیان اتحاد، اور اللہ کی راہ میں صف باندھ کر جہاد کرنا ہے، اس سورت کو "سورۃ الحواریین" اور "سورۃ عیسیٰ" بھی کہا گیا ہے۔

وجہ تسمیہ: اس سورت کا نام "الصف" اس کی چوتھی آیت سے لیا گیا ہے اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ، یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں صف باندھ کر لڑتے ہیں۔ "صف" سے مراد اتحاد، نظم وضبط اور یکجہتی ہے، جو دین کی نصرت کے لیے ضروری ہے۔

شان نزول: اس سورت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ چند صحابہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کو سب سے زیادہ کون سا عمل پسند ہے تو ہم وہ عمل کریں، اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ سورت نازل فرمائی، حضرت عبد اللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے: "ہم چند صحابہ بیٹھے تھے اور آپس میں کہا کہ اگر ہمیں معلوم ہو جائے کہ اللہ کو سب سے زیادہ کون سا عمل پسند ہے تو ہم وہ عمل کریں، پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں جمع کیا اور یہ سورت پوری تلاوت فرمائی۔

اہمیت وافادیت: اس سورت میں مسلمانوں کو اتحاد، نظم وضبط اور اللہ کی راہ میں جہاد کی ترغیب دی گئی ہے۔ قول وفعل میں مطابقت اور سچائی کی تاکید کی گئی ہے، یعنی جو بات کہو، اس پر عمل بھی کرو۔ اس سورت میں دین کی نصرت اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کی بشارت دی گئی ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے واقعات کے ذریعے امت مسلمہ کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ سابقہ امتوں کی غلطیوں سے سبق سیکھیں اور دین کی مدد میں پیچھے نہ رہیں۔

سورۃ الصف

کل کائنات رب کی تسبیح خواں

سوال اس آیت مبارکہ کا ترجمہ کیجیے، نیز اس کا شان نزول بھی بیان کیجیے۔

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ {۱} الصف

جواب ترجمہ: آسمانوں اور زمین میں جو بھی کوئی چیز ہے، اس نے اللہ کی تسبیح کی ہے اور وہی ہے جو اقتدار کا بھی مالک ہے، حکمت کا بھی مالک۔

یہ بات کہ کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی تسبیح کرتی ہے، پیچھے کئی مقامات پر گذر چکی ہے، مثلاً سورۃ نور: ۳۶ اور ۴۱ اور سورۃ حشر: ۲۴ اور سورۃ بنی اسرائیل: ۴۴ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تم ان کی تسبیح کو سمجھتے نہیں ہو۔

پیچھے سورۃ حدید اور سورۃ حشر کو اور آگے سورۃ جمعہ اور سورۃ تغابن کو اللہ تعالیٰ نے اسی حقیقت کے بیان سے شروع فرمایا ہے اور بظاہر اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر تمہیں اپنی توحید پر ایمان لانے اور اپنی عبادت کرنے کا حکم دے رہا ہے تو اس میں اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے، کیونکہ اس کی ذات بے نیاز ہے، تم اس کی عبادت کرو یا نہ کرو، کائنات کی ہر چیز اس کے آگے سر بہ خم ہے۔ (آسان ترجمہ قرآن)

بعینہ یہی آیت سورۃ الحشر کی پہلی آیت ہے اور سورۃ الحدید کی بھی پہلی آیت یہی ہے، صرف اس میں (وَمَا فِي الْاَرْضِ) کے بجائے " وَالارض " ہے۔

دونوں سورتوں کی اس پہلی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا گیا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جتنے حیوانات، نباتات اور جمادات ہیں، سب اپنے رب کی پاکی اور بڑائی بیان کرتے ہیں کوئی اپنی زبان سے تسبیح پڑھتا ہے جیسے فرشتے اور جن وانس، اور کسی کی ہئیت وحالت سے آشکار ہوتا ہے کہ اس کا

خلاق تمام عیوب و نقائص سے پاک ہے، جیسے آسمان و زمین، درخت، نباتات اور پہاڑ وغیرہ۔ زجاج کہتے ہیں کہ نباتات و جمادات بھی زبان قال سے ہی تسبیح پڑھتے ہیں لیکن ہم اسے سمجھ نہیں پاتے ہیں۔

آیت کے آخر میں اللہ کی دو صفات: اَلعَزِیزُ اَلحَکِیمُ کا ذکر آیا ہے، جن کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بڑا ہی قوی ہے جو آسمانوں اور زمین کی ہر چیز پر غالب ہے اور اس نے تمام موجودات کو اپنی جانی بوجھی حکمت کے مطابق منظم و مرتب کیا ہے، جس سے کوئی بھی چیز سر مو انحراف نہیں کر سکتی ہے۔

شوکانی لکھتے ہیں کہ " سبح " کا لفظ کئی سورتوں کی ابتدا میں آیا ہے کہیں ماضی کا صیغہ آیا ہے اور کہیں مضارع کا اور کہیں امر کا صیغہ آیا ہے اور اس سے مقصود بندوں کو یہ تعلیم دینا ہے کہ اللہ کی پاکی اور بڑائی ہر حال میں بیان کرنی ہے۔ (تیسیر القرآن)

ابو سلمہ نے عبد اللہ بن سلام سے روایت کر کے خبر دی اس نے کہا کہ ہم کچھ صحابی رسول بیٹھے ذکر کر رہے تھے ہم نے کہا کہ کاش ہمیں پتہ چلے کہ کون سا کام اللہ کو سب کاموں سے پیارا ہے تو ہم وہ کام کریں تو اللہ نے یہ آیات نازل کیں سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، رسول اللہ نے یہ آیات ہمیں پڑھ کر سنائیں۔

بد عمل لوگوں کی باتیں قابل نفرت

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ {٢} كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ {٣} الصف.

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں؟ اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی قابل نفرت ہے کہ تم ایسی بات کہو جو کرو نہیں۔

ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے یہ کہا اگر ہم جان لیتے کہ سب سے محبوب اعمال اللہ کے نزدیک کون سے ہیں تو ہم یقیناً وہ کرتے۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان کو خبر دیتے ہوئے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو خاص طور پر پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں اس طرح صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں ان لوگوں نے اس کو ناپسند کیا تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی، يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۔ اے ایمان والو! ایسی بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں اور یہ بات اللہ بڑی ناراضگی کی ہے جو کہو وہ نہ کرو۔ (در منثور)

حضرت مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ یہاں لکھتے ہیں، مَا لَا تَفْعَلُوْنَ کے ظاہری معنیٰ تو یہ ہیں کہ جو کام تمہیں کرنا نہیں ہے اس کا دعویٰ کیوں کرتے ہو، جس سے ایسے کام کے دعوے کی ممانعت تو واضح ہو ہی گئی جس کو کرنے کا عزم و ارادہ ہی انسان کے دل میں نہ ہو کیونکہ یہ تو محض ایک جھوٹا دعویٰ ہے نام و نمود وغیرہ کے لئے ہو سکتا ہے مگر ظاہر ہے کہ شان نزول کے واقعہ میں جن صحابہ نے مذاکرہ کیا وہ ایسے نہ تھے کہ دل میں کچھ کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور دعویٰ کریں۔

اس لئے اس کے مفہوم میں یہ بھی شامل ہے کہ اگرچہ دل میں عزم و ارادہ کام کرنے کا ہو پھر بھی اپنے نفس پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا کہ ہم فلاں کام کریں گے شان عبدیت کے خلاف ہے، اول تو اس کے کہنے ہی کی کیا ضرورت ہے جب موقع ملے کر گزرنا چاہیے اور کسی مصلحت سے کہنا بھی پڑے تو اس کو ان شاء اللہ کے ساتھ مقید کر دے تو پھر وہ دعویٰ نہیں رہے گا۔ (معارف القرآن)

مسئلہ: اس سے معلوم ہوا کہ ایسے کام کا دعویٰ کرنا جس کے کرنے کا ارادہ ہی نہ ہو اور اس کو کرنا ہی نہ ہو یہ تو گناہ کبیرہ اور اللہ کی سخت ناراضی کا سبب ہے، كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ کا مصداق یہی ہے اور جہاں یہ صورت نہ ہو بلکہ ارادہ کرنے کا ہو وہاں بھی اپنی قوت و قدرت پر بھروسہ کر کے دعویٰ کرنا ممنوع و مکروہ ہے۔ (معارف القرآن)

دعویٰ اور دعوت میں فرق: مفتی شفیع رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ مذکورہ تفسیر سے یہ معلوم ہو گیا کہ ان آیات کا تعلق دعوے سے ہے کہ جو کام آدمی کو کرنا نہیں ہے اس کا دعویٰ کرنا اللہ تعالیٰ کی ناراضی کا سبب ہے، رہا معاملہ دعوت و تبلیغ اور وعظ و نصیحت کا کہ جو کام آدمی خود نہیں کرتا اس کی نصیحت دوسروں کو کرے اور اس کی طرف دوسرے مسلمانوں کو دعوت دے، وہ اس آیت کے مفہوم میں تو شامل نہیں، اس کے احکام دوسری آیات اور احادیث میں مذکور ہیں، مثلاً قرآن کریم نے فرمایا أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ یعنی تم لوگوں کو تو نیک کام کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو کہ خود اس نیکی پر عمل نہیں کرتے۔

اس آیت نے امر بالمعروف اور وعظ و نصیحت کرنے والوں کو اس بات پر شرمندہ کیا ہے کہ لوگوں کو ایک نیک کام کی دعوت دو اور خود اس پر عمل نہ کرو اور مقصد یہ ہے کہ جب دوسروں کو نصیحت کرتے ہو تو خود اپنے آپ کو نصیحت کرنا اس سے مقدم ہے جس کام کی طرف لوگوں کو بلاتے ہو خود بھی اس پر عمل کرو۔

لیکن یہ نہیں فرمایا کہ جب خود نہیں کرتے تو دوسروں کو کہنا بھی چھوڑ دو، اس سے معلوم ہوا کہ جس نیک کام کے خود کرنے کی ہمت و توفیق نہیں ہے اس کی طرف دوسروں کو بلانے اور نصیحت کرنے کا سلسلہ نہ چھوڑے، امید ہے کہ اس وعظ و نصیحت کی برکت سے کسی وقت اس کو بھی عمل کی توفیق ہو جاوے، جیسا کہ بکثرت تجربہ و مشاہدہ میں آیا ہے۔ البتہ اگر وہ عمل واجب یا سنت مؤکدہ کے درجہ میں ہو تو آیات مذکورہ پر نظر کر کے اپنے نفس میں نادم و شرمندہ ہونے کا سلسلہ جاری رکھنا بھی واجب ہے اور اگر مستحبات کے متعلق ہے تو یہ سلسلہ ندامت بھی مستحب ہے۔ (معارف القرآن)

انسان کہے کچھ اور کرے کچھ یعنی اس کے کہنے اور کرنے میں واضح فرق موجود ہو تو ایسے انسان کو اسلام پسند نہیں کرتا گویا انسان کی زبان اور عمل یکساں ایک ہوں تو وہ انسان ہے ورنہ انسانیت سے گر

جاتا ہے اور محض حیوان رہ جاتا ہے۔ ذرا غور کرو کہ آج مذہبی راہنماؤں، سیاسی لیڈروں اور حکمرانوں کا کیا حال ہے کیا کہیں ان لوگوں کی زبان اور عمل میں یکسانیت پائی جاتی ہے؟ کیا یہ لوگ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں؟

مجاہدین اللہ کے محبوب

سوال اس آیت کریمہ کی تفسیر کیجیے

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ {۴} الصف

جواب ترجمہ: حقیقت یہ ہے کہ اللہ ان لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اس کے راستے میں اس طرح صف بنا کر لڑتے ہیں جیسے وہ سیسہ پلائی ہوئی عمارت ہوں۔

اللہ تعالیٰ کے محبوب وہ لوگ ہیں جو صفیں باندھ کر اللہ کے دشمنوں کے مقابلے میں ڈٹ جاتے ہیں تاکہ کلمۃ اللہ کا بول بالا ہو اسلام کی حفاظت ہو اور دین کا غلبہ ہو۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثَلَاثٌ يَضْحَكُ اللّٰهُ إِلَيْهِمُ الرَّجُلُ يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ، وَالْقَوْمُ إِذَا صَفُّوا لِلصَّلَاةِ، وَالْقَوْمُ إِذَا صَفُّوا لِلْقِتَالِ، تین قسم کے لوگوں کی تین حالتیں ہیں جنہیں دیکھ کر اللہ تبارک و تعالیٰ خوش ہوتا ہے اور ہنس دیتا ہے رات کو اٹھ کر تہجد پڑھنے والے، نماز کے لئے صفیں باندھنے والے، میدان جنگ میں صف بندی کرنے والے۔ (مسند احمد، تفسیر ابن کثیر)

ابن ابی حاتم میں ہے حضرت مطرف فرماتے ہیں مجھے بہ روایت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ ایک حدیث پہنچی تھی میرے جی میں تھا کہ خود حضرت ابوذر سے مل کر یہ حدیث آمنے سامنے سن لوں چنانچہ ایک مرتبہ جا کر آپ سے ملاقات کی اور واقعہ بیان کیا آپ نے خوشی کا اظہار فرما کر کہا وہ حدیث کیا ہے؟ میں نے کہا یہ کہ اللہ تعالیٰ تین شخصوں کو دشمن جانتا ہے اور تین کو دوست رکھتا ہے

فرمایا ہاں میں نے اپنے خلیل حضرت محمد ﷺ پر جھوٹ نہیں بول سکتا فی الواقع آپ نے ہم سے یہ حدیث بیان فرمائی ہے، میں نے پوچھا وہ تین کون ہیں ؟ جنہیں اللہ تعالیٰ محبوب جانتا ہے تو آپ ﷺ نے فرمایا

رَجُلٌ غَزَا فِي سَبِيلِ اللهِ، خَرَجَ مُحْتَسِبًا مُجَاهِدًا فَلَقِيَ الْعَدُوَّ فَقُتِلَ، وَأَنْتُمْ تَجِدُونَهُ فِي كِتَابِ اللهِ الْمُنَزَّلِ، ثُمَّ قَرَأَ {إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ} ایک تو وہ جو اللہ کی راہ میں جہاد کرے خالص اللہ کی خوشنودی کی نیت سے نکلے دشمن سے جب مقابلہ ہو تو دلیرانہ جہاد کرے تم اس کی تصدیق خود کتاب اللہ میں بھی دیکھ سکتے ہو پھر آپ نے یہی آیت تلاوت فرمائی اور پھر پوری حدیث بیان کی (حاتم)

حضرت کعب احبار فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی ﷺ سے فرماتا ہے

عَبْدِي الْمُتَوَكِّلُ الْمُخْتَارُ لَيْسَ بفَظٍّ وَلَا غَلِيظ وَلَا صَخَّاب فِي الْأَسْوَاقِ، وَلَا يَجْزِي بِالسَّيِّئَةِ السَّيِّئَةَ، وَلَكِنْ يَعْفُو وَيَغْفِرُ مَوْلِدُهُ بِمَكَّةَ، وَهِجْرَتُهُ بِطَابَةَ، وَمُلْكُهُ بِالشَّامِ، وَأُمَّتُهُ الْحَمَّادُونَ يحمَدُون اللهَ عَلَى كُلِّ حَالٍ، وَفِي كُلِّ مَنْزِلَةٍ، لَهُمْ دَوِيٌّ كَدَوِيِّ النَّحْلِ فِي جَوِّ السَّمَاءِ بالسحَر، يُوَضّون أَطْرَافَهُمْ، وَيَأْتَزِرُونَ عَلَى أَنْصَافِهِمْ، صَفُّهُمْ فِي الْقِتَالِ مِثْلُ صَفِّهِمْ فِي الصَّلَاةِ ثُمَّ قَرَأَ: {إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِهِ صَفًّا كَأَنَّهُم بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ} رُعَاةُ الشَّمْسِ، يُصَلُّونَ الصَّلَاةَ حَيْثُ أَدْرَكَتْهُمْ، وَلَوْ على ظهر دابة (ابن ابی حاتم)

آپ میرے متوکل بندے اور پسندیدہ ہیں، بد خلق، بدزبان، بازاروں میں شور وغل کرنے والے نہیں، برائی کا بدلہ برائی سے نہیں لیتے بلکہ درگذر کر کے معاف کر دیتے ہیں، آپ کی جائے پیدائش مکہ ہے، جائے ہجرت طابہ ہے، ملک آپ کا شام ہے، امت آپ کی بکثرت حمد اللہ کرنے والی ہے، ہر

حال میں اور ہر منزل میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثناء بیان کرتے رہتے ہیں، صبح کے وقت ذکر اللہ میں ان کی پست آوازیں برابر سنائی دیتی ہیں جیسے شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ، اپنے ناخن اور مونچھیں کترتے ہیں اور اپنے تہمد اپنی آدھی پنڈلیوں تک باندھتے ہیں ان کی صفیں میدان جہاد میں ایسی ہوتی ہیں جیسی نماز میں، پھر حضرت کعب رضی اللہ عنہ نے اسی آیت کی تلاوت کی پھر فرمایا سورج کی نگہبانی کرنے والے جہاں وقت نماز آجائے نماز ادا کرلینے والے گو سواری پر ہوں۔

حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ اس آیت مبارکہ سے متعلق فرماتے ہیں کہ

كَانَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُقَاتِلُ الْعَدُوَّ إِلَّا أَنْ يُصَافَّهُمْ. وَهٰذَا تَعْلِيمٌ مِنَ اللّٰهِ لِلْمُؤْمِنِينَ. قَالَ: وَقَوْلُهُ: {كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ} مُلْتَصِقٌ بَعْضُهُ فِي بَعْضٍ، مِنَ الصَّفِّ فِي الْقِتَالِ، جب تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم صف نہ بنوالیتے دشمن سے لڑائی شروع نہیں کرتے تھے، پس صف بندی کی تعلیم مسلمانوں کو اللہ کی دی ہوئی ہے ایک دوسرے سے ملے کھڑے رہیں، ثابت قدم رہیں اور ٹلیں نہیں۔

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ آیت كَأَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ پر فرماتے ہیں کہ کیا تم نہیں دیکھتے کہ عمارت کا بنانے والا نہیں چاہتا کہ اس کی عمارت میں کہیں اونچ نیچ ہو ٹیڑھی ترچھی ہو یا سوراخ رہ جائیں اسی طرح اللہ تعالیٰ نہیں چاہتا کہ اس کے امر میں اختلاف ہو میدان جنگ میں اور بوقت نماز مسلمانوں کی صف بندی خود اس نے کی ہے، پس تم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرو جو احکام بجالائے گا یہ اس کے لئے عصمت اور بچاؤ ثابت ہے۔

ابو بحریہ فرماتے ہیں مسلمان گھوڑوں پر سوار ہو کر لڑنا پسند نہیں کرتے تھے انہیں تو یہ اچھا معلوم ہوتا تھا کہ زمین پر پیدل صفیں بنا کر آمنے سامنے کا مقابلہ کریں، آپ فرماتے ہیں جب تم مجھے دیکھو کہ میں نے صف میں سے ادھر ادھر توجہ کی تو تم جو چاہو ملامت کرنا اور برا بھلا کہنا۔ (تفسیر طبری، تفسیر ابن کثیر)

سید ابوالاعلیٰ مودودی اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اس سے اول تو معلوم یہ ہوا کہ اللہ کی خوشنودی سے وہی اہل ایمان سرفراز ہوتے ہیں جو اس کی راہ میں جان لڑانے اور خطرہ سہنے کے لیے تیار ہوں۔ دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ اللہ کو جو فوج پسند ہے اس میں تین صفات پائی جانی چاہیے۔ ایک یہ کہ وہ خوب سوچ سمجھ کر اللہ کی راہ میں لڑے اور کسی ایسی راہ میں نہ لڑے جو فی سبیل اللہ کی تعریف میں نہ آتی ہو۔ دوسری یہ کہ وہ بد نظمی و انتشار میں مبتلا نہ ہو بلکہ مضبوط تنظیم کے ساتھ صف بستہ ہو کر لڑے۔ تیسری یہ کہ دشمنوں کے مقابلہ میں اس کی کیفیت "سیسہ پلائی ہوئی دیوار" کی سی ہو۔ پھر یہ آخری صفت بجائے خود اپنے اندر معنی کی ایک دنیا رکھتی ہے۔ کوئی فوج اس وقت تک میدان جنگ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار کے مانند کھڑی نہیں ہو سکتی جب تک اس میں حسب ذیل صفات پیدا نہ ہو جائیں: عقیدہ اور مقصد میں کامل اتفاق، جو اس کے سپاہیوں اور افسروں کو آپس میں پوری طرح متحد کر دے۔ ایک دوسرے کے خلوص پر اعتماد جو کبھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا کہ سب فی الواقع اپنے مقصد میں مخلص اور ناپاک اغراض سے پاک ہوں۔ ورنہ جنگ جیسی سخت آزمائش کسی کا کھوٹ چھپا رہنے نہیں دیتی اور اعتماد ختم ہو جائے تو فوج کے افراد ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کے بجائے بلکہ الٹا ایک دوسرے پر شک کرنے لگتے ہیں۔ اخلاق کا ایک بلند معیار، جس سے اگر فوج کے افسر اور سپاہی نیچے گر جائیں تو ان کے دل میں نہ ایک دوسرے کی محبت پیدا ہو سکتی ہے نہ عزت، اور نہ وہ آپس میں متصادم ہونے سے بچ سکتے ہیں۔

اپنے مقصد کا ایک ایسا عشق اور اسے حاصل کرنے کا ایسا پختہ عزم جو پوری فوج میں سرفروشی و جانبازی کا ناقابل تسخیر جذبہ پیدا کر دے اور وہ میدان جنگ میں واقعی سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح ڈٹ جائے۔ یہی تھیں وہ بنیادیں جن پر نبی ﷺ کی قیادت میں ایک ایسی زبردست عسکری تنظیم اٹھی جس سے ٹکرا کر بڑی بڑی قوتیں پاش پاش ہو گئیں اور صدیوں تک دنیا کی کوئی طاقت اس کے سامنے نہ ٹھہر سکی۔ (تفسیر تفہیم القرآن)

ڈاکٹر اسلم صدیقی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اس آیت کریمہ سے اللہ تعالیٰ کے محبوب اور مبغوض لوگوں کے درمیان ایک لکیر کھینچ دی گئی ہے کہ جو لوگ ایمان، اخلاص اور سرفروشی کا دعویٰ تو کرتے ہیں لیکن وہ وقت آنے پر نہایت کمزور ثابت ہوتے بلکہ بدعہدی کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ لوگ ہیں۔ اور وہ کسی وقت بھی اللہ تعالیٰ کے غضب کا شکار ہوسکتے ہیں۔ لیکن جو لوگ صرف اللہ تعالیٰ سے محبت رکھنے کا دعویٰ نہیں کرتے وہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں سرفروشی کے لیے لمبی چوڑی ڈینگیں نہیں مارتے، اور وہ جاں نثاری کے بڑے بڑے دعوے نہیں کرتے بلکہ اللہ تعالیٰ ہی سے استقامت، ثابت قدمی اور ہر طرح کی آزمائش میں پورا اترنے کی توفیق مانگتے رہتے ہیں۔

اور جب کبھی حق و باطل کی کشمکش میں نوبت قتال تک پہنچتی ہے تو پھر ان کی متعدد خوبیاں کھل کر سامنے آتی ہیں۔ اور یہی لوگ فی الحقیقت اللہ تعالیٰ کے محبوب ہوتے ہیں۔ ان میں پہلی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں یعنی فی سبیل اللہ لڑتے ہیں۔ وہ ایسی کسی جنگ اور کسی آویزش میں کبھی شریک نہیں ہوتے جو فی سبیل اللہ کی تعریف میں نہ آتی ہو۔ ان کا مال و دولت، ان کا جسم و جان، ان کی صلاحیتیں اور توانائیاں، ان کی ذہانت و فطانت اور ان کے جذبات و عواطف صرف اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے وقف ہوتے ہیں۔ نہ وہ شیطان کے راستے پر چلتے ہیں نہ اپنی خواہشات کی پیروی میں کسی سے الجھتے ہیں، نہ مفادات کی ہوس انھیں کسی سے نبرد آزما ہونے کے لیے اکساتی ہے۔ وہ صرف اللہ تعالیٰ کے دین کے لیے سوچتے، اسی کے لیے جیتے اور اسی کے لیے مرتے ہیں۔

دوسری خوبی ان میں یہ ہوتی ہے کہ وہ بدنظمی اور انتشار سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ ایک امیر کے تحت اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے ایک مضبوط تنظیم کی معیت میں صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں۔ الگ الگ ٹولیوں کی شکل میں اپنے مفادات کو دین کا لبادہ پہنا کر اپنے گروہی مفادات کی خاطر وہ کبھی جنگ نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی سوچ بھی اجتماعی ہوتی ہے اور ان کا عمل بھی اجتماعی ہوتا ہے۔

تیسری خوبی ان کی یہ ہے کہ وہ دشمنوں کے مقابلے میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ دشمن ان کے اندر دراڑیں ڈالنے میں کامیاب نہیں ہوسکتے۔ چونکہ ان کا کوئی فیصلہ انفرادی نہیں ہوتا اس لیے اجتماعیت کی دیوار میں کہیں شگاف پیدا ہونے میں نہیں آتا۔ جب دشمن سے تصادم ہوتا ہے تو دشمن محسوس کرتا ہے کہ اس اجتماعی قوت کو انتشار کی نذر نہیں کیا جاسکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ میں بڑی معنویت پائی جاتی ہے۔ کیونکہ کسی جماعت کا بُنْيَانٌ مَرْصُوصٌ میں ڈھل جانا دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔ صرف ایسی جماعت ہی اس صفت کی حامل ہوسکتی ہے جن کا ایک ایک فرد ایک دوسرے کے خلوص پر اعتماد رکھتا ہے۔ اور ان میں ایک ایک مخلص بھی ہو اور ناپاک اغراض سے پاک بھی۔ ان میں اخلاق کا ایک بلند معیار ہو جس میں سپاہی اور افسر برابر کے شریک ہوں۔ وہ ایک عظیم مقصد کی خاطر ایک دوسرے سے اس قدر پیوست ہوچکے ہوں کہ وہ الگ الگ اپنے وجود کا احساس دوسرے کے بغیر مشکل محسوس کرتے ہوں۔ انھیں مقصد سے ایسا عشق ہو اور مقصد کو بروئے کار لانے کا ایسا پختہ عزم ہو کہ جس پر شکستگی کی کوئی پرچھائیں بھی نہ پڑ سکے۔ ایسے لوگ ہیں جو کسی سیسہ پلائی ہوئی دیوار میں ڈھل سکتے ہیں۔ اور یہی لوگ اللہ تعالیٰ کے محبوب ہیں۔ (تفسیر روح القرآن)

مصری عالم سید قطب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے، جو اس کی راہ میں لڑتے ہیں، اس طرح جس طرح وہ بنیان مرصوص ہیں۔ اللہ اپنے راستے میں لڑنے کے لئے کس قدر زور دار انداز سے مسلمانوں کو آمادہ کرتا ہے لیکن ریکارڈ یہ بتاتا ہے کہ یہ تاکید بعض لوگوں کی اس نفسیاتی حالت کو دور کرنے کے لئے کہی گئی جو جنگ کو پسند نہ کرتے تھے اور اسے اور موخر کرنا چاہتے تھے۔ اور جنگ سے پسپائی اختیار کر رہے تھے۔

اس لئے یہاں ان کو سختی سے آمادہ کیا گیا۔ لیکن اس مخصوص سبب نزول کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ آیت مخصوص حالات کے لئے ہے بلکہ اسلام کی یہ عام پالیسی ہے کہ لوگوں کو بروقت جنگی حالات

کے لئے آمادہ رکھا جائے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ اسلام خواہ مخواہ جنگی جنون پیدا کرنا نہیں چاہتا اور نہ ہی وہ جنگ کو ایک محبوب چیز سمجھتا ہے۔ اسلام جنگ کو اس لئے فرض قرار دیتا ہے کہ حالات اسے مجبور کر دیتے ہیں۔ پھر اسلام جن مقاصد کے لئے جنگ کرتا ہے وہ بلند مقاصد ہیں۔ اسلامی جنگ اس لئے ہوتی ہے کہ اسلامی ممالک کے اندر اللہ کے آخری منہاج زندگی کو نافذ اور قائم کیا جائے۔

یہ اسلامی منہاج زندگی اگرچہ ایک فطری منہاج ہے لیکن اسلام انسانی نفوس پر کچھ ذمہ داریاں بھی عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس منہاج کے معیار تک بلند کریں تاکہ اس اعلیٰ معیار پر یہ نظام قائم رہ سکے۔

لیکن یہ بھی ایک عملی حقیقت ہے کہ ہمیشہ اس کرہ ارض پر ایسی قوتیں رہی ہیں جن کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اسلامی نظام زندگی اس دنیا میں قدم نہ جما سکے۔ اس لئے کہ دنیا کے جس قدر غیر اسلامی نظام ہیں ان کے کچھ مفادات وامتیازات ہوتے ہیں، یہ نظام بعض کھوٹی اور جھوٹی قدروں پر قائم ہوتے ہیں، جب بھی دنیا میں اسلامی نظام قائم ہوا ہے ایسی قوتوں کے مفادات ختم ہوگئے ہیں۔ یہ باطل نظامہائے زندگی انسانی نفوس کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور انسانوں کو انسانی سطح سے نیچے گرا کر اور ان کے اندر اخلاقی بگاڑ پیدا کر کے، اور ان کو حقیقت سے جاہل رکھ کر اسلامی نظام کی مخالفت میں لا کر کھڑا کر دیتے ہیں۔ اور یوں عوام الناس اپنی جہالت کی وجہ سے اسلام کی راہ روکنے لگتے ہیں۔

شر کا زور ہوتا ہے اور باطل پھولا ہوا دکھائی دیتا ہے اور شیطان کی چالیں بہت گہری ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن حاملین ایمان اور اسلامی منہاج حیات کے محافظین اور پاسداروں کے لئے اعلیٰ اخلاقی معیار تجویز کرتا ہے تاکہ وہ شر اور شیطان کے ایجنٹوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں۔

ان کی اخلاقی حالت مضبوط ہو، وہ دشمنوں کے خلاف لڑ سکیں اور وہ ہر وقت ایسی جنگ کے لئے تیار ہوں جو ان پر اسلام کے دشمن مسلط کر دیں، یہی ایک ضمانت ہے جس کی وجہ سے دعوت

اسلامی کی راہ نہیں رکتی، جس کے ذریعہ سے اسلامی نظام قائم رہتا ہے، لوگوں کو اظہار رائے کی آزادی ملتی ہے اور وہ اپنی مرضی کا نظام قائم کرسکتے ہیں۔

پھر یہ لوگ اللہ کی راہ میں جہاد و قتال کرتے ہیں نہ اپنی ذات کے لئے لڑتے ہیں اور نہ ہی کسی رنگ کی عصبیت کے لئے لڑتے ہیں، نہ نسلی، نہ لسانی، نہ علاقائی اور نہ خاندانی عصبیت کے لئے، صرف اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں، اس لئے لڑتے ہیں کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، وہ جو صرف اس لئے لڑتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو تو وہ اللہ کے راستے میں لڑتا ہے۔

کلمۃ اللہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے احکام و مقاصد کے لئے اور اللہ کا ارادہ بھی یہی ہے کہ جس طرح یہ پوری کائنات اللہ کی تسبیح کرتی ہے اور اللہ کے قانون قدرت کے مطابق چلتی ہے اسی طرح انسان بھی اللہ کے بھیجے ہوئے آخری اور مکمل نظام زندگی اور شریعت الٰہیہ کے مطابق چلے اور یوں یہ پوری کائنات اور اس کے اندر پائے جانے والے سب انسان اللہ کے قانون کے مطابق چلیں اور اللہ کے سوا کسی کا قانون اور شریعت نہ چلے۔

یہ ضروری تھا کہ بعض افراد نظام شریعت کی راہ روکیں، بعض طبقات اسلامی نظام کو قائم ہونے نہ دیں، بعض حکومتیں اسے اپنے لئے خطرہ سمجھیں اور اس کے سوا بھی چارہ نہ تھا کہ اسلام ان رکاوٹوں کو عبور کرے اور ان کا مقابلہ کرے اور یہی وجہ تھی کہ مسلمانوں پر جہاد و قتال فرض کیا گیا تاکہ اسلامی نظام کو قائم کیا جاسکے اور اسے قائم رکھا جاسکے اور زمین کے اوپر اللہ کا کلمہ بلند ہو، یہی وجہ ہے کہ اللہ ان لوگوں کو محبوب سرکھتا ہے، جو اس کے راستے میں صف بندی سے لڑتے ہیں، گویا وہ بنیان مرصوص ہیں۔ یہ ہے وہ حالت جس پر ہمیں بہت زیادہ غور کرنا چاہیے۔

”جو اللہ کی راہ میں صف بستہ ہو کر لڑتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں“۔ اگر مجاہدین اس حالت میں نہ ہوں تو شاید محبوب نہ ہوں، یہ ہر فرد کو بھی حکم ہے اور اجتماعی لحاظ سے بھی حکم ہے، یعنی ان کو اس طرح ہونا چاہیے کہ ان کی ایک مضبوط نظام والی جماعت ہو، اس لئے کہ جو قوتیں اسلام

کی راہیں روکتی ہیں وہ جماعتی اور اجتماعی قوت کی شکل میں ہوتی ہیں اور اس کے خلاف پوری قوتوں کو جمع کرتی ہیں، لہٰذا اسلامی قوتوں کا بھی فرض ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کے مقابلے میں جمع ہو کر نکلیں اور ملت واحدہ کی شکل میں آئیں۔

ایک پختہ دیوار کی شکل میں اور نہایت ہی منظم شکل میں نکلیں، ہم آہنگی سے نکلیں، لہٰذا یہ صورت کہ ایک انسان اکیلا اللہ کی بندگی کرے، اکیلا جہاد کرے، اکیلا زندگی بسر کرے، یہ ایسی صورت ہے، جو اس دین کے مزاج ہی کے خلاف ہے، حالت جہاد کے جو تقاضے ہوتے ہیں ان کے خلاف ہے اور اس کے بعد پوری زندگی کو کنٹرول کرنے کی جو صورت ہوتی ہے، اس کے خلاف ہے۔

یہ تصویر جو مسلمانوں کے لئے اللہ تعالیٰ یہاں پیش فرماتا ہے یہ دراصل مسلمانوں کے دین کی تصویر ہے، یہ تصویر دکھاتی ہے کہ مسلمانوں کے نشانات راہ کیا ہیں اور قرآن کریم ان کے لئے اجتماعی نظام کفالت وحمایت کس طرح تجویز کرتا ہے۔

صفاً..مرصوص: ایک صف کی شکل میں، گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں" ایک ایسی دیوار جس کی اینٹیں ملی ہوئی ہیں، باہم پیوست ہیں اور ہر اینٹ اپنا فریضہ ادا کر رہی ہے اور ہر اینٹ اپنے مقام پر کھڑی ہے اور اپنا فریضہ ادا کر رہی ہے، اگر ایک اینٹ بھی نکال لی جائے تو پوری عمارت گر سکتی ہے۔

اسی طرح اگر اینٹ آگے ہو جائے، پیچھے ہو جائے یا اوپر والی اینٹ نیچے والی اینٹ سے جدا ہو جائے تو دیوار میں سوراخ ہو سکتا ہے، یہ سب باتیں جماعت کے افراد کے باہمی ربط کو متعین کرتی ہیں۔ جو ایک ہی سمت میں آگے بڑھ رہے ہیں، یعنی وہ شعوری طور پر بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہم آہنگ ہوں، فکر و نظر میں بھی ایک دوسرے کے ساتھ ہمقدم ہوں، نظام میں بھی منظم ہوں جس طرح تسبیح کے دانے اور ہدف بھی ایک ہو۔ (تفسیر ظلال القرآن)

قوم موسیٰ کے دل ٹیڑھے کیوں ہوئے؟

سوال اس آیت کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهٖ یٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِیْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْۤا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الْفٰسِقِیْنَ {۵} الصف

جواب ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا تھا کہ: اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے تکلیف کیوں پہنچاتے ہو، حالانکہ تم جانتے ہو کہ میں تمہارے پاس اللہ کا پیغمبر بن کر آیا ہوں؟ پھر جب انہوں نے ٹیڑھ اختیار کی تو اللہ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا اور اللہ نافرمان لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔

مفسر قرآن ڈاکٹر اسلم صدیقی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں مسلمانوں میں ضعیف الایمان لوگوں کو عموماً اور منافقین کو خصوصاً سمجھانے کے لیے قوم موسیٰ یعنی یہود کی مثال دی جارہی ہے کہ وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے بلکہ انھیں اپنا محسن خیال کرتے تھے، لیکن اس قول اور اعتقاد کے باوجود انھوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مختلف اوقات میں جو رویہ اختیار کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اسے ایذا دہی سے تعبیر فرمایا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے رسول کے پیش نظر ایک مضبوط جتھہ بنانا نہیں ہوتا بلکہ ایک ایسی امت کی تشکیل ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بندگی اور رسول کی اطاعت میں کسی کمزوری کا شکار نہ ہو۔

ان کی زندگی کا ہر شعبہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے تحت اور رسول کی ہدایت کے مطابق بسر ہوتا نظر آئے، ان کی صلح و جنگ ان کے اپنوں اور پرایوں سے معاملات اور ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے اداروں پر ہر جگہ ایک ہی چھاپ دکھائی دے کہ یہ لوگ نفسانیت کے بندے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے بندے ہیں اور اللہ تعالیٰ کے رسول کے فرماں بردار امتی ہیں۔

چنانچہ جب بھی اس بنیادی تصور کو نافرمانی کی صورت میں کہیں بھی ضعف پہنچتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے نبی کو اس سے اذیت پہنچتی ہے، وہ اپنی ذاتی تکلیف کو ہمیشہ نظر انداز کرتا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ کی شریعت کے کسی حکم کی شکست و ریخت اسے گوارا نہیں ہوتی، چنانچہ اسی بنا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

ایک سے زیادہ مرتبہ اپنی قوم سے شکوہ کرتے ہوئے کہا کہ تم یہ جانتے ہو کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں، اس کے باوجود تم مجھے ایذا پہنچاتے رہتے ہو اور تم کوئی موقع میری نافرمانی کا ہاتھ سے جانے نہیں دیتے اور جس پروردگار نے تم پر بے پایاں احسانات کیے ہیں اس کے احسانات اور نیکیوں کی ناشکری کرنے سے بھی تمہیں کبھی عار محسوس نہیں ہوتی۔

چنانچہ تاریخ کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ جب بنی اسرائیل بحر احمر کو سلامتی سے عبور کر کے ساحل پر پہنچے اور اپنی آنکھوں سے فرعون کو لشکر سمیت غرق ہوتے دیکھ لیا تو تب بھی ان کے عقیدہ توحید میں پختگی نہ آئی، جیسے ہی ایک بت پرست قوم کو دیکھا کہ وہ اپنے بتوں کی پوجا کر رہی ہے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمائش کر ڈالی کہ اے موسیٰ! ہمارے لیے ایسے خدا بنا دیں جس طرح اس قوم کے خدا ہیں۔

جب آپ علیہ السلام کوہ طور پر تشریف لے گئے تو سامری کی ایک معمولی سی انگیخت پر انہوں نے بچھڑے کی پوجا شروع کر دی اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے دین کی سربلندی کے لیے جاں فروشی اور جاں نثاری کا سوال ہے، اس میں بھی ان کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے راستے میں جہاد کے لیے بڑے جوش و جذبہ کا اظہار کرتے، لیکن جب وقت آتا تو ہتھیار ڈال دیتے تھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب انہیں فلسطینیوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا تو وہ یہ جواب دے کر بیٹھ رہے کہ یہ بڑے زور آور لوگ ہیں، ہم ان کی تلواروں کا لقمہ بننے کے لیے تیار نہیں، آپ اپنے رب کے ساتھ جا کر ان سے لڑیں، جب وہ شہر خالی کر جائیں گے تو ہم شہر میں داخل ہو جائیں گے۔

ان میں سے بعض نادان لوگ تو اس حد تک جسارت کر جاتے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر طرح طرح کے الزام تراشتے، تورات کے صفحات ان گستاخیوں سے بھرے پڑے ہیں، ان کے ان کرتوتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب انھوں نے بار بار کی تنبیہ و تذکیر کے بعد بھی اپنے دلوں کا رخ سیدھا نہ کیا اور اللہ تعالیٰ نے عقل و فہم کی جو صلاحیتیں انہیں بخشی تھیں انہوں نے ان سے فائدہ نہ اٹھایا اور دانستہ راہ حق کو چھوڑ کر گمراہی کے راستے پر چلتے رہے، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا، یعنی ان کے

دلوں کو اسی رخ پر کج کر دیا جس کو انہوں نے اپنے لیے پسند کیا تھا۔

کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص جس راستے پر چلنے کا ارادہ کرتا ہے اور پھر اللہ تعالیٰ سے اس کی توفیق مانگتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسی راستے پر چلنے کے اسباب پیدا کر دیتا ہے، اگر کوئی شخص صحیح راہ پر چلنا چاہتا ہے تو اس کے لیے صحیح راہ پر چلنا آسان کر دیا جاتا ہے اور جو شخص برے راستوں کا مسافر بننا چاہتا ہے اور برائی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ برائی کے راستے اس کے لیے آسان کر دیتا ہے اور برائی پر چلنے کے اسباب پیدا فرما دیتا ہے، اس کے یہاں جبر نہیں۔

نیکی کے راستے پر چلنے والوں کو وہ زبردستی برے راستے پر نہیں چلاتا اور برائی اختیار کرنے والوں کو وہ زبردستی نیک نہیں بناتا، کیونکہ اگر وہ ایسا کرے تو یہ جبر ہے اس سے جزا و سزا کا تصور تمام تر غلط ہو کر رہ جاتا ہے، قیامت کے دن ہر برا آدمی یہ اعتراض کر سکتا ہے کہ آپ کے جبر سے ہم نے برائی اختیار کی، آج یہ سزا کیسی اور یہ بھی اعتراض کر سکتا ہے کہ آپ کے جبر کی وجہ سے فلاں شخص نے نیکی کا راستہ اختیار کیا تو اس کے لیے جزا اور انعام کیسا۔

اس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ کسی شخص یا قوم کی گمراہی کا آغاز اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتا بلکہ خود اس شخص یا اس قوم کی طرف سے ہوتا ہے، البتہ اللہ تعالیٰ اپنے قانون کے مطابق گمراہی پسند کرنے والے کو راست روی کے لیے مجبور نہیں کرتا بلکہ اس کے لیے گمراہی کے اسباب پیدا کر دیتا ہے تاکہ جن جن راہوں پر وہ بھٹکنا چاہے بھٹکتا چلا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو خیر و شر، نیکی اور بدی میں آزادی دے رکھی ہے، اسی پر اس کی جزا و سزا کا دارومدار ہے، چنانچہ یہود جب اپنی کجروی پر چلتے رہے اور ہمیشہ انھوں نے کجی کے راستوں ہی کو پسند کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں کجی پیدا کر دی، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون نہیں ہے کہ کوئی ضلالت کو پسند کرے، لیکن وہ اس کے اندر زبردستی ہدایت ٹھونس دے۔

ہدایت اسی کو ملتی ہے جو اس کی قدر کرتا اور اس کا طلب گار ہوتا ہے، یہ ایک طرح سے منافقین

کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ تم بھی اگر یہود کی اس روش کی پیروی جاری رکھو گے تو تمہارے دل اسی طرح ٹیڑھے کر دیئے جائیں گے جس طرح ان کے دل ٹیڑھے کر دیئے گئے، پھر تم صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاؤ گے۔ (تفسیر روح القرآن)

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کلیم اللہ حضرت موسیٰ بن عمران نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم میری رسالت کی سچائی جانتے ہو پھر کیوں میرے درپے آزار ہو رہے ہو؟ اس میں گویا ایک طرح سے آنحضور ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے، چنانچہ آپ بھی جب ستائے جاتے تو فرماتے رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَى مُوسَى: لَقَدْ أُوذِيَ بِأَكْثَرَ مِنْ هَذَا فَصَبَرَ، اللہ تعالیٰ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر رحمت نازل فرمائے وہ اس سے زیادہ ستائے گئے لیکن پھر بھی صابر رہے۔ اور ساتھ ہی اس میں مومنوں کو ادب سکھایا جارہا ہے کہ وہ اللہ کے نبی ﷺ کو ایذاء نہ پہنچائیں ایسا نہ کریں جس سے آپ کا دل دکھتا ہو۔

جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہے {يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ آذَوْا مُوسَى فَبَرَّأَهُ اللّٰهُ مِمَّا قَالُوا وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيهًا} (الْأَحْزَاب: ٦٩) ایمان والو! تم ایسے نہ ہونا جیسے موسیٰ کو ایذاء دینے والے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے اس ذی عزت بندے کو اس کے بہتانوں سے پاک کیا۔

پس جبکہ یہ لوگ علم کے باوجود اتباع حق سے ہٹ گئے اور ٹیڑھے چلنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے دل ہدایت سے ہٹا دیئے شک و حیرت ان میں سما گئی۔

جیسے دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے {وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوا بِهِ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَنَذَرُهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ} (الْأَنْعَام: ١١٠) ہم ان کے دل اور آنکھیں الٹ دیں گے جس طرح یہ ہماری آیتوں پر پہلی دفعہ ایمان نہیں لائے اور ہم انہیں ان کی سرکشی کی حالت میں چھوڑ دیں گے جس میں وہ سرگرداں رہیں گے۔

اور دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا {وَمَنْ يُشَاقِقِ الرَّسُولَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدَى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيلِ الْمُؤْمِنِينَ نُوَلِّهِ مَا تَوَلَّى وَنُصْلِهِ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيرًا}

(النِّسَاءِ: ۱۱۵) جو رسول ﷺ کی مخالفت کرے ہدایت ظاہر ہو جانے کے بعد اور مومنوں کے راستے کے سوا کسی دوسرے کی تابعداری کرے ہم اسے ایسی طرف متوجہ کریں گے جس طرف وہ متوجہ ہوا ہے اور بالآخر اسے ہم جہنم میں ڈال دیں گے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔ یہاں بھی ارشاد ہوتا ہے {وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ} اللہ تعالیٰ فاسقوں کی رہبری نہیں کرتا۔ (تفسیر ابن کثیر)

بشارت عیسوی

سوال حضرت عیسیٰ بن مریم نے اپنی قوم کو اپنے بعد نبی کریم ﷺ کے آنے کی خوشخبری سنائی تھی، جس کا ذکر اس آیت میں ہے، اس کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے۔

وَإِذْ قَالَ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ إِنِّي رَسُولُ اللّٰهِ إِلَيْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَمُبَشِّرًا بِرَسُولٍ يَّأْتِي مِنۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ أَحْمَدُ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ قَالُوا هٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ {٦} الصف.

ترجمہ: اور وہ وقت یاد کرو جب عیسیٰ بن مریم نے کہا تھا کہ: اے بنو اسرائیل میں تمہارے پاس اللہ کا ایسا پیغمبر بن کر آیا ہوں کہ مجھ سے پہلے جو تورات (نازل ہوئی) تھی، میں اس کی تصدیق کرنے والا ہوں، اور اس رسول کی خوشخبری دینے والا ہوں جو میرے بعد آئے گا، جس کا نام احمد ہے۔ پھر جب وہ ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں لے کر آئے تو وہ کہنے لگے کہ: یہ تو کھلا ہوا جادو ہے۔

بنی اسرائیل کے آخری تاجدار نبوت حضرت سیدنا عیسیٰ بن مریم نے اپنی قوم کو یہ خوشخبری سنائی تھی کہ میں تم سب کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں، میں تورات کی تصدیق اور اپنے بعد آنے والے ایک عظیم الشان رسول کی خوشخبری سنانے کے لیے آیا ہوں، میرے بعد آنے والے رسول کا نام احمد ہو گا۔

بنی اسرائیل کے آخری تاجدار نبوت حضرت سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل میں کھڑے ہو کر ایک خطبہ ارشاد فرمایا تھا، جسے قرآن کریم نے یہاں سورۃ الصف میں نقل فرمایا ہے، جس میں آپ

نے واضح فرمایا کہ میں موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہونے والی کتاب تورات کی تصدیق کے لیے آیا ہوں کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجی ہوئی سچی اور کھری کتاب تھی، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا، اس کے احکامات سچے تھے، وہ جس نبی پر آئی تھی وہ سچے تھے۔

بنی اسرائیل میں اسی خطبہ میں آپ علیہ السلام نے ہمارے پیارے نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کا ذکر بھی فرمایا، جس میں آپ علیہ السلام نے اپنے لوگوں کو بتایا کہ میرے بعد ایک نبی آئے گا جس کا نام نامی اسم گرامی احمد ہو گا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اس خطبہ میں اس طرف باریک اشارہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری نبی تھے، جب کہ انہوں نے جس عظیم الشان نبی کی بشارت دی تھی وہ نہ صرف یہ کہ خاتم المرسلین تھے بلکہ خاتم النبیین بھی تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کا چرچہ کائنات بننے سے پہلے تھا، آدم علیہ السلام کی جب توبہ قبول کی گئی تو اس دوران بھی انہیں بتایا گیا تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کی اولاد میں سے ہوں گے اور وہ آخری نبی ہوں گے، وہ خاتم النبیین ہوں گے، اگر ان کو لانا مقصود نہ ہوتا تو آدم آپ کو بھی پیدا نہ کیا جاتا۔ (الوفا بتعریف فضائل المصطفےٰ ابن جوزی)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا إِنَّ لِي أَسْمَاءً: أَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَنَا أَحْمَدُ، وَأَنَا الْمَاحِي الَّذِي يَمْحُو اللهُ بِهِ الْكُفْرَ، وَأَنَا الْحَاشِرُ الَّذِي يُحْشَرُ النَّاسُ عَلَى قَدَمِي، وَأَنَا الْعَاقِبُ (بخاری و مسلم) میرے بہت سے نام ہیں محمد، احمد، ماحی جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے کفر کو مٹا دیا اور میں حاشر ہوں جس کے قدموں پر لوگوں کا حشر کیا جائے گا اور میں عاقب ہوں۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے سامنے اپنے بہت سے نام بیان فرمائے جو ہمیں محفوظ رہے ان میں سے چند ایک یہ ہیں، فرمایا أَنَا مُحَمَّدٌ، وَأَنَا أَحْمَدُ، وَالْحَاشِرُ، وَالْمُقَفِّي، وَنَبِيُّ الرَّحْمَةِ، وَالتَّوْبَةِ، وَالْمَلْحَمَةِ، میں محمد ہوں، میں احمد ہوں، میں حاشر ہوں میں مقفی ہوں، میں نبی الرحمۃ ہوں، میں نبی التوبہ ہوں، میں نبی الملحمہ ہوں۔ (ابو داؤد، مسلم)

تورات اور انجیل میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کا ذکر خیر موجود تھا، اور ان کتابوں کے حاملین کو پتہ بھی تھا کہ یہ ایک عظیم الشان نبی کا تذکرہ ہے، قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس بارے میں ہمیں آگاہی دی ہے، ارشاد فرمایا

{الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالإِنْجِيلِ} (الأَعْرَافِ: ۱۵۷) جو پیروی کرتے ہیں اس رسول نبی امی کی جنہیں اپنے پاس لکھا ہوا پاتے ہیں توراۃ میں بھی اور انجیل میں بھی۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم سے پہلے آنے والی بڑی کتابوں میں ہمارے نبی ﷺ کا ذکر فرمایا، اسی طرح بڑے انبیاء کرام کے سامنے بھی اللہ تعالیٰ نے ہمارے نبی کریم ﷺ کا ذکر خیر فرمایا، آپ ﷺ کو دی جانے والی کتاب کا ذکر فرمایا، آپ ﷺ کو ماننے، تسلیم کرنے اور آپ ﷺ پر ایمان لانے کا عہد و پیمان لیا، جیسے ارشاد ہے

{وَإِذْ أَخَذَ اللهُ مِيثَاقَ النَّبِيِّينَ لَمَا آتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَحِكْمَةٍ ثُمَّ جَاءَكُمْ رَسُولٌ مُصَدِّقٌ لِمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهِ وَلَتَنْصُرُنَّهُ قَالَ أَأَقْرَرْتُمْ وَأَخَذْتُمْ عَلَى ذَلِكُمْ إِصْرِي قَالُوا أَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوا وَأَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِينَ} اللہ تعالیٰ نے جب نبیوں سے عہد لیا کہ جب کبھی میں تمہیں کتاب و حکمت دوں پھر تمہارے پاس میرا رسول آئے جو اسے سچ کہتا ہو جو تمہارے ساتھ ہے تو تم اس پر ضرور ایمان لاؤ گے اور اس کی ضرور مدد کرو گے کیا تم اس کا اقرار کرتے ہو اور اس پر میرا عہد لیتے ہو؟ سب نے کہا ہمیں اقرار ہے فرمایا بس گواہ رہو اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہوں میں ہوں۔ (سورۃ آل عمران ۸۱)

حضرت سیدنا عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی اس بات کی شہادت دی ہے، فرمایا مَا بَعَثَ اللهُ نَبِيًّا إِلَّا أَخَذَ عَلَيْهِ الْعَهْدَ: لَئِنْ بُعِثَ مُحَمَّدٌ وَهُوَ حَيٌّ لَيَتَّبِعَنَّهُ، وَأَخَذَ عَلَيْهِ أَنْ يَأْخُذَ عَلَى

أُمَّتِهِ لَئِنْ بُعِثَ مُحَمَّدٌ وَهُمْ أَحْيَاءٌ لَيَتَّبِعُنَّهُ وَيَنْصُرُنَّهُ، کوئی نبی اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں بھیجا جس سے یہ اقرار نہ لیا ہو کہ ان کی زندگی میں اگر حضرت محمد ﷺ بھیجے جائیں تو وہ آپ کی تابعداری کرے بلکہ ہر نبی سے یہ وعدہ بھی لیا جاتا رہا کہ وہ اپنی اپنی امت سے بھی عہد لے لیں، کہ وہ حضرت محمد ﷺ کی پیروی کریں گے اور آپ ﷺ کی مدد و نصرت کریں گے۔

ایک مرتبہ حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے دریافت کیا کہ يَا رَسُولَ اللّٰهِ، أَخْبِرْنَا عَنْ نَفْسِكَ. قَالَ: دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ، وَبُشْرَى عِيسَى، وَرَأَتْ أُمِّي حِينَ حَمَلَتْ بِي كَأَنَّهُ خَرَجَ مِنْهَا نُورٌ أَضَاءَتْ لَهُ قُصُورُ بُصْرَى مِنْ أَرْضِ الشَّامِ (ابن اسحاق) یارسول اللہ! ﷺ آپ ہمیں اپنی خبر سنایئے آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا میں اپنے باپ حضرت ابراہیم کی دعا ہوں اور حضرت عیسیٰ کی خوش خبری ہوں، میری والدہ کا جب پاؤں بھاری ہوا تو خواب میں دیکھا کہ گویا ان میں سے ایک نور نکلا ہے جس سے شام کے شہر بصریٰ کے محلات چمک اٹھے۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ کہ آپ ﷺ نے فرمایا إِنِّي عِنْدَ اللّٰهِ لَخَاتَمُ النَّبِيِّينَ، وَإِنَّ آدَمَ لمنجدلٌ فِي طِينَتِهِ، وَسَأُنَبِّئُكُمْ بِأَوَّلِ ذَلِكَ دَعْوَةُ أَبِي إِبْرَاهِيمَ، وَبِشَارَةُ عِيسَى بِي، وَرُؤْيَا أُمِّي الَّتِي رَأَتْ، وَكَذَلِكَ أُمَّهَاتُ النَّبِيِّينَ يَرَين (مسند احمد) میں اللہ تعالیٰ کے نزدیک خاتم الانبیاء تھا درآنحالیکہ حضرت آدم اپنی مٹی میں گندھے ہوئے تھے، میں تمہیں اس کی ابتداء سناؤں، میں اپنے والد حضرت ابراہیم کی دعا، حضرت عیسیٰ کی بشارت اور اپنی ماں کا خواب ہوں، انبیاء کی والدہ اسی طرح خواب دکھائی جاتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ہمیں نجاشی بادشاہ حبشہ کے ہاں بھیج دیا تھا ہم تقریباً اسی آدمی تھے، ہم میں عبداللہ بن مسعود جعفر، عبداللہ بن عرفطہ، عثمان بن مظعون، ابو موسیٰ وغیرہ بھی تھے۔

ہمارے یہاں پہنچنے پر قریش نے یہ خبر پا کر ہمارے پیچھے اپنی طرف سے بادشاہ کے پاس اپنے دو سفیر بھیجے، عمرو بن عاص اور عمارہ بن ولید ان کے ساتھ دربار شاہی کے لئے تحفے بھی بھیجے، جب یہ آئے تو انہوں نے بادشاہ کے سامنے سجدہ کیا، پھر دائیں بائیں گھوم کر بیٹھ گئے، پھر اپنی درخواست پیش کی کہ ہمارے کنبے قبیلے کے چند لوگ ہمارے دین کو چھوڑ کر ہم سے بھاگ کر آپ کے ملک میں چلے آئے ہیں ہماری قوم نے ہمیں اس لئے آپ کی خدمت میں بھیجا ہے کہ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیجئے۔

نجاشی نے پوچھا وہ کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا یہیں اسی شہر میں ہیں حکم دیا کہ انہیں حاضر کرو چنانچہ یہ مسلمان صحابہ دربار میں آئے ان کے خطیب اس وقت حضرت جعفر تھے باقی لوگ ان کے ماتحت تھے یہ جب آئے تو انہوں نے سلام تو کیا لیکن سجدہ نہیں کیا درباریوں نے کہا تم بادشاہ کے سامنے سجدہ کیوں نہیں کرتے؟

جواب ملا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو سجدہ نہیں کرتے، پوچھا گیا کیوں؟ فرمایا إِنَّ اللّٰهَ بَعَثَ إِلَيْنَا رَسُولَهُ، فَأَمَرَنَا أَلَّا نَسْجُدَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلّٰهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَأَمَرَنَا بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول ﷺ ہماری طرف بھیجا اور اس رسول ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کو سجدہ نہ کریں اور حضور ﷺ نے ہمیں حکم دیا کہ ہم نمازیں پڑھتے رہیں زکوٰۃ ادا کرتے رہیں۔

اب عمرو بن عاص سے نہ رہا گیا کہ ایسا نہ ہو ان باتوں کا اثر بادشاہ پر پڑے درباریوں اور بادشاہ کو بھڑکانے کے لئے وہ بیچ میں بول پڑا کہ حضور ان کا اعتقاد حضرت عیسیٰ بن مریم کے بارے میں آپ لوگوں سے بالکل خلاف ہیں، اس پر بادشاہ نے پوچھا بتاؤ تم حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ کے بارے میں کیا عقیدہ رکھتے ہو؟ انہوں نے کہا ہمارا عقیدہ اس بارے میں وہی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنی پاک کتاب میں ہمیں تعلیم فرمایا کہ هُوَ كَلِمَةُ اللّٰهِ وَرُوحُهُ أَلْقَاهَا إِلَى الْعَذْرَاءِ الْبَتُولِ، الَّتِي لَمْ يَمَسَّهَا

بَشَرٍ وَلَمْ يَفْرِضْهَا وَلَدٌ، وہ کلمتہ اللہ ہیں روح اللہ ہیں جس روح کو اللہ تعالیٰ نے کنواری مریم بتول کی طرف القا کیا، جو کنواری تھیں، جنہیں کسی انسان نے ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا، نہ انہیں بچہ ہونے کا کوئی موقع تھا۔ بادشاہ نے یہ سن کر زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا اے حبشہ کے لوگو! اے واعظو! عالمو! اور درویشو! اللہ کی قسم! ہمارا اور ان کا اس کے بارے میں ایک ہی عقیدہ ہے، اللہ کی قسم ان کے اور ہمارے عقیدے میں اس تنکے جتنا بھی فرق نہیں۔ اے جماعت مہاجرین! تمہیں مرحبا ہو اور اس رسول ﷺ کو بھی مرحبا ہو، جن کے پاس سے تم آئے ہو،

أَشْهَدُ أَنَّهُ رَسُولُ اللهِ، وَأَنَّهُ الَّذِي نَجِدُ فِي الْإِنْجِيلِ، وَأَنَّهُ الَّذِي بَشَّرَ بِهِ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ، انْزِلُوا حَيْثُ شِئْتُمْ، وَاللهِ لَوْلَا مَا أَنَا فِيهِ مِنَ الْمُلْكِ لَأَتَيْتُهُ حَتَّى أَكُونَ أَنَا أَحْمِلُ نَعْلَيْهِ وَأُوَضِّئُهُ، میری گواہی ہے کہ وہ اللہ کے سچے رسول ہیں، یہ وہی ہیں جن کی پیش گوئی ہم نے انجیل میں پڑھی ہے اور یہ وہی ہیں جن کی بشارت ہمارے پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی ہے، میری طرف سے تمہیں عام اجازت ہے جہاں چاہو رہو سہو اللہ کی قسم اگر ملک کی اس جھنجٹ سے میں آزاد ہوتا تو میں یقیناً حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا، آپ ﷺ کی جوتیاں اٹھاتا، آپ ﷺ کی خدمت کرتا اور آپ ﷺ کو وضو کراتا۔ اتنا کہہ کر حکم دیا کہ یہ دونوں قریشی جو تحفہ لے کر آئے ہیں وہ انہیں واپس کر دیا جائے۔ ان مہاجرین کرام میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود تو جلد ہی حضور ﷺ سے آملے، جنگ بدر میں بھی آپ نے شرکت کی۔ اس شاہ حبشہ کے انتقال کی خبر جب حضور ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے ان کے لئے بخشش کی دعا مانگی۔

مفسر قرآن ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر فرمایا کہ اس واقعے کا یہاں بیان کرنے کا موقع نہیں تھا، اس واقعہ کی تفصیلات سیرت النبی ﷺ کی کتابوں میں موجود ہیں، لیکن ہم نے اس واقعہ کو نقل کرنے سے یہ ثابت کرنا تھا کہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام اپنی اپنی امتوں کے سامنے ہمارے نبی کریم ﷺ کا تذکرہ

کرتے رہے ہیں۔

علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس واقعہ کو بیان کرنے کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں

وَالْمَقْصِدُ أَنَّ الْأَنْبِيَاءَ عَلَيْهِمُ السَّلَامُ لَمْ تَزَلْ تَنْعَتُهُ وَتَحْكِيهِ فِي كُتُبِهَا عَلَى أُمَمِهَا، وَتَأْمُرُهُمْ بِاتِّبَاعِهِ وَنَصْرِهِ وَمُوَازَرَتِهِ إِذَا بُعِثَ. وَكَانَ مَا اشْتَهَرَ الْأَمْرُ فِي أَهْلِ الْأَرْضِ عَلَى لِسَانِ إِبْرَاهِيمَ الْخَلِيلِ وَالِدِ الْأَنْبِيَاءِ بَعْدَهُ، حِينَ دَعَا لِأَهْلِ مَكَّةَ أَنْ يَبْعَثَ اللهُ فِيهِمْ رَسُولًا مِنْهُمْ، وَكَذَا عَلَى لِسَانِ عِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ (تفسیر ابن کثیر)

ہمارا مقصود یہ ہے کہ عالی جناب حضور محمد مصطفیٰ ﷺ کی بابت اگلے انبیاء کرام علیہم السلام برابر پیشین گوئیاں کرتے رہے اور اپنی امت کو اپنی کتاب میں سے آپ کی صفتیں سناتے رہے اور آپ کی اتباع اور نصرت کا انہیں حکم کرتے رہے، ہاں آپ کے امر کی شہرت حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا کے بعد ہوئی جو تمام انبیاء کے باپ تھے، اسی طرح مزید شہرت کا باعث حضرت عیسیٰ کی بشارت سے ہوئی۔

جس حدیث میں آپ نے سائل کے سوال پر اپنے امر نبوت کی نسبت دعاء خلیل اور نوید مسیح کی طرف کی ہے اس سے یہی مراد ہے ان دونوں کے ساتھ آپ کا اپنی والدہ محترمہ کے خواب کا ذکر کرنا اس لئے تھا کہ اہل مکہ میں آپ کی شہرت کا باعث یہ خواب تھا، اللہ تعالیٰ آپ پر بیشمار درود ورحمت بھیجے۔

شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر لکھتے ہیں یعنی پچھلے کی تصدیق کرتا ہوں اور اگلے کی بشارت سناتا ہوں۔ یوں تو دوسرے انبیاء سابقین بھی خاتم الانبیاء ﷺ کی تشریف آوری کا مژدہ برابر سناتے آئے ہیں۔ لیکن جس صراحت و وضاحت اور اہتمام کے ساتھ حضرت مسیح علیہ السلام نے آپ ﷺ کی آمد کی خوشخبری دی وہ کسی اور سے منقول نہیں۔ شاید قریب عہد کی بناء پر یہ خصوصیت ان کے حصہ میں آئی ہوگی۔ کیونکہ ان کے بعد نبی آخر الزمان کے سوا کوئی دوسرا نبی آنے والا نہ تھا۔

یہ سچ ہے کہ یہود و نصاریٰ کی مجرمانہ غفلت اور متعصبانہ دستبرد نے آج دنیا کے ہاتھوں میں اصل تورات و انجیل وغیرہ کا کوئی صحیح نسخہ باقی نہیں چھوڑا جس سے ہم کو ٹھیک پتہ لگ سکتا کہ انبیائے سابقین خصوصاً مسیح علیٰ نبینا و علیہ السلام نے خاتم الانبیاء ﷺ کی نسبت کن الفاظ میں اور کس عنوان سے بشارت دی تھی۔ اور اسی لیے کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ قرآن کریم کے صاف و صریح بیان کو اس تحریف شدہ بائبل میں موجود نہ ہونے کی وجہ سے جھٹلانے لگے، تاہم یہ بھی خاتم الانبیاء ﷺ کا معجزہ سمجھنا چاہیے کہ حق تعالیٰ نے محرفین کو اس قدر قدرت نہیں دی کہ وہ اس کے آخری پیغمبر کے متعلق تمام پیشین گوئیوں کو بالکلیہ محو کر دیں کہ ان کا کچھ نشان باقی نہ رہے۔

موجودہ بائبل میں بھی بیسیوں مواضع ہیں جہاں آنحضرت ﷺ کا ذکر قریب تصریح کے موجود ہے اور عقل و انصاف والوں کے لیے اس میں تاویل و انکار کی قطعاً گنجائش نہیں۔ اور انجیل یوحنا میں تو فارقلیط (یا پیر کلوطوس) والی بشارت اتنی صاف ہے کہ اس کا بے تکلف مطلب بجز احمد (بمعنی محمود و ستودہ) کے کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ چنانچہ بعض علمائے اہل کتاب کو بھی ناگزیر اس کا اعتراف یا نیم اقرار کرنا پڑا ہے کہ اس پیشین گوئی کا انطباق پوری طرح نہ روح القدس پر اور نہ بجز سرور دو عالم ﷺ کسی اور پر ہو سکتا ہے۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت مسیح نے یہودیوں کو ہر چند یقین دلایا کہ میں تورات کی تصدیق کے لئے آیا ہوں، نئی شریعت کا موجد نہیں ہوں، مگر انہوں نے انکار کیا اور ہمیشہ یہی کہا کہ ہم تم کو پیغمبر ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پھر انہوں نے اس صداقت کبریٰ کا بھی اعلان کیا کہ میرے سعید زمانہ کے بعد تمہارے پاس اللہ کا رسول آئے گا، جس کا نام احمد ہو گا، جو اللہ کی حمد کے ترانے دنیا کے کانوں تک پہنچائے گا، مگر خود اس کے ماننے والوں نے جب کہ وہ احمد ﷺ نامی ذات مبعوث ہوئی، تو باوصف دلائل پیش کئے جانے کے ماننے سے انکار کیا اور صاف صاف کہہ دیا کہ ہم بنی اسماعیل میں اس شرف و بزرگی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ (تفسیر سراج البیان)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یہ کہنا کہ، میں تورات کا مصدق (تصدیق کنندہ) ہوں اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں ان بشارتوں کا مصدق ہوں جو میری آمد کے متعلق تورات میں موجود ہیں، لہذا میری مخالفت کے بجائے تمہیں چاہیے کہ میرا خیر مقدم کرو اور اس کے بعد والے فقرے کو ملا کر پڑھیں تو اس کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ میں اللہ کا رسول احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تورات کی دی ہوئی بشارت کی تصدیق کرتا ہوں اور خود بھی ان کے آنے کی بشارت دیتا ہوں تورات میں جو بشارت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مذکور ہے وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان سے دی گئی ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کی تصدیق کا اعلان کیا ہے۔

چنانچہ باب ۱۸ آیات ۱۵ تا ۱۹، استثناء میں مذکور ہے، میں ان کے لیے انہی بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں حکم دوں گا، وہ وہی ان سے کہے گا۔ تورات کی یہ صریح پیش گوئی ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور پر چسپاں نہیں ہو سکتی، اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو یہ ارشاد سنا رہے ہیں کہ میں تیرے ہی بھائیوں سے ایک نبی برپا کروں گا اور بنی اسرائیل کے بھائیوں سے مراد لامحالہ بنو اسماعیل ہیں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد سے ہونے کی وجہ سے ان کے بھی رشتہ دار ہیں۔

دوسری بات جو پیش گوئی میں ہے وہ یہ ہے کہ جو نبی برپا کیا جائے گا وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند ہو گا، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مانند مستقل شریعت کا حامل ہو گا، اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد گو بہت سے نبی ہوئے لیکن مستقل شریعت لانے والے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں۔

نیز اس آیت میں حضرت عیسیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی نام لے کر آپ کی آمد کی بشارت دی ہے اور تورات میں فارقلیط (پیرا کلیٹس) والی پیش گوئی حرف بحرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے جس کے معنی، محمد، کے ہیں، یونانی میں برقلیطس ہے، اصل لفظ سریانی، منحمنا، ہے اور اس کی انجیل میں توصاف طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش گوئیاں موجود ہیں۔

تفسیر حقانی کے مصنف علامہ عبدالحق حقانی رحمہ اللہ نے اس مقام پر سابقہ کتابوں کی اصل صورتحال سے پردہ اٹھاتے ہوئے حضرت عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کی طرف سے گئی بشارت کو بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اب ہم مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ يَّاْتِيْ مِنْۢ بَعْدِي اسْمُهٗٓ اَحْمَدُ کی تفسیر کرتے ہیں۔ ان اناجیل میں بھی کہیں اس کا نام ونشان ان دیندار عیسائیوں کے ہاتھ سے جو قصداً تحریف کیا کرتے تھے باقی رہ گیا ہے کہ نہیں؟ انجیل یوحنا میں جانے کیونکر اس بشارت کو ان دینداروں نے باقی رہنے دیا اس انجیل میں متعدد جگہ اس بشارت کا پتا ملتا ہے۔ میں انجیل یوحنا جو عربی زبان میں ترجمہ ہو کر شہر لنڈن میں ۱۸۳۳ء و ۱۸۳۱ء میں چھپی ہے اس سے نقل کرتا ہوں۔

چودھویں باب کا سولہواں جملہ یہ ہے۔ قولہ " اور میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا اور وہ تمہیں اور فارقلیط دے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے (یعنی روح حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے نہ جانتی ہے لیکن تم اسے جانتے ہو کیونکہ وہ تمہارے ساتھ رہتی ہے اور تم میں ہو ویگی"۔(۲۶۔) "لیکن وہ فارقلیط (جو روح حق ہے) جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہ تمہیں سب چیزیں سکھادے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں یاد دلائے گا"۲۹)اور اب میں نے تمہیں اس کے واقع ہونے سے پیشتر کہا کہ جب وہ واقع ہو تو ایمان لاؤ(۳۰)بعد اس کے میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا، اس لیے کہ اس جہان کا سردار آتا ہے اور مجبور ہیں اس کی کوئی بات نہیں۔۱۵باب۲۶درس)پھر جب وہ فارقلیط جسے میں تمہارے لیے باپ کی طرف سے بھیجوں گا (یعنی روح حق جو باپ سے نکلتی ہے) آئے تو وہ میرے لیے گواہی دے گا اور تم بھی گواہی دوگے کیونکہ تم شروع سے میرے ساتھ ہو"۔۱۶۔ باب ۷ درس۔

"لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمہارے لیے میرا جانا ہی بہتر ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے پس اگر میں جاؤں تو اس کو تمہارے پاس بھیج دوں گا"(۸)"اور وہ اگر

دنیا کو گناہ پر اور راستی پر اور عدالت پر سزا دے گا گناہ پر اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لائے، راستی پر اس لیے کہ میں باپ پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے عدالت پر اس لیے کہ اس جہان کے سردار پر حکم کیا گیا، میری اور بہت باتیں ہیں کہ جن کو تم سے کہوں لیکن تم ان کی اب برداشت نہ کر سکو گے پھر جب روح حق آئے گا تو ساری سچائی کی راہ تم کو بتا دے گا کس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں غیب کی خبریں دے گا اور میری بزرگی بیان کرے گا"۔

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام یوحنا حواری نقل کرتا ہے جو حضرت علیہ السلام نے اپنے ساتھ یہود کی بدسلوکی اور تدبیر قتل سے خبر پا کر حواریوں سے کیا تھا۔ اس کلام میں آپ اپنا دنیا سے تشریف لے جانا ظاہر فرماتے ہیں اور حواریوں کے غمگین دلوں کو ایک آنے والے فارقلیط سے تسلی دیتے ہیں اور یہ بھی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ فارقلیط آکر میری بزرگی بیان کرے گا اور جن لوگوں نے مجھے نہیں مانا اور مجھ پر موت کا حکم لگایا یعنی ان کو ملزم اور سزاوار ٹھہرائے گا اور وہ فارقلیط جہان کا سردار اور مجھ سے زیادہ بلند مرتبہ ہے اس کی کوئی بات مجھ میں نہیں۔

ہم کہتے ہیں یہ بشارت ہمارے نبی پاک کی ہے۔ آنحضرت ﷺ کے تشریف لانے کی آپ بشارت دے رہے ہیں اور آنحضرت ﷺ کا نام احمد بھی ظاہر کر رہے ہیں کس لیے کہ عیسیٰ علیہ السلام عبرانی زبان میں کلام کرتے تھے اور عبرانی میں صاف احمد ﷺ کا لفظ ذکر کیا تھا۔

اہل کتاب کی عادت ہے کہ وہ جب کسی کلام کا ترجمہ کرنے بیٹھتے ہیں تو ناموں کا بھی ترجمہ کر دیا کرتے ہیں اس کے بہت سے نظائر موجود ہیں۔ پھر جب یوحنا کے کلام کا یونانی میں ترجمہ کیا تو احمد ﷺ کا ترجمہ بھی کر دیا اور یونانی زبان میں پیر کلوطوس لکھ دیا جس کے معنی ہیں احمد ﷺ یعنی بہت سراہا گیا یا بہت حمد کرنے والا۔ پھر جب یونانی سے عبرانی میں ترجمہ کیا تو اس کا معرب فارقلیط کر دیا۔ (تفسیر حقانی)

عیسائی کہتے ہیں یونانی نسخوں میں پاراکلی طوس ہے جس کے معنی معین، وکیل کے ہیں، اگر پیر کلوطوس ہو تو بیشک احمد یا محمد ﷺ کے قریب قریب اس کے معنٰی ہوتے ہیں، اول تو یہ کچھ بڑا تفاوت نہیں کس لیے کہ بعض زبانوں میں رسم الخط دیکھا جاتا ہے کہ وہ اعراب کی جگہ حروف مفردہ ہی لاتے ہیں اور بعض خطوط میں سرے سے اعراب ہی نہیں جیسا کہ ہندی خط اس میں ایسے اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔

قدیم یونانی خط کا بھی یہی حال ہے، اس میں گل کو گال، گیل ہر طرح سے پڑھ سکتے ہیں، پھر پیر کا تلفظ پارا اور کلو کا کلا یا کلے کوئی بڑی بات اور زیادہ تفاوت نہیں۔ دوم یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ یہ تفاوت تلفظ اور خط میں اعراب نہ ہونے کے سبب سے نہیں بلکہ دراصل یوں ہی ہے جیسا کہ کہتے ہیں تو بھی ہمارا مدعا ثابت ہے کس لیے کہ ہمارے حضرت ﷺ کا نام معین اور وکیل بھی ہے، تو بھی ایک نام سے نہیں دوسرے نام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بشارت دینا ثابت ہوتا ہے۔

سوم جن دینداروں نے بقول ہارون صاحب اعتراض سے بچنے کے لیے یا مخالف کا مدعا ثابت نہ ہونے دینے کی وجہ سے یا اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے انجیل و توریت میں بہت جگہ تحریف و تبدیل کی ہے اور عبارت کو گھٹایا یا بڑھایا ہے تو یہ ذرا سی تحریف و تبدیل ان سے کیا بعید ہے؟ ایسی کمی و بیشی کرنے سے عیسائیوں نے فارقلیط کے آنے سے روح کا نازل ہونا مراد لے لیا اور پھر اس مطلب کو قوی کرنے کے لیے یہاں تک خیانت کی کہ متن میں یعنی کر کے روح کی تفسیر کو بھی ملا دیا۔

یہ ظاہر ہے کہ یہ یعنی تو حضرت مسیح علیہ السلام کا کلام نہیں نہ یوحنا نے بڑھایا، یہ تو بعد میں کسی دیندار پادری صاحب نے کاریگری کی ہے مگر بڑے شرم کی بات ہے کہ عبارت میں تحریف آپ پکار رہی کہ مجھ میں تحریف ہو اور پادری صاحب ہیں کہ انکار کر رہے ہیں، یہ وہی مثل ہے کہ غلامی کا داغ ماتھے پر موجود مگر غلامی کا انکار۔

اگر پادری صاحبوں کے اگلے بزرگواروں کو اتنی گنجائش اس بشارت میں نہ ملی کہ وہ اس کو نزول روح پر چسپاں کرتے تھے تو بخدائے لایزال اس کو کتاب ہی میں سے نکال ڈالتے مگر ان کو یہ کیا خبر تھی کہ اس بشارت میں جو اور بھی الفاظ ہیں وہ اس کو نزول روح پر چسپاں نہیں ہونے دیں گی اور مسلمانوں کے ہاتھ میں ایک حجت الزامی آجائے گی۔

اور ایک تعجب کی بات ہے کہ ستر برس بعد یوحنا حواری کو تو یہ بشارت یاد رہی کہ اس نے اپنی کتاب میں لکھ دی مگر متی اور مرقس اور لوقا کو ان سے پہلے یاد نہ آئی ان میں سے کسی نے بھی اس کا ذکر تک نہیں کیا اور یہ کوئی ایسی چھوٹی بات نہیں تھی بلکہ اپنے سے زیادہ مرتبے والے کے آنے کی خبر تھی جس پر ایمان لانے کے لیے حضرت مسیح علیہ السلام نے کیسا اہتمام کیا، ہمارا یقین ہے کہ ضرور ذکر کیا ہو گا مگر اس وقت یا اس کے بعد یاروں نے اس کا باقی رکھنا مصلحت نہ سمجھا کس لیے کہ ان کی بشارتوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کا پورا پورا پتا ہو گا تاویل کی گنجائش نہ ہو گی۔

اس کتاب میں تاویل کی گنجائش دیکھی اس کو رہنے دیا مگر کسی قدر ادھر ادھر سے تراش کر اپنے موافق کر لیا مگر تو بھی موافق نہ ہوئی اور ان الحاقات اور کتابوں میں گھٹاؤ بڑھاؤ کرنے کا حال ہمارے بیان سابق سے جو کتب مقدسہ کی بابت تھا آپ کو بخوبی معلوم ہو گیا ہو گا۔

دو امر اور بھی غور طلب ہیں اول یہ کہ ہمارے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے پہلے تک اس فارقلیط کو عیسائی کوئی آدمی اور بڑا اولوالعزم شخص خیال کرتے تھے کہ ضرور ایک ایسا شخص جو دین عیسوی کا معین اور مددگار اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا طرفدار ظاہر ہو گا اور اس لیے دوسری صدی عیسوی میں منتس عیسائی نے جو بڑا پرہیزگار اور عالم تھا یہ دعویٰ کیا تھا کہ جس کے آنے کی حضرت مسیح علیہ السلام نے خبر دی ہے اور ایشیائے کوچک میں ہزاروں عیسائی اس پر ایمان لے آئے۔ (دیکھو تاریخ کلیسا ولیم میور مطبوعہ ۱۸۴۸ء) اس کے سوا دوستھیوس، شمعون مجوسی وغیرہ چوبیس اشخاص نے آدرین

قیصر کے عہد سے لے کر سن ایک ہزار چھ سو بیاسی ۱۶۸۲ء کے قریب تک فارقلیط ہونے کا دعویٰ کیا۔ (تفسیر رومن اسکاٹ مطبوعہ الٰہ آباد صفحہ ۱۸۶) ۔

پھر کیا ان کو انجیل یوحنا بھی معلوم نہ تھی اور پادریوں کی بھی تاویل سے واقف نہ تھے کہ فارقلیط سے روح مراد ہے نہ کہ انسان۔ ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو ایک شے بقول پادریان سرے سے ہی نہیں تو اس کا ان لوگوں نے کیونکر دعویٰ کر لیا؟ یہ بات اور ہے کہ وہ دراصل اس فارقلیط کے مصداق نہ تھے مگر اس زمانے میں یہ بات ہر ایک عیسائی جانتا تھا کہ فارقلیط کوئی انسان آنے والا ہے جیسا کہ اسلامیوں میں مہدی آخر الزمان کے آنے کی ایک ایسی مشہور خبر ہے کہ جس کو سب جانتے ہیں اس بناء پر آج تک بہت سے بوالہوسوں نے مہدی ہونے کا دعویٰ کر دیا۔ اگر مسلمان اس کو جانتے ہی نہ ہوتے یا وہ مہدی سے مراد کسی فرشتہ کا نازل ہونا لیتے کہ وہ صحابہ کے عہد میں نازل ہو چکا تو پھر کسی کو بھی اس عہدے کی تمنا نہ ہوتی۔ (تفسیر حقانی)

لب التواریخ کا مصنف لکھتا ہے کہ "محمد ﷺ کے معاصر یہودی اور عیسائی ایک نبی کے منتظر تھے۔ اس بات نے محمد ﷺ کو فائدہ بخشا اور آپ نے کہہ دیا وہ میں ہوں"۔ انتہٰی۔

وہ نبی حضرت عیسیٰ و یحییٰ علیہما السلام کے ظاہر ہونے کے بعد تک بھی انتظار کیا جاتا تھا۔ دوم بہت سے عیسائیوں نے جو آنحضرت ﷺ کے عہد میں تھے اس بات کا اقرار کیا کہ آپ کا ذکر انجیل میں ہے منجملہ ان کے حبشہ کا بادشاہ نجاشی جو انجیل و توریت کا بڑا عالم تھا منجملہ ان کے جارود بن علاء ہے جو عیسائی اور بڑا عالم تھا اپنی قوم کے ساتھ حاضر خدمت ہو کر اسلام لایا اور اقرار کیا کہ آپ کا ذکر انجیل میں ہے۔ معلوم ہوا کہ اس وقت تک یہ بشارت ان حبشی اور عربی عیسائیوں میں بدلی نہیں گئی تھی۔ اب ہم لفظ فارقلیط پر اور دیگر الفاظ پر بحث کرتے ہیں اور عیسائیوں کے شبہات کا جواب دیتے ہیں۔

بحث اول۔ فارقلیط: یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ اس میں کئی اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں زبان خالدیہ کا لفظ ہے جو بابل اور اس کے اطراف کی زبان تھی اور اسی کو کلدیہ اور کلدانی بھی کہتے ہیں مگر مجھے اس میں کلام ہے کس لیے کہ یہ بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زبان مبارک سے فرمائی تھی اور یہ مسلم ہے کہ حضرت کی زبان عبرانی تھی جو ملک یہودیہ کی زبان ہے۔ آپ کو کلدانی زبان کا لفظ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

مگر یہ ممکن ہے کہ کلدانیوں کے غلبہ سے اور بنی اسرائیل کے مدت درازان میں رہنے سے اس زبان کے الفاظ بھی عبرانی میں شامل ہوگئے ہوں جیسا کہ اور زبانوں میں اختلاط ہوا اور ہوتا رہتا ہے۔ اس تقدیر پر یہ لفظ خاص حضرت علیہ السلام کے منہ مبارک کا نکلا ہوا ہے پھر یونانی میں یا تو اس کا ترجمہ پیر کلوطس کیا گیا یا تغیر کر کے لایا گیا جس کے معنی احمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہیں۔ بشپ مارش اسی کے قائل تھے جو عیسائیوں میں مسلم شخص تھے۔

دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے یعنی ملک سریا یا شام کی زبان کا۔ تیسرا یہ کہ یہ عربی لفظ ہے۔ بشپ مذکور ان دونوں قولوں کو بھی مانتے ہیں مگر زبان عرب میں اس کا پتا نہیں معلوم ہوتا۔

چوتھا قول وہ ہے کہ جس کو ہم نے پہلے فاضل محقق مولانا مولوی محمد رحمت اللہ صاحب مرحوم کی کتاب اظہار الحق سے نقل کیا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے عبرانی زبان میں پیشین گوئی کی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص نام احمد صلی اللہ علیہ وسلم لیا مگر جب اس کا یونانی زبان میں ترجمہ ہوا تو اس کے ہم معنی لفظ پیر کلوطوس ذکر کیا جس کا معرب فارقلیط ہوا اور یونانی زبان میں پیر کلوس ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے کہ سینٹ جروم نے جب انجیل کا ترجمہ لاطینی زبان میں لکھنا شروع کیا تو پیر کلوس کی جگہ پارا کلوس لکھ دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس کتاب سے نقل کیا تھا پیر کلوس تھا۔ دستی تحریروں کا غارت ہونا اس گمان کی اور

بھی مدد کرتا ہے۔ اور لفظ پیر کلوس ہومر وغیرہ شعراء و فضلاء کے استعمال میں آیا ہے جس کے معنی ستودہ ہیں جو محمد ﷺ یا احمد ﷺ کا ٹھیک ہم معنی ہے۔ (تفسیر حقانی)

اس کے علاوہ ایک بڑی تائید اور بھی ہے وہ یہ کہ بعض عبرانی نسخوں میں اب تک آنحضرت ﷺ کا نام مبارک موجود ہے۔ دیکھو پادری پارکھرست صاحب کی یہ عبارت وباوحمدہ حل بگویئم (از حمایت الاسلام مطبوعہ بریلی ۱۸۷۳ء صفحہ ۸۱۔۸۴ ترجمہ اپالوجی گاڈ فری ہیگنس صاحب مطبوعہ لنڈن ۱۸۲۹ء)۔

واضح ہو کہ عرب میں آنحضرت ﷺ کے عہد میں عیسائیوں کا ایک فرقہ تھا جو آج کل کے پر اٹسٹنٹ فرقے اور رومن کاتھولک سے بھی علیحدہ تھا وہ نسطورا کا فرقہ کہلاتا تھا ان کے پاس ان چاروں انجیلوں کے علاوہ ایک اور بھی انجیل تھی جس کو اب کے عیسائی انجیل طفولیت کہتے ہیں جو ان کی کتب الہامیہ کی فہرست سے خارج شمار ہے۔

خیر یہ جو چاہیں کہیں اس کی تحقیق یورپین عیسائیوں کو ہوئی ہو گی مگر وہ تو اسی کو اصلی اور الہامی انجیل کہا کرتے تھے۔ اس کے سوا وہ کسی انجیل کے معتقد نہ تھے۔ یہ چاروں انجیلیں تو انہوں نے آنکھ سے بھی نہیں دیکھی تھیں پھر جب انہوں نے نہیں دیکھیں تو مسلمانوں کو خصوصاً ایسی حالت میں جو ان پر طاری تھی کہاں سے مل گئی ہوں گی؟ جو گمان کیا جائے کہ ان سے دیکھ کر آنحضرت ﷺ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اپنے لیے پیشین گوئی بنالی ہو۔ یہ گمان محض فاسد ہے اور بالکل بے اصل بدگمانی ہے۔

عرب کے عیسائیوں میں سے اس پیشین گوئی کے اظہار سے پہلے ایسے لوگ اسلام میں داخل ہو چکے تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی اس پیشین گوئی کو آپ کے حق میں پورا پورا مطابق پالیا تھا اور اس پیشین گوئی کے اظہار کے بعد ان عیسائیوں کو بھی یہ حوصلہ نہ ہوا جو کہ ابھی اسلام میں

داخل نہیں ہوئے تھے اور اسلام کی تکذیب میں نہایت سرگرم تھے کہ وہ کہتے یہ غلط بات ہے۔ ہرگز حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے آپ کی پیشین گوئی نہیں کی، اگر ان کی انجیل میں آپ کے نام سے یہ پیشین گوئی نہ ہوتی یا ان کو ذرا بھی تامل کرنے کی گنجائش ملتی تو وہ بغیر غل شور مچائے کبھی چپ نہ رہتے نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس دعوے سے پیشین گوئی کا اظہار فرماتے۔ یہ بات حیطہ ادراک سے باہر ہے۔ کوئی دانشمند بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ (حقانی)

عیسائیوں میں برنباس حواری کی بھی ایک انجیل ہے، گو یہ عیسائی اس کو الہامی نہیں مانتے، یہ ان کو اختیار ہے کہ لوقا اور مرقس کی کتاب کو الہامی مانیں اور اس کی نہیں، اس کی کوئی کھلی ہوئی دلیل بجز گمان اور قیاس یا حسن ظن کے اور کوئی بات ہم کو تو اب تک معلوم نہیں ہوئی لیکن بایں ہمہ وہ اس کو معتبر جانتے ہیں، اس انجیل میں صاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پاک کی تصریح ہے۔

اس کے جواب میں عیسائی یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ یہ کسی مسلمان کی تحریف ہے یا کسی ملحد نے بات بنائی، مگر تعجب ہے کہ مسلمان کو دنیا بھر کے نسخے کہاں سے مل گئے کہ اس نے سب میں تحریف کر دی، جس انجیل برنباس کو دیکھئے اس میں بھی بشارت ہے اور ملحد کو پہلے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام مبارک کہاں سے معلوم ہو گیا تھا جو اس نے انجیل میں داخل کر دیا؟

یہ سب جھوٹے حیلے ہیں جن کو عقل سلیم ہرگز قبول نہیں کرتی اس کے سوا اور بہت جگہ بائبل میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیاں ہیں جو بجز ذات بابرکات کے اوپر صادق نہیں آتیں پھر کیا وہ بھی کسی مسلمان نے لکھ دیں یا کسی ملحد نے داخل کر دیں؟ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پادریوں کی کتابوں میں ملحد آمیزش کر دیا کرتے ہیں۔ (بحوالہ تفسیر حقانی)

حضرت مولانا عبدالحق حقانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں اب ہم انجیل یوحنا کی پیشین گوئی کے اور الفاظ پر بحث کرتے ہیں جو نزول روح القدس پر کسی طرح صادق نہیں آتے۔ ① ”میں اپنے باپ سے درخواست

کروں گا اور وہ تمہیں اور فارقلیط دے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے" اس سے مراد روح القدس نہیں ہو سکتا کس لیے کہ وہ ہمیشہ ان کے ساتھ نہیں رہا بلکہ ایک دن تھوڑی سی دیر تک، پھر عمر بھر وہ بات نصیب نہیں ہوئی۔

② روح حق تمہیں سب وہ باتیں جو میں نے کہیں بتادے گا" روح القدس جب حواریوں پر اترا اس نے ان کو وہ سب باتیں جو مسیح علیہ السلام نے کہیں تھیں یاد نہیں دلائیں اور نہ وہ بھولے ہوئے تھے کہ یاد دلانا پڑتا بلکہ مختلف زبانیں بولنے بولنے لگے تھے، البتہ بھولی ہوئی باتیں توحید و عباداتِ الٰہی، ترک شہوات، دارِ آخرت کی رغبت وغیرہ نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے یاد دلائیں۔

③ میں نے واقع ہونے سے پہلے تم کو خبر کر دی تاکہ جب واقع ہو تو ایمان لاؤ، اس سے بھی معلوم ہوا کہ ایک ایسی چیز کے واقع ہونے کی خبر دیتے ہیں کہ جس کا انکار ان سے قریب الوقوع تھا اس لیے تاکید اور بندوبست کر دیا کہ ایمان لائیں انکار نہ کریں۔ یہ روح القدس کے نازل ہونے پر صادق نہیں آتا کس لیے کہ اول تو روح القدس کا نازل ہونا حواری پہلے بھی دیکھ چکے تھے۔ دوم وہ ایک حالت سی تھی جس پر طاری ہو اس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا ہاں خاتم المرسلین کا انکار بہت قریب القیاس تھا اور اب تک ہو رہا ہے، حیلے بہانے بنا رہے ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کہنے کو بھی ٹال دیا۔

④ اس جہان کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی بات نہیں، روح القدس اور باپ یعنی خدا اور بیٹا یعنی عیسیٰ علیہ السلام یہ تینوں تو عیسائیوں کے نزدیک ایسے ایک ہیں کہ مجموعہ مرکب بنا کر خدا کہا جاتا ہے پھر روح القدس عیسیٰ اور عیسیٰ روح القدس ہیں اگر وہ جہان کے سردار ہیں تو اب بھی جو کچھ ایک میں ہے وہ دوسرے میں ہے۔ پھر یہ جملہ اس پر کس طرح صادق آسکتا ہے؟ ہاں محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتا ہے کس لیے کہ وہ جہان کے نبی تھے اور نبی سردار ہوتا ہے۔ یہ اوصاف حضرت مسیح علیہ السلام میں کہاں تھے؟

⑤ فارقلیط آکر میرے لیے گواہی دے گا، روح القدس نے اول تو گواہی نہیں دی اور جو دی بھی تو صرف حواریوں کے سامنے جس کی کوئی بھی ضرورت نہ تھی، بر خلاف آنحضرت ﷺ کے کہ آپ نے تمام دنیا کے سامنے عیسیٰ علیہ السلام کی گواہی دی یہود کو ملزم کیا۔

⑥ میں نہ جاؤں تو فارقلیط تمہارے پاس نہ آئے، یہ بھی روح القدس پر صادق نہیں آتا کس لیے کہ روح القدس اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تو اتحاد مانا جاتا ہے۔ پھر اگر نہ جاؤں تو نہ آئے گا کیا معنیٰ رکھتا ہے؟ البتہ یہ بات آنحضرت ﷺ پر پوری صادق ہے کس لیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور آنحضرت ﷺ میں تقدم اور تاخر زمانی ہے آپ کا دور تمام نہ ہو لے تو دوسرا شروع نہ ہو۔

⑦ روح الحق آکر دنیا کو گناہ اور راستی اور عدالت پر سزا دے گا، یہ بھی حرف آنحضرت ﷺ پر صادق آتا ہے کس لیے کہ روح نے کسی کو کچھ سزا تو کیا ملزم بھی نہیں کیا مگر آنحضرت ﷺ نے منکرین مسیح کو خطاکار ہی ثابت نہیں کیا بلکہ انتقام بھی لیا اور اس فقرے کے لفظ یہی اشارہ کر رہے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے کسی ذی شوکت منتقم کے آنے کی خبر دے کر حواریوں کو یہود کی جفاکاری اور ستم پروری پر تسلی دے رہے ہیں۔

⑧ روح حق تم کو ساری سچائی کی باتیں بتادے گا، روح القدس نے کوئی بات حواریوں کو نہیں بتائی، ہاں آنحضرت ﷺ نے بھولے نصاریٰ کو ضرور رستہ بتایا۔

⑨ جو سنے گا وہی کہے گا اور غیب کی خبریں بتائے گا، روح القدس تو عیسائیوں کے نزدیک عین خدا یا جزوِ خدا ہے پھر سننا چہ معنی؟ ہاں محمد ﷺ نہ خدا ہیں نہ اس کے جز۔ وہ اپنی طرف سے کچھ نہیں کہتے تھے۔ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ آپ نے دار آخرت اور صفات کے متعلق جو غیب ہے سینکڑوں خبریں بتائیں جن کی ضرورت تھی مگر عیسائیوں کے روح القدس نے اس روز کچھ نہ بتائیں۔

باایں ہمہ جب وہ فارقلیط ﷺ اور اپنے ساتھ معجزات و آیات بینات بھی لایا کَمَا قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فَلَمَّا جَآءَ ھُم بِالبَیِّنٰت قَالُوا۔ تو ازلی گمراہوں نے بجائے اس کے کہ اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وصیت کے مطابق قبول کرتے یہی کہہ دیا ھٰذَا سِحرٌ مُّبِینٌ کہ یہ تو کھلا ہوا سحر ہے اور صاف جادو ہے۔

یہ بات عرب کے مشرکین نے بھی کہی اور عیسائی فرقے بھی ان کے ہم زبان ہو گئے، جہالت و وحشت میں یہ عیسائی ان مشرکین عرب سے کم نہ تھے۔

بعض مفسرین کہتے ہیں فَلَمَّا جَآءَ کی ضمیر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے پھرتی ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان یہود کے پاس معجزات لے کر آئے تو کہنے لگے کہ یہ جادو ہے کھلا ہوا، مگر سباق کلام پہلے معنیٰ کی تائید کرتا ہے۔

آیات کی تفسیر کے بعد یہ بھی کہتا ہوں کہ انجیل یوحنا سے جو ہم نے فارقلیط کی بشارت نقل کی وہ اس مقام کے مطابق تھی ورنہ اس کے سوا اب بھی جس قدر پیشین گوئیاں بائبل یعنی توریت و اناجیل و صحف انبیاء علیہم السلام سے آنحضرت ﷺ کے حق میں پائی جاتی ہیں اور کسی کے حق میں نہیں اس کے سوا صدہا دلائل حضرت ﷺ کی نبوت پر آفتاب سے زیادہ روشن موجود ہیں لیکن کور باطنی اور شقاوت ازلی کا کوئی علاج نہیں، وہ سب کی طرف سے آنکھوں پر پردہ ڈالتی ہے، کانوں میں ٹینٹیاں ٹھونس دیتی ہے، دلوں پر مہر کر دیتی ہے، پھر ان کو ان گہری اندھیریوں کی تہوں میں سے کون نور کی طرف لا سکتا ہے، مرنے کے بعد یہی ظلمات جہنم بن کر ہمیشہ جلاویں گی۔ (تفسیر حقانی)

اگر ذرا بھی انصاف ہو اور کچھ بھی فہم سلیم ہو تو کسی عیسائی کو آنحضرت ﷺ سے انکار اور عداوت کی گنجائش نہیں کس لیے کہ آپ اصل عیسوی مذہب کے سرمو مخالف نہیں نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر، نہ حواریوں کے خلاف، ہاں اگر خلاف ہیں تو ان ہی زیادتیوں میں جو مسیح علیہ السلام کے بعد لوگوں نے دین عیسوی کا جزو قرار دے لیں اور پھر اندھے مقلد بن کر ان کی تحقیقات اور سمجھنے میں کوشش کرنا ممنوع قرار دے لیا۔ روشن دماغ عیسائی آنحضرت ﷺ کو دین عیسوی کا مصلح سمجھتا ہے۔ (حقانی)

سابقہ الہامی کتب میں ہمارے پیارے نبی حضرت محمد ﷺ کے بارے میں بشارتیں موجود ہیں، جنہیں زعمائے امت نے بسیار تلاش اور محنت کے ساتھ اپنی تصانیف میں جمع فرمایا ہے، شیخ المحدثین حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب سیرت مصطفےٰ ﷺ کی تیسری جلد میں قریباً ایک سو صفحات، اپنی کتاب بشائر النبیین میں قریباً سوا سو صفحات، علامہ شبلی نعمانی نے اپنی کتاب سیرت النبی ﷺ کی تیسری جلد میں مختصراً اور مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب اظہار الحق کی تیسری جلد میں قریباً ڈیڑھ سو صفحات پر مشتمل ان بشارتوں کو نقل فرمایا ہے۔

کتاب استثناء میں بشارت: اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں، میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے حکم دوں گا وہی وہ اُن سے کہے گا اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا، لیکن جو نبی گستاخ بن کر کوئی ایسی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اس کو حکم نہیں دیا، یا اور معبودوں کے نام سے کچھ کہے تو وہ نبی قتل کیا جائے اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ جو بات خداوند نے نہیں کہی ہے اسے ہم کیونکر پہچانیں؟ تو پہچان یہ ہے کہ جب وہ نبی ﷺ خدا کے نام سے کچھ کہے اور اس کے کہے کے مطابق کچھ واقع یا پورا نہ ہو تو وہ بات خداوند کی کہی ہوئی نہیں بلکہ اس نبی نے وہ بات خود گستاخ بن کر کہی ہے تو اس سے خوف نہ کرنا۔ (آیات ۱۷ تا ۲۲)

کتاب استثناء کی یہ چند آیات نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ ”اظہار الحق“ میں ارشاد فرماتے ہیں کہ یہ بشارت نہ یوشع کی بشارت ہے جیسا کہ علماء یہود کا خیال ہے اور نہ عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت ہے جیسا کہ علماء پروٹسٹنٹ کا دعویٰ ہے بلکہ یہ دس وجوہ کی بناء پر محمد ﷺ کی بشارت ہے۔

پہلی دلیل: جو یہودی عیسیٰ علیہ السلام کے ہم عصر تھے وہ ایک دوسرے نبی کے منتظر تھے، جس کی اس باب میں بشارت دی گئی تھی، ان کے نزدیک یہ شخص جس کی بشارت دی گئی عیسیٰ کے علاوہ کوئی دوسرا ہی تھا، لہذا یہ نبی جس کی بشارت دی گئی تھی، یوشع ہو سکتے ہیں اور نہ عیسیٰ ہو سکتے ہیں۔

دوسری دلیل: اس بشارت میں لفظ "تیری مانند" واقع ہوا ہے اور یوشع اور عیسیٰ علیہ السلام پر یہ بات صادق نہیں آتی کہ وہ موسیٰ علیہ السلام جیسے ہوں اول تو اس لیے کہ یہ دونوں بزرگ اسرائیلی ہیں اور یہ بات غیر ممکن ہے کہ بنی اسرائیل میں موسیٰ جیسا کوئی دوسرا پیدا ہو سکے جیسا کہ سفر استثناء باب ۳۴ کی مندرجہ ذیل آیت ۱۰ اس پر دلالت کر رہی ہے کہ بنی اسرائیل میں کوئی نبی موسیٰ کی مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں نہیں اٹھا۔ اب اگر کوئی شخص موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں ان جیسا پیدا ہو جائے تو اس قول کا جھوٹا ہونا لازم آئے گا۔

دوسرے اس لیے کہ موسیٰ اور یوشع میں کوئی بھی مماثلت موجود نہیں ہے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام صاحب کتاب اور ایسی نئی شریعت رکھتے ہیں جو اوامر و نواہی پر مشتمل ہے، اس کے برعکس یوشع ایسے نہیں ہیں، بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی شریعت کے تابع تھے۔

اسی طرح موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کے درمیان کامل طور پر مماثلت نہیں پائی جاتی، کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام عیسائی نظریہ کے مطابق خدا اور رب ہیں اور موسیٰ علیہ السلام ان کے محض ایک بندے ہیں، اسی طرح عیسائی مسلک کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام مخلوق کی شفاعت کی بناء پر ملعون ہو چکے ہیں، جیسا کہ پولس نے گلیتوں کے نام خط کے باب نمبر ۳ میں تصریح کی ہے اور موسیٰ ملعون نہیں ہوئے، اسی طرح عیسیٰ علیہ السلام اپنے مرنے کے بعد جہنم میں داخل ہوئے جیسا کہ عیسائیوں کے عقائد میں اس کی تصریح ہے، بخلاف موسیٰ علیہ السلام کے کہ وہ جہنم میں داخل نہیں ہے۔

اسی طرح مسیح کو عیسائی خیال کے مطابق سُولی دی گئی تھی تاکہ وہ اپنی امت کے لیے کفارہ بن جائیں اور موسیٰ علیہ السلام کو اپنی امت کے کفارہ کے طور پر سولی نہیں دی گئی، نیز موسیٰ علیہ السلام کی شریعت حدود وتعزیرات اور غسل وطہارت کے احکام نیز کھائی اور پی جانے والی حرام چیزوں پر مشتمل ہے، اس کے برعکس عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت اس قسم کے احکام سے خالی ہے جس کی شہادت موجودہ مروجہ انجیلیں دے رہی ہیں، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم میں رئیس اور مطاع تھے، اپنے احکام اپنی قوم اور امت پر پوری طاقت سے جاری کرتے تھے اس کے برعکس عیسیٰ علیہ السلام میں یہ وصف موجود نہیں ہے کیونکہ ان کے چند متبعین کے سوادوسرے لوگ ان کی اطاعت نہیں کرتے تھے۔(اظہارالحق جلد سوم)

تیسری دلیل: اس بشارت میں لفظ "انہی کے بھائیوں میں سے" واقع ہوا ہے، بلاشبہ اُس وقت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بنی اسرائیل کے بارہ خاندان حاضر اور موجود تھے، اب اگر اس بشارت کا مقصد یہ تھا کہ وہ بنی اسرائیلی ہوگا تو پھر یہ کہنا مناسب تھا کہ "ان ہی میں سے" نہ یہ کہ "ان کے بھائیوں میں سے "اس لفظ کا حقیقی استعمال یہی ہوسکتا ہے کہ اس بشارت والے نبی کا کوئی تعلق اور رشتہ صلبی یا بطنی بنی اسرائیل کے ساتھ نہ ہو، چنانچہ حضرت ہاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بارے میں جو وعدہ کیا گیا تھا اس میں یہ لفظ اپنے اسی حقیقی معنیٰ میں استعمال ہوا ہے (پیدائش باب ۱۶، آیت ۱۲)

چوتھی دلیل: اس بشارت میں لفظ "برپا کروں گا" پایا جارہا ہے، یوشع علیہ السلام اُس وقت موسیٰ کے پاس موجود ہیں، بنی اسرائیل میں داخل ہیں اور اسی زمانے میں نبی بھی تھے، ان پر یہ لفظ کیونکر صادق آسکتا ہے؟

پانچویں دلیل: اس بشارت میں لفظ "اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا" پایا جاتا ہے، یہ اُس چیز کی جانب اشارہ ہے کہ اُس نبی پر کتاب نازل ہوگی اور یہ کہ وہ اُمی ہوگا اور کلام کو محفوظ کرے گا یہ چیز یوشع پر صادق نہیں آتی کیونکہ ان میں دونوں باتیں موجود نہیں ہیں، (اس سے معلوم ہوگیا کہ اس

بشارت سے حضرت عیسیٰ مراد نہیں ہوسکتے کیونکہ لوقا میں تصریح ہے کہ آپ نے کتاب یسعیاہ پڑھی تھی اور امی نہ تھے)

چھٹی دلیل: اس بشارت میں ایک جملہ یہ ہے "اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں اُن کا (انتقام) اس سے لوں گا اور اس جملہ کا مقصد اس نبی کی عظمت ظاہر کرتا ہے جس کی بشارت دی جارہی ہے، اس لیے ضروری ہے کہ وہ نبی اس وصف میں دوسرے پیغمبروں سے امتیازی درجہ رکھتا ہو۔

ساتویں دلیل: کتاب اعمال باب ۳ آیت ۱۹ کے مطابق اس طرح ہے "پس توبہ کرو اور رجوع لاؤ تاکہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں اور اس طرح خداوند کے حضور سے تازگی کے دن آئیں اور وہ اس مسیح کو جو تمہارے واسطے مقرر ہوا ہے یعنی یسوع کو بھیجے، ضرور ہے کہ وہ آسمان میں اس وقت تک رہے جب تک وہ سب چیزیں بحال نہ کی جائیں جن کا ذکر خدا نے اپنے پاک نبیوں کی زبانی کیا ہے، جو دنیا کے شروع سے ہوتے آئے ہیں، چنانچہ موسیٰ نے کہا کہ خداوند خدا تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے مجھ سا ایک نبی پیدا کرے گا جو کچھ وہ تم سے کہے اس کی سننا اور یوں ہوگا کہ جو شخص اس نبی کی نہ سنے گا وہ امت میں سے نیست و نابود کر دیا جائے گا۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ نے کتاب اعمال کے اردو ترجمہ کے ساتھ فارسی ترجمہ بھی اپنی کتاب میں نقل کیا ہے، اس کے بعد فرماتے ہیں کہ غور فرمایئے یہ عبارت خاص کر فارسی ترجموں کے پیش نظر صاف و صریح اس امر پر دلالت کر رہی ہے کہ یہ نبی مسیح کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ہے اور مسیح کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اُس نبی کے ظہور کے وقت تک آسمان ہی میں قیام پذیر رہیں، مسیحیوں میں سے جو لوگ تعصب کی عینک اتار کر پطرس کی عبارت میں غور کرے گا تو اس پر واضح ہو جائے گا

کہ پطرس کا یہ قول علماء پروٹسٹنٹ کے اُس دعوے کی دھجیاں اڑا رہا ہے کہ یہ بشارت عیسیٰ علیہ السلام کے حق میں ہے۔

مولانا کیرانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ ساتوں دلائل کامل و مکمل طور پر بتا رہے ہیں کہ یہ بشارت پورے طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غیر مسیح بھی ہیں اور بہت سی چیزوں میں موسیٰ علیہ السلام کے مماثل بھی، مثلاً

① اللہ کا بندہ اور رسول ہونا۔

② دونوں کا ماں باپ سے پیدا ہونا۔

③ دونوں کا شادی شدہ اور صاحب اولاد ہونا۔

④ دونوں کی شریعت کا سیاست مدنی پر مشتمل ہونا۔

⑤ دونوں کی شریعت میں جہاد کا حکم۔

⑥ دونوں کی شریعت میں عبادت کے وقت پاک صاف ہونا۔

⑦ ناپاک، حائضہ اور نفاس والی عورت پر دونوں شریعتوں میں غسل کا واجب ہونا۔

⑧ کپڑوں کے بول و براز سے پاک ہونے کی شرط۔

⑨ بغیر ذبح کیے ہوئے جانور اور بت کی قربانی کا حرام ہونا۔

⑩ آپ کی شریعت کا بدنی عبادتوں اور جسمانی ریاضتوں پر مشتمل ہونا۔

⑪ زنا کی سزا کا حکم دینا۔

⑫ حدود اور قصاص اور سزاؤں کی تعیین۔

⑬ آپ کا ان سزاؤں کے جاری کرنے پر قادر ہونا۔

⑭ سود کا حرام کرنا۔

⑮ آپ کا غیر اللہ کی عبادت کی دعوت دینے والے کے انکار کا حکم دینا۔

⑯ توحید خالص کا حکم دینا۔

⑰ آپ کا اپنی امت کو یہ حکم دینا کہ مجھ کو اللہ کا صرف بندہ اور رسول کہو نہ کہ خدا کا بیٹا یا خدا۔

⑱ آپ کی وفات کا بستر پر ہونا۔

⑲ موسیٰ علیہ السلام کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا مدفون ہونا۔

⑳ اپنی امت کی وجہ سے آپ کا ملعون نہ ہونا (جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کا عقیدہ ہے) غرض اسی قسم کی اور بہت سی مشترک چیزیں ہیں جو غور کرنے سے دونوں کی شریعتوں میں پائی جاتی ہیں۔ (اظہار الحق جلد سوم)

دوسری بشارت: تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۷ آیت ۲۰ میں ہے، اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس سے بڑی قوم بناؤں گا۔ اور اسی باب کی آٹھویں آیت میں ہے اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں۔ اور کتاب پیدائش کے باب ۱۶ آیت ۱۱ میں ہے "خداوند کے فرشتہ نے اسے (ہاجرہ) کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی، اس کا نام اسماعیل رکھنا، خدا نے تیرا دکھ سن لیا وہ وحشی آدمی ہو گا، اس کا ہاتھ سب سے اوپر ہو گا اور سب کے ہاتھ اس کے برخلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کرے گا۔ اور باب ۲۵ آیت ۱۱ میں ہے، آپ کے فرزند اسحاق کو اللہ نے برکت دی۔

یہ حوالہ جات نقل کرنے کے بعد حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی رحمہ اللہ اپنی کتاب "بشائر النبیین" میں فرماتے ہیں کہ الحاصل حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم سے حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل علیہم السلام کی بابت وعدہ فرمایا کہ ان کو برکت دوں گا، چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اول حضرت

اسحاق کی اولاد نے برکت حاصل کی اور تقریباً کئی ہزار سال تک سلسلہ نبوت رسالت آپ کی اولاد میں جاری رہا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک برابر حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد میں انبیاء ورسل علیہم السلام ہوتے رہے۔

بعد ازاں جب دوسرے وعدہ کا وقت آگیا تو شرف نبوت ورسالت یکسر بنی اسرائیل سے بنی اسماعیل کی جانب منتقل ہو گیا اور دعائے حضرت ابراہیم علیہ الصلاۃ والسلام کا ظہور فاران کی چوٹیوں سے اور سینا اور ساعیر کا نور فاران پر جگمگانے لگا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشآء واللہ ذوالفضل العظیم (بشائر النبیین ۲۳)

تیسری بشارت: کتاب استثناء باب ۳۳ میں ہے، خداوند سیناسے آیا اور شعیر سے ان پر آشکارا ہوا، وہ کوہ فاران سے جلوہ گر ہوا اور (ہزاروں) قدسیوں میں سے آیا، اس کے داہنے ہاتھ پر ان کے لیے آتشی شریعت تھی۔

مولانا رحمت اللہ کیرانوی رحمۃ اللہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں، خداوند سیناسے آنے کا مطلب ہے خدا کا موسیٰ کو توریت عطا فرمانا اور کوہ شعیر سے طلوع ہونے کا مطلب خدا کا عیسیٰ کو انجیل عطا فرمانا، کوہ فاران سے جلوہ گر ہونے سے اللہ کے قرآن نازل کرنے کی طرف اشارہ ہے، اس لیے کہ فاران مکہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے، جیسا کہ کتاب پیدائش باب ۲۱ سے معلوم ہوتا ہے۔ (اظہار الحق بیبل) کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ذیل میں فرماتے ہیں کہ اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تین ارشادات بیان کیے گئے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں اللہ تعالیٰ کا رسول ہوں۔ اس سے ان لوگوں کی تردید ہو گئی جو آپ کو خدا یا خدا کا بیٹا کہتے ہیں اور ان یہودی گستاخوں کی بھی تردید ہو گئی جو آپ پر اور آپ کی پاکباز والدہ پر گھناؤنے بہتان لگاتے ہیں۔ الیکم کے لفظ سے آپ نے یہ بتادیا کہ مجھے صرف تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا میری رسالت کا دائرہ بنی اسرائیل تک محدود ہے۔ آپ کے ان الفاظ پر عیسائی مشنریوں کو بھی غور کرنا چاہیے جو عیسائیت کا پرچار ہر جگہ کرتے پھرتے

ہیں قرآن کریم کے اس فرمان کی تائید انجیل سے بھی ہوتی ہے۔ ملاحظہ ہو متی باب ۱۵ آیت ۲۴ اس نے جواب میں کہا کہ میں اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ اسی انجیل متی کے باب ۱۰ کی آیت ۶ سے ہر قسم کا اشتباہ دور ہو جاتا ہے۔

پہلی آیات میں ان بارہ رسولوں کے نام بتائے گئے ہیں جن کو آپ نے تبلیغ واشاعت کے لیے بھیجا اور ان کو یہ حکم دے کر کہا: غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔

جب حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں اور رسولوں کو غیروں کے پاس جانے سے روکا ہے اور اپنی تبلیغی اور اعجازی سرگرمیوں کو بنی اسرائیل کے خاندان میں محدود کر دیا ہے تو اب کسی عیسائی مبلغ کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ بنی اسرائیل کے علاوہ کسی اور کو عیسائیت کی دعوت دے۔

دوسری بات آپ نے یہ فرمائی کہ میں موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کے لیے نہیں آیا ان پر جو آسمانی کتاب تورات نازل ہوئی میں اس کی تصدیق کرتا ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام اللہ کے سچے رسول تھے اور تورات خدا کی سچی کتاب ہے۔ تمام رسول کیونکہ اللہ تعالیٰ کے فرستادہ ہوتے ہیں اس لیے یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ ایک دوسرے کی تکذیب کریں۔ ان کا کام تو سب کی تصدیق کرنا ہوتا ہے۔ (تفسیر ضیاء القرآن)

تیسری بات آپ نے یہ فرمائی کہ میں تمہیں ایک بڑی روح پرور خوش خبری سناتا ہوں۔ وہ یہ کہ میرے بعد ایک جلیل القدر، عظیم المرتبت رسول تشریف لے آئے گا۔ اس کا اسم گرامی اور نام نامی "احمد" ہو گا۔ صلی اللہ علیہ وسلم۔ (ضیاء القرآن)

سب سے بڑا ظالم

سوال ظلم و سرکشی کے لحاظ سے سب سے زیادہ سخت کون ہے؟ آیت کی روشنی میں وضاحت مطلوب ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُوَ يُدْعٰٓى اِلَى الْاِسْلَامِ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ {۷} الصف.

جواب ترجمہ: اور اس شخص سے بڑا ظالم کون ہو گا جو اللہ پر جھوٹ باندھے، جبکہ اسے اسلام کی طرف بلایا جارہا ہو؟ اور اللہ ایسے ظالم لوگوں کو ہدایت تک نہیں پہنچاتا۔

قرآنی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم و سرکشی کے لحاظ سے سب سے زیادہ وہ شخص سخت ہے جو اللہ کی ذات پر جھوٹ گھڑتا ہے، اللہ کا شریک ٹھراتا ہے، اس کی طرف اولاد کی نسبت کرتا ہے اور اس کی نشانیوں کو جادو گر دانتا ہے،

فرمایا جارہا ہے کہ جن کو اسلام کی طرف بلایا جارہا ہے، جو دونوں جہانوں کی فلاح، نجات، سعادت اور کامیابی کا ذریعہ ہے مگر وہ اسے قبول نہیں کرتے الٹا اللہ کی ذات پر جھوٹ کی نسبت کرتے ہیں، اللہ کے رسول کا صرف انکار ہی نہیں بلکہ ان کو جھٹلاتے بھی ہیں، اللہ تعالیٰ ان کی ہدایت وراہنمائی کے لیے انبیاء کرام کے ہاتھوں پر اپنی قدرت کے شاہکار معجزات دکھاتا ہے، مگر یہ لوگ ان نشانیوں کا صرف انکار ہی نہیں کرتے بلکہ انہیں جادو گر کہہ کر حقارت سے ٹھکرادیتے ہیں، یہ لوگ اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے ہیں۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی ایک بہت بڑی تعداد ان ظالموں کی رشد وہدایت کے لیے بھیجی گئی مگر ان لوگوں نے ان کا مذاق اڑایا، ان کا تمسخر کیا، ان پر الزام تراشیاں کیں، بعض نے ان میں سے کسی کو خدا کا بیٹا قرار دیا، جیسا حضرت عزیر علیہ السلام کو یہودیوں نے خدا کا بیٹا کہہ دیا تھا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نصاریٰ نے خدا کا بیٹا قرار دیا تھا، مکہ کے مشرکین نے ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیا تھا، مکہ میں تین سو ساٹھ بتوں کو خدا کا درجہ دیا گیا تھا، اللہ کی عالی ذات کے بجائے اللہ کی مخلوق کو پوجا اور پکارا جاتا تھا اور آج بھی دنیا میں شرک کیا جارہا ہے، ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے سب سے بڑا ظالم قرار دیا ہے۔

جرائم اور گناہوں کی فہرست طویل ہے، مگر ان سب میں سب سے بڑا گناہ اور جرم شرک ہے، قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جس گناہ کو چاہے معاف کردے گا مگر شرک ایسا گناہ ہے جسے اللہ معاف نہیں کرے گا، شرک کو واضح گناہ قرار دیا گیا ہے، ایک مقام پر شرک کو ظلم عظیم قرار دیا گیا ہے، ایک مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی پر بھی واضح فرمادیا کہ اگر آپ نے بھی شرک کیا تو سارے عمل ضائع کردوں گا، شرک کی جڑیں کاٹنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے نبیوں کو بھیجا، انہیں آزمائشوں میں ڈالا، امتحانوں سے گزارا۔

اور ایک قول یہ ہے کہ مراد وہ شخص یا گروہ ہے جو کہتے تھے کہ حق تعالیٰ نے کسی شخص پر کچھ نہیں نازل فرمایا اور یہ کہ کسی کو رسول نہ ماننا جب تک سوختی قربانی پیش نہ کرے یا شریعت موسویہ کو منسوخ نہیں مانتا۔ اور سیاق کلام سے ظاہر ہے کہ مراد اہل کتاب ہی ہیں جن کے ایسے خیالات تھے اور جن کی افتراء پردازیوں کا قرآن حکیم میں تفصیل سے ذکر و مذمت ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ۔ اور ظالم لوگوں کو اللہ راہ نہیں دیتا۔

چونکہ یہ لوگ راہ ہدایت کی طرف توجہ نہیں دیتے، یہ طالب ہدایت ہی نہیں ہیں، اس لیے اللہ انہیں ہدایت کی توفیق نہیں دیتے جس میں ان کی کامیابی اور کامرانی، فوز اور فلاح ہے، اس لیے انہیں اس سعادت و نیک بختی کے حصول سے محروم کردیا گیا ہے، ہدایت اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ جسے چاہے اس عظیم دولت سے مالا مال اور سرشار کرے اور جسے چاہے اس عظیم دولت سے محروم کردے، ظالموں کو تو وہ ہدایت نہیں دیتا، ظالم اس کی ہدایت سے محروم ہی رہتے ہیں۔

نور الٰہی کو بجھایا نہیں جاسکتا

سوال اس آیت کا ترجمہ کریں، نیز یہ بتائیے کہ اللہ کا نور کیا ہے جسے کفار اپنے منہ سے بجھانا چاہتے ہیں اور وہ کیسے اسے بجھاتے ہیں؟

يُرِيْدُوْنَ لِيُطْفِـُٔوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوَاهِهِمْ وَاللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ {۸} الصف.

جواب ترجمہ: یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنے منہ سے اللہ کے نور کو بجھا دیں، حالانکہ اللہ اپنے نور کی تکمیل کر کے رہے گا، چاہے کافروں کو یہ بات کتنی بری لگے۔

اطفاء کا معنی بجھانا ہے، اطفاء اور اخماد دونوں لفظ آگ بجھانے کے بارے میں استعمال ہوتے ہیں۔ اطفاء اور اخماد میں ایک وجہ سے فرق ہے۔ اطفاء قلیل اور کثیر دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اور اخماد کثیر میں استعمال ہوتا ہے، قلیل میں استعمال نہیں ہوتا، یہ جملہ تو کہا جاتا ہے: اطفأت السراج یہ نہیں کہا جاتا: اخمدت السراج

نور اللہ کے بارے میں یہاں پانچ قول ہیں۔

① مفسر قرآن حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور حضرت زید رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَنَّهُ الْقُرْآنُ، يُرِيدُونَ إِبْطَالَهُ وَتَكْذِيبَهُ بِالْقَوْلِ، نور سے مراد قرآن ہے، وہ قول کے ذریعے اس کو باطل کرنے اور جھٹلانے کا ارادہ کرتے ہیں۔

② حضرت سدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَنَّهُ الْإِسْلَامُ، يُرِيدُونَ دَفْعَهُ بِالْكَلَامِ، نور سے مراد اسلام ہے، وہ کلام کے ذریعے اس کو رد کرنا چاہتے ہیں۔

③ حضرت ضحاک رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَنَّهُ مُحَمَّدٌ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يُرِيدُونَ هَلَاكَهُ بِالْأَرَاجِيفِ، نور سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ وہ بناوٹی جھوٹی خبروں کے ساتھ آپ کو ہلاک کرنا چاہتے ہیں۔

④ ابن بحر رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حُجَجُ اللهِ وَدَلَائِلُهُ، يُرِيدُونَ إِبْطَالَهَا بِإِنْكَارِهِمْ وَتَكْذِيبِهِمْ، اللہ تعالیٰ کے دلائل ہیں وہ اپنے انکار اور تکذیب کے ساتھ دلائل کا ابطال چاہتے ہیں۔

⑤ ابن عیسیٰ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ أَنَّهُ مَثَلٌ مَضْرُوبٌ، أَيْ مَنْ أَرَادَ إِطْفَاءَ نُورِ الشَّمْسِ بِفِيهِ فَوَجَدَهُ مُسْتَحِيلًا مُمْتَنِعًا فَكَذَلِكَ مَنْ أَرَادَ إِبْطَالَ الْحَقِّ، یہ ضرب المثل ہے۔

جس نے اپنے منہ سے سورج کے نور کو بجھانا چاہا تو وہ اسے محال اور ممتنع پائے گا اسی طرح جس نے حق کو باطل کرنے کا ارادہ کیا۔ (قرطبی)

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے اس آیت کا شان نزول یوں منقول ہے

أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَبْطَأَ عَلَيْهِ الْوَحْيُ أَرْبَعِينَ يَوْمًا، فَقَالَ كَعْبُ بْنُ الْأَشْرَفِ: يَا مَعْشَرَ الْيَهُودِ، أَبْشِرُوا! فَقَدْ أَطْفَأَ اللهُ نُورَ مُحَمَّدٍ فِيمَا كَانَ يُنْزِلُ عَلَيْهِ، وَمَا كَانَ لِيُتِمَّ أَمْرَهُ، فَحَزِنَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَنْزَلَ اللهُ تَعَالَى هٰذِهِ الْآيَةَ وَاتَّصَلَ الْوَحْيُ بَعْدَهَا، (ماوردی، تفسیر قرطبی)

نبی کریم ﷺ پر چالیس روز تک وحی نہیں آئی تو کعب بن اشرف نے کہا، اے یہودیو! خوشخبری ہو اللہ تعالیٰ نے اس نور کو بجھا دیا جو ان پر نازل ہوتا تھا ان کا معاملہ مکمل ہونے والا نہیں رسول اللہ ﷺ غمگین ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے اس آیت کو نازل فرمایا اور اس کے بعد وحی کا اتصال رہا۔

وَاللهُ مُتِمُّ نُورِهِ: یعنی اللہ دین اسلام کو پھیلائیگا سربلند کرے گا اور درجہ کمال تک ضرور پہنچائے گا، یہ نبی کریم ﷺ کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں مگر جو شخص آپ ﷺ کا ایک بار دیدار کرتا تھا وہ اس بات کی گواہی دینے پر مجبور ہو جاتا تھا کہ یہ شخص سچا ہے، یہ غلط انسان نہیں ہے۔

آپ ﷺ کے چہرہ کی تابانی اور نورانیت دیکھ کر وہ پکار اٹھتے تھے کہ یہ سچے انسان کا چہرہ ہے، وہ قرآن کریم کے خلاف شبانہ روز پروپیگنڈہ کرتے تھے، کبھی کہتے تھے کہ یہ پرانے لوگوں کے قصے اور کہانیاں ہیں، کبھی کہتے اسے کسی سے پڑھ کر آگے سنایا جاتا ہے، کبھی اس معجز نما کلام کو جادو کہتے، کبھی کہانت کہتے، مگر ان سب پروپیگنڈوں، الزام تراشیوں اور بہتان طرازیوں کا انہیں قدم قدم پر جواب مل جاتا تھا۔

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

غلبہ اسلام

سوال اس آیت کریمہ کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

هُوَ الَّذِیۡۤ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ ۙ وَلَوۡ کَرِهَ الۡمُشۡرِکُوۡنَ ﴿۹﴾ الصف

جواب ترجمہ: وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچائی کا دین دے کر بھیجا ہے تاکہ وہ اسے تمام دوسرے دینوں پر غالب کر دے، چاہے مشرک لوگوں کو یہ بات کتنی بری لگے۔

ابو احمد بن علی الرازی رحمہ اللہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں اس کا شمار دلائل نبوت میں ہوتا ہے کیونکہ یہ بات اس وقت کہی گئی تھی جب مسلمانوں کی تعداد بہت کم تھی، وہ بہت کمزور تھے اور انہیں ہر وقت دشمنوں کا خطرہ لاحق رہتا تھا اور لوگوں کی نظروں میں مقہور و بے بس تھے۔ لیکن ان حالات کے باوجود یہ خبر اپنی تمام جزئیات کے ساتھ حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

اس زمانے میں ادیان درج ذیل تھے، یہودیت، نصرانیت، مجوسیت، صابئیت اور ان کے علاوہ بت پرست بھی تھے جن کا دائرہ، عرب سے لے کر سندھ یعنی ہندوستان تک پھیلا ہوا تھا، پھر ان ادیان کو ماننے والوں میں سے کوئی قوم ایسی باقی نہیں رہی جس پر مسلمان غالب نہیں آئے اور ان کے تمام علاقوں یا بعض کو اپنے زیر نگیں نہیں کیا اور انہیں دور دراز علاقوں کی طرف مار بھگایا۔

یہ ہے اس آیت کا مصداق جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اسلام کو ان تمام ادیان پر غالب کر دے گا، ہمیں یہ بات معلوم ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو ہے اور وہ غیب کی خبر صرف اپنے رسولوں کو وحی کے ذریعے بھیجتا ہے، اس لئے یہ آیت حضور ﷺ کی نبوت کی صحت کی ایک واضح دلیل ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ ان تمام ادیان پر غلبہ تو حضور ﷺ کی وفات کے بعد ہوا تھا اس لئے یہ حضور ﷺ کا غلبہ نہیں کہلا سکتا۔ اس کے جواب میں کہا جائے گا کہ

اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ آپ کے لائے ہوئے دین کو تمام ادیان پر غالب کر دے گا کیونکہ ارشاد باری ہے هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تا کہ اسے پورے کے پورے دین پر غالب کر دے۔

اس سے مراد دین حق ہے، اگر اس سے حضور ﷺ کی ذات مراد لی جاتی تو پھر بھی یہ بات درست ہوتی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جب حضور ﷺ کے دین اور آپ پر ایمان لانے والوں کو تمام ادیان اور اہل ادیان پر غالب کر دیا تو اس صورت میں یہ کہنا درست ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو غالب کر دیا۔

جس طرح کوئی لشکر اسلامی اگر کسی شہر یا علاقے کو فتح کر لے تو یہ کہنا درست ہوتا ہے کہ خلیفۃ المسلمین نے اسے فتح کیا ہے اگرچہ وہ قتال میں شریک بھی نہ ہوا ہو، کیونکہ اسلامی لشکر کا یہ اقدام اس کے حکم اور اس کی طرف سے لشکر کی تیاری کے تحت ہوا تھا۔ (تفسیر احکام القرآن للجصاص)

امام اہل سنت حضرت مولانا سرفراز خان صفدر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نور ہدایت کو مکمل کرنے کے لیے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو مبعوث فرمایا ہے اللہ کا ارشاد ہے، هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے بھیجا اپنا رسول ہدایت کے ساتھ، وَدِينِ الْحَقِّ اور سچے دین کے ساتھ ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا۔

جس وقت نبی کریم ﷺ دنیا میں تشریف لائے اس وقت کوئی مذہب اپنی اصل حالت میں موجود نہ تھا، سب دین تحریفات کا شکار ہو چکے تھے اللہ نے حضرت محمد ﷺ کو ہدایت اور سچا دین دے کر مبعوث فرمایا اور اس سے مقصود یہ تھا کہ تا کہ غالب کر دے اس سچے دین کو دوسرے تمام دینوں پر۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے دین اسلام نازل ہی اس لیے کیا ہے کہ دنیا میں صرف یہی دین قائم رہے اور باقی سب ختم ہو جائیں، غلبہ سے مراد سیاسی غلبہ بھی ہے اور دلیل اور برہان کا غلبہ بھی ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ دیگر مفسرین کرام میں سے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی توجیہ زیادہ بہتر ہے کہ شرک اہل کتاب اور عرب کے امی لوگوں میں پایا جاتا تھا، جس کو مغلوب کرنا مقصود تھا، چنانچہ عرب کے سارے امی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مغلوب ہوگئے بعض مشرک مارے گئے اور بعض نے اسلام قبول کرلیا۔

اس طرح سارے عرب پر اسلام کا جھنڈا لہرا دیا گیا اور جزیرہ عرب شرک کی نجاست سے پاک ہوگیا۔ نصاریٰ میں سے نجران اور شام کے عیسائیوں نے مسلمانوں کے ساتھ معاہدہ کرکے جزیہ دینا قبول کرلیا اور وہ اس طرح اپنے دین پر رہتے ہوئے اسلام کے ماتحت ہوگئے۔ یہودیوں میں سے بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع، اور خیبر والے سب مغلوب ہوگئے بعض نے ٹیکس دینا قبول کیا اور بعض بالکل ہی ختم ہوگئے اس طرح دین حق باقی ادیان پر غالب آگیا۔

لیکن شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اس توجیہ سے مکمل اتفاق نہیں کرتے بلکہ وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ میں جس غلبہ دین کی بات کی گئی وہ مکمل طور پر خلفائے راشدین کے زمانہ میں واقع ہوا ہے، حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو قیصر و کسریٰ جیسی سپر طاقتیں دنیا میں موجود تھیں، شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ نے اپنے آخری پیغمبر کو مبعوث فرما کر اس تحریک کا آغاز کردیا جس کے ذریعے یہ دونوں بڑی طاقتیں ختم ہوگئیں اور دین حق کو عمومی غلبہ حاصل ہوگیا۔

چنانچہ خلفائے راشدین کے زمانے میں روم، روس، افریقہ، جرمنی، شام، مصر، وغیرہ قیصر روم کے ماتحت تھے، یہ مغلوب ہوئے اور ادھر کسی کے زیر تسلط خراسان، توران، ترکستان، وغیرہ اور مجوسی سب مغلوب ہوگئے، اس کے علاوہ تمام یہودی مشرک، ہندو، صابی، قومیں بھی اسلام کے ماتحت آگئیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں کسریٰ ختم ہوا تو مجوسیت دم توڑ گئی اور حنیفیت کا دور شروع ہوا اور ادھر قیصر کا تسلط مصر، شام اور فلسطین سے ختم ہوا اور اسلام کو عمومی غلبہ حاصل ہوگیا اور پھر

مسلمانوں میں عملی کمزوری آئی اور یہ پستی کا شکار ہوئے، دلیل وبرہان کا غلبہ تو ہمیشہ رہے گا، حجت اور برھان اور دلیل کے لحاظ سے اسلام سب دینوں پر غالب ہے اور غالب رہے گا۔ (ذخیرۃ الجنان)

سید قطب رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ذیل میں لکھتے ہیں یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اسلامی نظام زندگی ہدایت ہے اور دین حق ہے، یہ ایک فیصلہ کن بات ہے اور اس پر کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا، اللہ کا ارادہ پورا ہو گیا اور یہ دین تمام ادیان پر غالب ہو گیا ہے، یہ دین اپنی ذات اور اپنی تشکیل کے لحاظ سے واحد دین ہے، اس کے مقابل کا کوئی دین نہیں ہے۔ مثلاً دنیا کے بت پرستانہ ادیان کے اندر تو مقابلے کی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ رہا کتابی دین تو یہ اسی سلسلے کا آخری اور مکمل دین ہے اور اللہ کے نظام کا یہ آخری ایڈیشن ہے، یہ اپنی مکمل اور اعلیٰ صورت میں ہے۔

سابقہ کتب سماوی کے اندر بے شمار تحریفات کر دی گئی ہیں، ان کی شکل بدل دی گئی ہے اور وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے ہیں اور ان میں وہ اضافے ہو گئے ہیں جو ان میں نہ تھے، ان کے اندر کانٹ چھانٹ کر دی گئی ہے، پھر وہ اس حالت تک پہنچ گئی ہیں کہ وہ آج جدید دور کی زندگی کی کوئی رہنمائی نہیں کر سکتیں۔

اگر یہ مان لیا جائے کہ ان کے اندر تحریف نہیں ہوئی تو بھی وہ سابقہ ایڈیشن ہیں جبکہ دین اسلام اللہ کے نظام کا آخری اور تازہ ترین نسخہ ہے جس کے اندر جدید ترقی یافتہ زندگی کے تمام مسائل حل کر دیئے گئے ہیں، سابقہ ادیان اللہ کی اسکیم کے مطابق ایک محدود وقت کے لئے آئے تھے۔

اللہ کا یہ وعدہ نفس دین اور اس کی نوعیت اور اس کے احکام ومواد کے اعتبار سے تو پورا ہوا کہ دین اسلام کے مقابلے کا کوئی دین نہیں ہے لیکن یہ نظام عملی زندگی میں بھی ایک غالب نظام رہا ہے، ایک بار تو یہ دین غالب ہو کر رہا ہے، یہ اس کرہ ارض پر اس قدر غالب ہوا کہ تمام ادیان، تمام اقوام تقریباً ایک سو سال تک اس کے زیر نگیں رہے، اس کے بعد بھی یہ دین وسط ایشیا اور وسط افریقہ میں سیلاب کی طرح پھیل گیا۔

یہاں تک کہ ابتدائی جہادی جدوجہد کے ذریعہ اس کے اندر جس قدر لوگ داخل ہوئے اس کے بعد محض تبلیغی جدوجہد کے ذریعہ اپنی ذاتی قوت سے یہ دین پانچ گنا علاقے اور آبادی میں پھیل گیا، آج بھی یہ دین بغیر حکومتی قوتوں کے پھیل رہا ہے، حالانکہ یہودی اور صیہونی سازش نے اہل دین کے سیاسی نظام، نظام خلافت کو ختم کر دیا ہے۔

یہ نظام ان لوگوں نے ترکی میں اس ہیرو کے ہاتھوں ختم کرایا جسے اس مقصد کے لئے انہوں نے خود گھڑا تھا اور باوجود اس کے کہ پورے عالم اسلام میں اس دین کے خلاف رات دن سازشیں ہو رہی ہیں اور پورے عالم اسلام میں یہودیوں کے ہاتھوں نصب کردہ " ہیرو " عالم اسلام میں اٹھنے والی اسلامی تحریکات کچل رہے ہیں لیکن یہ اللہ کا چراغ ہے اور پھونکوں سے اسے بجھایا نہیں جاسکتا۔

غرض باوجود اپنوں اور غیروں کی سازشوں کے یہ دین انسانی، تاریخ میں اب بھی اہم کردار سرانجام دے رہا ہے اور پہلے بھی اس نے ادا کیا ہے اور انسانی سازشیں اس کی راہ نہیں روک سکتیں کیونکہ اللہ کے مقابلے میں انسان کی قوت کوئی قوت نہیں ہے، اگرچہ وہ بہت گہری چال چلیں کیونکہ اللہ بھی گہری چال چلتا ہے۔

یہ آیات اس وقت اہل ایمان کے حوصلے بڑھا رہی تھیں جب قرآن کے ابتدائی سامعین یہود ونصاریٰ کی کوششوں اور سازشوں کے علی الرغم غلبہ دین کی جدوجہد کر رہے تھے اس وقت بھی دین کو اللہ غالب کر رہا تھا، مسلمان تو دست قدرت کے لئے ایک پردہ اور بہانہ تھے اور آج بھی یہ آیات ان لوگوں کے لئے ایک حوصلہ پیدا کر رہی ہیں جو غلبہ دین کا کام کر رہے ہیں اور آئندہ بھی غلبہ دین کے لئے اٹھنے والی تحریکات کے لئے یہ آیات مشعل راہ ہوں گی اور وہ دن دور نہیں ہے کہ ایک بار پھر یہ دین غالب ہو کر رہے گا۔ (تفسیر ظلال القرآن)

ڈاکٹر اسرار احمد فرماتے ہیں کہ حضور ﷺ کے مقصد بعثت کے حوالے سے یہ آیت خصوصی اہمیت کی حامل ہے اور اسی اہمیت کے باعث قرآن مجید میں اسے تین بار (اس مقام کے علاوہ سورۃ

التوبہ، آیت ۳۳اور سورۃ الفتح، آیت ۲۸ کے طور پر) دہرایا گیا ہے، تمام انبیاء ورسل کے لیے قرآن مجید میں بشیر، نذیر، مذکر، شاہد، معلم وغیرہ الفاظ مشترک استعمال ہوئے ہیں، لیکن اس آیت کا مضمون اور اسلوب صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے لیے خاص ہے۔

الہدیٰ سے مراد یہاں وہ ہدایت نامہ (قرآن) ہے جو آپ ﷺ پر کامل ہو گیا، جبکہ آپ سے پہلے تمام انبیاء کو اپنے اپنے دور میں جو میزان (شریعت) عطا ہوتی رہی تھی حضور ﷺ کی بعثت میں وہ کامل ہو کر "دین الحق" یعنی سچے اور عادلانہ نظام زندگی کی شکل اختیار کر گئی۔

چنانچہ آپ ﷺ کو الہدیٰ اور دین حق کے ساتھ اس لیے بھیجا گیا تاکہ اللہ تعالیٰ کے نظام عدل و قسط کو دنیا کے تمام نظاموں پر غالب کر دیا جائے، یہ تھا حضور ﷺ کی بعثت کا مشن جسے تکمیل کے لیے آپ ﷺ ہمارے سپرد فرما گئے تھے، لیکن ہم نے تو اس مشن کو کبھی اپنایا ہی نہیں۔

ہمارا مشن تو یہ ہے کہ حلال و حرام طریقے سے جیسے بھی ہو، دولت اکٹھی کرو، پھر اسی دولت سے صدقہ و قربانی دو، حج کرو اور رمضان میں ہر سال عمرے کے لیے چلے جایا کرو، ہمارا سارا زور rituals پر ہے اور دین اگر دنیا میں پامال ہے تو ہوتا رہے، ہماری بلا سے! تصور کریں، اگر آج صرف ایک سال میں حج پر اکٹھے ہونے والے افراد ہی سروں پر کفن باندھ کر غلبہ دین کی جدوجہد کے لیے میدان میں کود پڑیں تو دنیا کو بدل سکتے ہیں، مگر افسوس، صد افسوس

رہ گئی رسم اذاں روح بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقین غزالی نہ رہی!

وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ: اور خواہ مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو! ظاہر ہے مشرکین کب چاہیں گے کہ دنیا میں اسلام کا غلبہ ہو، نظام توحید کا نفاذ ہو اور اللہ کی حکومت بالفعل قائم ہو جائے۔

یہاں پر مُشْرِكُوْنَ کا لفظ خاص طور پر لائق توجہ ہے، اس سے مراد صرف وہ مشرکین ہی نہیں ہیں جو بتوں اور دیوی دیوتاؤں کو پوجتے ہیں اور امید رکھتے ہیں کہ وہ اللہ کے حضور ان کی سفارش

کر دیں گے، بلکہ سب سے بڑے مشرک تو وہ ہیں جو دنیا میں خدائی کے دعوے دار بنے بیٹھے ہیں، جو نمرود اور فرعون کے نقش قدم پر چل رہے ہیں اور جن کا دعویٰ ہے کہ اقتدار اعلیٰ (sovereignty) کے مالک ہم ہیں۔ فرعون بھی تو یہی کہتا تھا: أَلَيْسَ لِي مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْأَنْهَارُ تَجْرِي مِنْ تَحْتِي أَفَلَا تُبْصِرُونَ (۵۱) کہ دیکھو! کیا یہ مصر کی حکومت میری نہیں ہے؟ اور کیا یہ پورا نہری نظام میرے تابع نہیں ہے؟ (سورۃ الزخرف)

تو فرعون کے اس دعوے اور "عوام کی حاکمیت" کے نعرے میں کیا فرق رہ گیا؟ صرف یہی نا کہ وہاں اقتدار کا دعویٰ کرنے والا ایک فرد تھا اور یہاں پوری قوم حاکمیت کی دعوے دار ہے، اب ظاہر ہے اگر اس ماحول میں آپ اللہ کی حاکمیت کا نعرہ لگائیں گے اور اللہ کے نظام عدل و قسط کے قیام کے مشن کو لے کر آگے بڑھنا چاہیں گے تو "اپنی حاکمیت" کے یہ دعوے دار خم ٹھونک کر آپ کے مقابلے میں آ کھڑے ہوں گے۔ اس کے بعد بھی اگر آپ اپنے مؤقف پر قائم رہیں گے تو ان سے آپ کا تصادم ناگزیر ہو جائے گا اور آپ کو مال و جان کی قربانی کی صورت میں اپنے اس موقف کی قیمت چکانا پڑے گی۔ (بیان القرآن)

مفید تجارت

سوال وہ کونسی عظیم الشان تجارت ہے جو اللہ اور رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے والوں کو دردناک عذاب سے نجات دیتی ہے؟ ان آیات کی روشنی میں بتائیے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيكُمْ مِّنْ عَذَابٍ أَلِيمٍ {۱۰} تُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهٖ وَتُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ {۱۱} يَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَيُدْخِلْكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِي جَنّٰتِ عَدْنٍ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ {۱۲} وَأُخْرٰى تُحِبُّونَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيبٌ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ {۱۳} الصف

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! کیا میں تمہیں ایک ایسی تجارت کا پتہ دوں جو تمہیں دردناک عذاب سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ، اور اپنے مال و دولت اور اپنی جانوں سے اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ تمہارے لیے بہترین بات ہے، اگر تم سمجھو۔ اس کے نتیجے میں اللہ تمہاری خاطر تمہارے گناہوں کو بخش دے گا اور تمہیں ان باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، اور ایسے عمدہ گھروں میں بسائے گا جو ہمیشہ ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں واقع ہوں گے۔ یہی زبردست کامیابی ہے۔ اور ایک اور چیز تمہیں دے گا جو تمہیں پسند ہے (اور وہ ہے) اللہ کی طرف سے مدد، اور ایک ایسی فتح جو عنقریب حاصل ہو گی، اور (اے پیغمبر) ایمان والوں کو (اس بات کی) خوشخبری سنا دو۔

اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی ذات پر ایمان کے ساتھ ساتھ راہ خدا میں اپنی جان و مال کے ساتھ جہاد کرنے کے باعث اللہ تعالیٰ ہمارے گناہ معاف فرما دیتے ہیں، اس قربانی کے صلے میں اللہ تعالیٰ ہمیں جنتیں عطا فرمائیں گے، ایسی جنتیں جن کے نیچے نہریں رواں دواں ہوں گی، اس قربانی کے صلے میں ہمیں رہنے کے لیے ایسے گھر ملیں گے جو پاکیزہ ہوں گے، یہ گھر عارضی نہیں ہوں گے بلکہ دائمی ہوں گے، اس قربانی کے صلے میں اللہ تعالیٰ ہماری نصرت مدد فرمائیں گے، اور فتح دیں گے۔

حضرت مقاتل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کی وجہ یہ بنی کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی: کاش! آپ ﷺ مجھے اجازت دیتے تو میں خولہ کو طلاق دیتا، رہبانیت اختیار کرتا، اپنے آپ کو خصی کر لیتا، گوشت کو اپنے اوپر حرام کر لیتا، رات کو کبھی بھی نہ سوتا اور دن کو کبھی بھی افطار نہ کرتا۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: إِنَّ مِنْ سُنَّتِي النِّكَاحَ وَلَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ إِنَّمَا رَهْبَانِيَّةُ أُمَّتِي الْجِهَادُ فِي سَبِيلِ اللهِ وَخِصَاءُ أُمَّتِي الصَّوْمُ وَلَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا أَحَلَّ اللهُ لَكُمْ، وَمِنْ سُنَّتِي أَنَامُ وَأَقُومُ وَأُفْطِرُ وَأَصُومُ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ

مِنِّی، میری سنت میں سے نکاح بھی ہے، اسلام میں کوئی رہبانیت نہیں میری امت کی رہبانیت اللہ کی راہ میں جہاد ہے، میری امت کا خصی ہونا روزہ رکھنا ہے، اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں تم پر حلال کی ہیں انہیں اپنے اوپر حرام نہ کرو۔ میری سنت یہ بھی ہے کہ میں سوتا ہوں، میں قیام کرتا ہوں، میں روزہ افطار کرتا ہوں اور روزہ رکھتا بھی ہوں۔ جو میری سنت سے اعراض کرے تو وہ مجھ سے نہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے عرض کی: اے اللہ کے نبی! میں پسند کرتا ہوں کہ میں یہ جانوں کہ کون سی تجارت اللہ تعالیٰ کو سب سے محبوب ہے؟ تو میں وہ تجارت کروں تو یہ آیت نازل ہوئی۔ (تفسیر قرطبی)

ان آیات میں ایک ایسی تجارت کی جانب رانمائی فرمائی ہے۔ جس کی وجہ سے انسان دردناک عذاب سے چھٹکارہ پا جاتا ہے۔ گناہوں کی مغفرت کر دی جاتی ہے۔ بیش بہا نعمتوں سے مالا مال کی جنتیں میسر ہو جاتی ہیں اور دنیا میں سرفرازی، نصرت فتح اور کامرانی حاصل ہوتی ہے۔

یہ ایسی تجارت ہے جس میں دنیا و عقبیٰ کے لحاظ سے گھاٹے اور خسارے کا احتمال ہی نہیں۔ دنیا میں اس تجارت کی وجہ سے رفعت وار تقاء اور عزت و غلبہ عنایت ہوتا ہے اور آخرت میں فوز و فلاح اور رضا و خوشنودی رب ذوالجلال ملتی ہے۔

پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس تجارت میں راس المال بھی اسی ذات کی طرف سے عطیہ کیا جاتا ہے ایسا نہیں کہ اپنے پاس سے دینا پڑے بلکہ سرمایہ بھی اس کا ہے۔ جس سے سودا ہو رہا ہے، یہ محض اس کا فضل، احسان، اور کرم گستری ہے کہ وہ اس سرمایہ کو قبول فرمالیتا ہے، جو حقیقت میں اسی کا عنایت کیا ہوا ہے۔ پھر یہ اسی ذات حق کی کرم نوازی ہے کہ اس کے معاوضہ میں بہترین نفع بھی دیتا ہے، اگر انسان غور و حوض سے کام لے، فکر و دانش کو استعمال میں لائے تو اسے اندازہ ہو کہ اس سے بہتر کیا تجارت ہو سکتی ہے کہ جس میں دارین کے فوائد مخفی ہوں اور اپنی تجوریوں سے کچھ نہ نکالنا اور خرچ کرنا پڑے۔

یہ کاروبار اور تجارت سہل ہے۔ صرف اس میں اتنا کام کرنا پڑتا ہے کہ ایمان اور اخلاص کی دولت انسان کے پاس ہونا چاہیے، اس کے بعد جان ہے اور مال ہے انہیں اس مولائے کائنات کی رضاجوئی کے لیے لگادے، اسی نے دولت بخشی ہے، اسی نے جان عطا کی ہے، وہ اپنی دی ہوئی چیز کی قربانی مانگ رہا ہے۔

صاحب سراج البیان فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کا ارشاد ہے کہ اگر تم اس تجارت کے فوائد کو سمجھ جاؤ، تو تمہیں معلوم ہو جائے کہ یہ تمہارے حق میں کس درجہ بہتر اور مفید ہے اور اس کی وجہ سے تم کو کتنا روحانی اور مادی فائدہ پہنچتا ہے، قرون اولیٰ میں جب تک مسلمان یہ تجارت کرتے رہے اور انہوں نے اپنی جان اور مال کو مال نہیں سمجھا، ان کا ہر قدم آگے بڑھتا رہا اور جان اور مال کی تمام آسائشیں ان کو میسر رہیں، مگر جب یہ لوگ بزدل ہو گئے۔ جان ان کو بہت زیادہ عزیز اور پیاری معلوم ہونے لگی۔ مال کو یہ اپنی زندگی کا نصب العین قرار دینے لگے اور اس کی محبت پرستش کی حد تک پہنچ گئی، اس وقت سے ہر دو قسم کی آسودگیوں کو ان سے چھین لیا گیا، اب کیفیت یہ ہے کہ نہ جان ان کے قبضہ میں ہے اور نہ مال۔ دونوں پر اغیار کا قبضہ ہے۔ وہ جب چاہیں ان سے یہ دونوں چیزیں چھین لیں اور یہ احتیاج کرنے پر بھی قادر نہ ہوں۔ (سراج البیان)

وَمَسَاكِنَ طَيِّبَةً: رسول اللہ ﷺ سے مساکن طیبہ کے بارے میں پوچھا گیا تو نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

قَصْرٌ مِنْ لُؤْلُؤَةٍ فِي الْجَنَّةِ فِيهِ سَبْعُونَ دَارًا مِنْ يَاقُوتَةٍ حَمْرَاءَ فِي كل دار سبعون بيتا من زبرجدة خَضْرَاءَ فِي كُلِّ بَيْتٍ سَبْعُونَ سَرِيرًا عَلَى كُلِّ سَرِيرٍ سَبْعُونَ فِرَاشًا مِنْ كُلِّ لَوْنٍ عَلَى كُلِّ فِرَاشٍ سَبْعُونَ امْرَأَةً مِنَ الْحُورِ الْعِينِ فِي كُلِّ بَيْتٍ سَبْعُونَ مَائِدَةً عَلَى كُلِّ مَائِدَةٍ سَبْعُونَ لَوْنًا مِنَ الطَّعَامِ فِي كُلِّ بَيْتٍ سَبْعُونَ وَصِيفًا وَوَصِيفَةً فَيُعْطِي اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى الْمُؤْمِنَ مِنَ الْقُوَّةِ فِي غَدَاةٍ وَاحِدَةٍ مَا يَأْتِي عَلَى ذَلِكَ كُلِّهِ (تفسیر قرطبی)

جنت میں یہ موتی سے بنا محل ہے جس میں سرخ یاقوت کی ستر حویلیاں ہوں گی اور ہر حویلی میں ستر سبز زجرجد کے کمرے ہوں گے، ہر کمرے میں ستر پلنگ ہوں گے، ہر پلنگ پر مختلف قسم کے ستر بستر ہوں گے اور ہر بستر پر ستر حوریں ہوں گی، ہر کمرے میں ستر دستر خوان ہوں گے، ہر دستر خوان پر ستر قسم کے کھانے ہوں گے، ہر کمرے میں ستر خادم اور خادمائیں ہوں گی، اللہ تعالیٰ ہر مومن کو ایک دن میں اتنی قوت عطا کرے گا جس کے باعث تمام حوروں کے پاس جاسکے گا ۔

دین الٰہی کے مددگار بن جاؤ

سوال ان آیات کا ترجمہ اور تفسیر کیجیے

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ مِّنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّاۗىِٕفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰي عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ {۱۴} الصف.

جواب ترجمہ: اے ایمان والو! تم اللہ (کے دین) کے مددگار بن جاؤ، اسی طرح جیسے عیسیٰ بن مریم علیہ السلام نے حواریوں سے کہا تھا کہ: وہ کون ہیں جو اللہ کے واسطے میرے مددگار بنیں؟ حواریوں نے کہا: ہم اللہ کے (دین کے) مددگار ہیں۔ پھر بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لے آیا، اور ایک گروہ نے کفر اختیار کیا، چنانچہ جو لوگ ایمان لائے تھے ہم نے ان کے دشمنوں کے خلاف ان کی مدد کی، نتیجہ یہ ہوا کہ وہ غالب آئے۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان لوگوں کو اپنے دین کی مدد اور نصرت کرنے کا حکم دے رہے ہیں جنہوں نے اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی تصدیق کی ہے، اللہ کی شریعت پر انہوں نے عمل کیا، یہ لوگ اللہ کے دین کی مدد اور نصرت کریں، جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے کیا تھا۔

جن حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مدد اور نصرت کی تھی ان کی تعداد بارہ بتائی گئی ہے، ”اَلْحَوَارِيُّوْنَ“ کا معنیٰ ہے: جن کا باطن صاف ہو اور یہ وہ لوگ تھے جو سب سے پہلے حضرت عیسیٰ

علیہ السلام پر ایمان لائے تھے۔ حور کا معنی ہے: خالص سفید، ایک قول یہ ہے کہ حواری کپڑے دھو کر صاف کرتے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھیوں کے لیے بائیبل میں عموماً لفظ "شاگرد" استعمال کیا گیا ہے، لیکن بعد میں ان کے لیے "رسول" (Apostles) کی اصطلاح عیسائیوں میں رائج ہوگئی، اس معنیٰ میں نہیں کہ وہ خدا کے رسول تھے، بلکہ اس معنیٰ میں کہ حضرت عیسیٰ ان کو اپنی طرف سے مبلغ بنا کر اطراف فلسطین میں بھیجا کرتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں یہ لفظ پہلے سے ان لوگوں کے لیے بولا جاتا تھا جو ہیکل کے لیے چندہ جمع کرنے بھیجے جاتے تھے۔ اس کے مقابلہ میں قرآن کی اصطلاح "حواری" ان دونوں مسیحی اصطلاحوں سے بہتر ہے۔

اس لفظ کی اصل حور ہے جس کے معنی سفیدی کے ہیں۔ دھوبی کو حواری کہتے ہیں کیونکہ وہ کپڑے دھو کر سفید کر دیتا ہے۔ خالص اور بے آمیز چیز کو بھی حواری کہا جاتا ہے۔ جس آٹے کو چھان کر بھوسی نکال دی گئی ہو اسے حُوّاریٰ کہتے ہیں۔ اسی معنی میں خالص دوست اور بے غرض حامی کے لیے یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ ابن سیدہ کہتا ہے "ہر وہ شخص جو کسی کی مدد کرنے میں مبالغہ کرے وہ اس کا حواری ہے" (لسان العرب بحوالہ تفہیم القرآن)

نصاریٰ کے تین فرقے: اس کے بعد فرمایا: پھر بنی اسرائیل کی ایک جماعت ایمان لے آئی اور دوسری جماعت نے کفر کیا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا: یعنی جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ایمان لائے اور جن لوگوں نے ان کے زمانہ میں کفر کیا، کیونکہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان کی طرف اٹھالیا گیا تو ان کے تین فرقے ہوگئے، ایک فرقہ نے کہا: وہ خود اللہ تھے، پس اوپر چلے گئے۔

دوسرے فرقہ نے کہا: وہ اللہ کے بیٹے تھے اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا اور تیسرے فرقہ نے کہا: وہ اللہ کے بندے اور اس کے رسول تھے، اللہ نے انہیں اپنی طرف اٹھالیا اور وہی مسلمان تھے اور ہر فرقہ کی لوگوں نے اتباع کی اور کافر فرقوں نے متفق ہو کر مسلمانوں کو قتل کیا اور ان کو اپنے علاقے

سے نکال دیا اور نصاریٰ اسی حال پر تھے کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا محمد ﷺ کو مبعوث فرما دیا، پھر مسلمان کافروں پر غالب آ گئے، جیسا کہ اس کے بعد فرمایا فَأَيَّدْنَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَىٰ عَدُوِّهِمْ فَأَصْبَحُوا ظَاهِرِينَ پس ہم نے ایمان والوں کی ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی تو مومن (کافروں پر) غالب آ گئے۔ (تبیان القرآن)

مفسر قرآن حضرت مجاہد رحمۃ اللہ علیہ نے کہا، مئومنین سے مراد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں، ابراہیم نے کہا: جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے، جب انہوں نے ہمارے نبی سیدنا محمد ﷺ کی تصدیق کی تو ان کی حجت دوسروں پر غالب آ گئی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کلمتہ اللہ و روح اللہ ہیں۔ (تبیان)

مفسر قرآن مولانا عبدالحق حقانی رحمۃ اللہ علیہ اس مقام پر لکھتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ شاگردوں کو جو اول اول ان پر ایمان لائے اور یار و مددگار ہوئے اس لیے حواری کہتے ہیں، نہ اس لیے کہ وہ دھوبی تھے جیسا کہ بعض کا خیال ہے۔

ان بارہ شخصوں کے نام یہ ہیں۔ شمعون جو پطرس کہلاتا تھا اور اس کا بھائی اندریاس زیدی کا بیٹا یعقوب اور اس کا بھائی یوحنا فلیبوس اور برتھولا۔ تھوما اور محصول لینے والا متی۔ ہلقا کا بیٹا یعقوب۔ اور لبی جو تہدی بھی کہلاتا۔ شمعون کنعانی اور یہوداہ سکریوتی جس نے اسے پکڑوا بھی دیا۔ (انجیل متی باب دسواں)۔

یہ بنی اسرائیل تھے ان میں سے کچھ ماہی گیر تھے یا یہ کہ ماہی گیری کرتے ان کو حضرت مسیح علیہ السلام نے بلایا جیسا کہ انجیل متی کے چوتھے باب میں پہلے چاروں حواریوں کی بابت مذکور ہے، ان حواریوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کو سب سے اول قبول کیا اور حضرت کی ہمدردی و محبت میں نہایت سرگرم اور مستعد اور مخلصین تھے۔

چنانچہ متی کے دسویں باب میں ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سی باتیں کیں کہ پہلے اسرائیل کی بستیوں میں جاؤ اور چلتے ہوئے منادی کرو اور کہو کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آئی، سامان سفر کچھ ساتھ نہ لو اور میں تمہیں بھیڑیوں میں بھیجتا ہوں لوگ تمہیں کوڑے ماریں گے، عدالتوں کے حوالے

کریں گے۔ میرے نام کے سبب تم سے سب دشمنی کریں گے، پر جو آخر تک برداشت کرے گا وہی نجات پائے گا، یہ خیال مت کرو کہ میں صلح کرانے آیا ہوں نہیں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں۔

اس تلوار چلانے کے لیے لشکر درکار تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو میسر نہ آیا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا ہوا جیسا کہ کتاب یسعیاہ کے ۴۱ باب میں وعدہ کیا تھا، کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کروں اور آدمی کے دشمن اس کے گھر ہی کے لوگ ہوں گے جو کوئی ماں باپ بیٹے بیٹی کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں۔

جو کوئی اپنی صلیب اٹھا کر میرے پیچھے نہیں آتا وہ میرے لائق نہیں جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے وہ اسے کھوئے گا اور جو میرے واسطے اسے کھوئے گا وہ پائے گا، جو تمہیں قبول کرتا ہے مجھے قبول کرتا ہے۔

اسی کے مطابق ان حضرات حوارین نے کیا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعد ملک یہودیہ میں بھی منادی کرتے پھرے، پھر سریا کے علاقوں میں سے گزر کر یونان اور روم کے شہروں میں پہنچے اور سفر کیا اور لوگوں کی بڑی بڑی مصیبتیں اٹھائیں اور طرز معاشرت بھی درویشانہ ہی تھا، کسی سے کچھ لیتے دیتے نہ تھے ان میں اس خلوص کی بدولت خدا تعالیٰ نے کرامت بھی دی تھی، ان کی دعا سے بیمار تندرست ہو جاتے تھے اور ہر طرح کی کرامات و برکات لوگ دیکھتے تھے۔

آخر لوگوں کے ہاتھوں سے قتل ہوئے مگر دین عیسوی کو خوب پھیلا دیا جیسا کہ قرآن مجید میں ہے۔ فَآمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِيْٓ إِسْرَآئِيلَ وَ كَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ، بہت سے بنی اسرائیل ایمان لے آئے اور بہت سے منکر رہے۔

مگر حواریوں کی کوشش اور جانکاہی کا یہ نتیجہ ہوا کہ بحری اور بری بہت سے ممالک نے مذہب عیسوی قبول کر لیا اور اس عرصے میں گھر گھر لڑائی اور جنگ کی آتش بھی شعلہ زن ہوئی مگر آخر کار خدا تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں کو منکروں پر غلبہ دیا۔

یہ بات اور ہے کہ پھر ان عیسوی لوگوں میں اصلی دین محرف ہو گیا۔ ان آیات میں امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں جیسے ہونے کی ترغیب دلاتا ہے کہ تم بھی اشاعت اسلام کے لیے ویسی ہی کوشش کرو اور حضرت محمد ﷺ کے حواری بن جاؤ۔

آنحضرت ﷺ تو پچھلے نبی تھے جو حضرت عیسیٰ و موسیٰ و ابراہیم علیہم السلام کے رستے کے پتھر اور کانٹے صاف کرنے آئے تھے اور قومیں جو اگلے انبیاء کی مخالف تھیں، اب تو یہ موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام کے نام لیوا یہود و نصاریٰ ہی سب سے بڑھ کر دشمن ہو گئے کس لیے کہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے بعد جو کچھ دین حق میں ان کے درویشوں اور مولویوں نے ملونیاں ملا کر معجون مرکب بنایا جو حق کے سراسر خلاف تھا اس کا ترک کرنا ان کے نزدیک جان دینے سے بھی مشکل تھا۔

اس لیے آنحضرت ﷺ بھی دنیا میں تلوار چلانے اور باپ بیٹے، ساس بہو میں جنگ کرانے آئے، چنانچہ مکہ میں ظہور اسلام سے لے کر فتح مکہ تک یہی حال رہا، بدر کی لڑائی میں ایک بھائی ایک طرف تو دوسرا دوسری طرف تھا۔ بیٹا ادھر تو باپ ادھر تھا اور جہاں جہاں اسلام پہنچا اس کے ساتھ اس کے رقیبوں اور پرانے دشمنوں نے کیا کچھ نہیں کیا؟

آنحضرت ﷺ نے انصار و مہاجرین کی ایک عمدہ جماعت اس کام کے لیے منتخب کی اور پھر ایک عمدہ انتظام سے ان کو مختلف خدمات پر مامور کیا۔ کچھ قراء تھے تو کچھ قوموں میں جا کر تبلیغ کرتے تھے اور بوقت جنگ سپاہی تو سب ہی تھے۔ یہ سب آنحضرت ﷺ کے حواریین تھے۔

آنحضرت ﷺ کے بعد بھی جو کچھ انہوں نے اسلام کے لیے جانثاری کی اور آنحضرت ﷺ کو بحکم حدیث بخاری و مسلم لَا يُؤْمِنُ أَحَدُكُمْ، حَتَّى أَكُونَ أَحَبَّ إِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهِ وَوَلَدِهِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ایسا ہی محبوب سمجھ کر فرمان وَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ پر عمل کیا اور فقر و فاقہ بھی اٹھایا اور ان کی بے شمار کرامات دنیا نے دیکھیں اور پھر تابعین و تبع تابعین کی کوششوں نے ادھر

سپین اور یورپ و افریقہ کے ممالک تک ادھر ہندوچین، ایران و ترکستان تک اس سرعت کے ساتھ اسلامی جھنڈا بلند کیا جو عیسائیوں اور حواریوں سے صدیوں تک نہ ہو سکا۔ (تفسیر حقانی)

الحمدللہ ثم الحمدللہ آج سورۃ الصف کی تفسیر پایہ تکمیل کو پہنچی ہے، اللہ تعالیٰ اس متواضع کاوش کو اپنی بارگاہ عالیہ میں قبول و منظور فرمائے، اس عظیم الشان کام کو میرے لیے، میرے والدین ماجدین کے لیے، میرے اساتذہ کرام کے لیے، میرے مشائخ عظام کے لیے، میرے معاونین و مساعدین کے لیے صدقہ جاریہ بنائے اور قرآنی تعلیمات پر ہمیں عمل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین بحرمۃ النبی الکریم ﷺ

خادم اسلام، محمود الرشید عباسی حدوٹی

جامعہ رشیدیہ مناواں لاہور

۸ دسمبر ۲۰۱۸ء بروز ہفتہ، بوقت سوا گیارہ بجے شب